بھارت کے فرعون
ایکشن دوارکا
اے حمید
50

کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی کا میری طرف دیکھ کر یہ کہنا کہ یہ تو میرا خاوند نہیں ہے۔
ایسے ہی تھا جیسے کسی نے وہاں دستی بم پھینک دیا ہو۔ ایک خاموش دھماکہ ہوا۔ اس
دھماکے کی آواز نہیں تھی مگر میرے قدموں کے نیچے زمین ہل گئی۔ میرے سر کے اوپر جو
ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی رسی ٹوٹ گئی۔ اب تلوار کی نوک سیدھی میرے سر
میں گھسنے والی تھی۔ میرے پاس ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر
مجھے ان دونوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ دوسری صورت میں میری موت اور میرے کمانڈو مشن
کی موت یقینی تھی۔ کیپٹن پرشاد جو اس عورت کے ساتھ آیا تھا اس نے جب سنا کہ میں
اس عورت کا خاوند یعنی اصلی کیپٹن ہری ناتھ نہیں ہوں تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے مزید حیران ہونے کا موقع نہ دیا۔ میں اس پوزیشن میں ہی
نہیں تھا کہ اسے زندہ حالت میں وہاں سے باہر جانے کی اجازت دیتا۔ میری ساری کی
ساری کمانڈو ٹریننگ ایک ہزار وولٹ کی برقی توانائی بن کر میرے بازوؤں کے پٹھوں میں
سمٹ آئی تھی۔ کیپٹن پرشاد میری بائیں جانب کوئی تین قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس
ہندو عورت کے منہ سے یہ جملہ نکلے ایک سیکنڈ بھی پورا نہیں ہوا ہوگا کہ میں نے چھلانگ
لگا کر کیپٹن پرشاد کی ٹھوڑی کے نیچے فلائنگ کک اتنی زور سے لگائی کہ وہ دھڑام سے پیچھے
کو جا گرا۔ ہندو عورت دہشت زدہ ہو کر باہر کو بھاگی۔ میں نے اچھل کر اسے بھی دبوچ کر
وہیں گرا لیا۔ اس عورت کو میں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیپٹن پرشاد کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔
وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں لے کر زبردست

جھٹکا دیا۔ کٹک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی دو ٹکڑے ہو گئی۔ ہندو عورت کی گگھی بندھ گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی میں اسے کھینچ کر غسل خانے میں لے گیا۔ اس کی ساڑھی پھاڑ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے ہاتھ پیچھے باندھے اور غسل خانے کے ٹب میں دھکا دے کر جلدی سے باہر آیا۔ کیپٹن پرشاد کی لاش پہلو کے بل پڑی تھی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسلحہ کے گودام کی دونوں چابیاں نکالیں۔ ایک چابی جو ڈپلی کیٹ تھی وہیں رہنے دی۔ دوسری چابی اپنی جیب میں رکھی۔ اس کی لاش کو بھی گھسیٹ کر غسل خانے میں لے جا کر ڈال دیا اور غسل خانے کا دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی لگا دی اور ٹیلی فون کا ڈائل گھما کر میجر پٹیل کو فون کیا۔

دوسری طرف سے میجر پٹیل نے ہیلو کہا تو میں نے کہا۔

"میجر! میں کیپٹن ہری ناتھ بول رہا ہوں۔ تمہاری بھابی پہنچ گئی ہے۔ شکریہ۔ میں اور کیپٹن پرشاد اور تمہاری بھابی اس وقت کافی پی رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے ہاں آرہے ہیں۔ پھر اکٹھے اسلحہ ڈپو اور دوسرے گوداموں کی چیکنگ کرنے چلیں گے"

میجر پٹیل نے ہنس کر کہا۔

"سر! اس وقت میں بھی آپ کے پاس آکر بھابی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کافی پیتا مگر میں کام میں سخت مصروف ہوں"

میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"نو پرابلم میجر! تھوڑی دیر بعد ہم خود تمہارے پاس آرہے ہیں۔ پھر اکٹھے کھانا کھانے باہر چلیں گے"

"تھینک یو سر تھینک یو۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ ذرا کیپٹن پرشاد سے میری بات کرا دیں"

میں نے کہا۔

"اس وقت وہ باتھ روم میں چلا گیا ہے۔ باہر نکلتا ہے تو تمہاری بات کراتا ہوں"

"ڈونٹ وری سر! کوئی بات نہیں۔ اوکے بائی سر!"

"بائی"

اور میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

آخری بار غسل خانے کا دروازہ کھول کر میں نے اندر دیکھا۔ ٹب میں پڑی ہوئی اصلی کیپٹن ہری ناتھ کی بیوی جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے کراہ رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ اٹھ کر غسل خانے کے دروازے تک آکر لاتیں مار کر دروازے کو توڑ نہیں سکتی تو کم از کم شور ضرور مچا سکتی ہے۔ میں نے اندر جا کر اس کی ساڑھی کا ایک اور ٹکڑا پھاڑا اور اس کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے حلق سے غرغر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے غسل خانے کو بند کر کے چٹخنی لگائی۔ ڈرائنگ روم کی دیوار میں لگے ہوئے قد آدم شیشے میں اپنی وردی کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا اور تیز تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

اب مجھے دوار کا فورٹ کے سب سے بڑے گولہ بارود کے ذخیرے یعنی آرسنل اور ایمونیشن ڈمپ میں پہنچ کر وہاں بم لگانے تھے جو چیونگم کی پندرہ ٹکیوں کی شکل میں میری جیب میں محفوظ پڑے تھے۔ باہر بوندا باندی رک گئی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ میں آفیسرز میس کی دوسری طرف سے ہوتا ہوا اسلحہ کے گودام کی طرف گیا۔ سامنے کی طرف سے جانے سے میجر پٹیل کی نظر اپنے دفتر کی کھڑکی سے مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ ایمونیشن کوبرا ہیلی کاپٹروں اور میڈیم اور ہیوی گنز کے گولہ بارود کے ذخیرے والے گودام کے دروازے پر گارڈ پہرے پر موجود تھا۔ میں کیپٹن ہری ناتھ کی فل وردی میں تھا اور گارڈ اس سے پہلے مجھے میجر پٹیل کے ساتھ وہاں آکر اسلحہ وغیرہ کی چیکنگ کرتے دیکھ بھی چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میں احمد آباد ہیڈ کوارٹرز سے دوار کا فورٹ میں اسلحہ گولہ بارود اور سکیورٹی کی چیکنگ کے لئے آیا ہوں اس لئے اس نے مجھے دیکھ کر اٹن شن ہو کر سلیوٹ مارا۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر لے جا کر سلیوٹ کا جواب دیا اور چابی اسے دے کر کہا۔

"دروازہ کھولو جوان۔ ضروری چیکنگ کرنی ہے"

گارڈ سنتری نے مجھ سے چابی لی۔ ڈبل مارچ کرتا دروازے تک گیا اور اس کا تالا کھول کر پیچھے ہٹ کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے چابی لے کر کہا۔

"دیکھو جوان میں سیکریٹ چیکنگ کی ڈیوٹی پر ہوں۔ کسی کو اندر مت آنے دینا"

"ٹھیک ہے سر!"

گارڈ سنتری نے سلیوٹ مار کر کہا۔ گودام میں داخل ہونے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔ میرے پاس زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ تھے۔ اس دوران مجھے وہ سب کچھ کر ڈالنا تھا جس کے لئے میں نے اپنی جان کی بازی لگائی ہوئی تھی اور جو میرا کمانڈو مشن تھا۔ گودام ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا جس کے چھ سات سیکشن بنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں میں پہلے بھی میجر پٹیل اور کیپٹن پرشاد کے ساتھ یہاں آکر تمام اسلحہ گولہ بارود وغیرہ کی چیکنگ کر چکا تھا۔ اور جیسا کہ آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ میں نقلی کیپٹن ہری ناتھ بن کر دوارکا فورٹ کے اس ایمونیشن کے ذخیرے کی چیکنگ کے لئے آیا تھا۔ اصلی کیپٹن ہری ناتھ جس کو ہیڈ کوارٹر نے واقعی چیکنگ کے لئے بھیجا تھا میں نے اپنے ماسٹر سپائی کریم کے ساتھ مل کر راستے میں ہی ہلاک کر ڈالا تھا اور اس کی وردی پہن کر خود کیپٹن ہری ناتھ بن کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

سب سے پہلے میں اس سیکشن میں گیا جہاں اسرائیلی حکومت کی مدد سے انڈیا کی حکومت نے کشمیری مجاہدین کے ٹھکانوں اور ان کے گھروں پر بمباری کرنے اور راکٹ برسانے کے لئے کوبرا ہیلی کاپٹر منگوا کر بڑے بڑے کریٹوں کی شکل میں رکھے ہوئے تھے ان کریٹوں میں ہیلی کاپٹروں کے سارے پارٹس تھے۔ میں نے جیب سے پلاسٹک کا وہ لفافہ نکال لیا تھا جس میں قیامت خیز دھماکے سے پھٹنے والے انتہائی طاقتور چیونگ گم بم تھے۔ بم میں نے ماسٹر سپائی اور ہائی ایکسپلوسوز کے ماہر کریم بھائی کے ساتھ مل کر خود بنائے تھے۔ میں نے ایک کریٹ چھوڑ کر پانچ کریٹوں کے ساتھ چیونگ بم چپکائے اور ان کے اوپر جو چھوٹا سا بٹن لگا تھا اسے دبا دیا۔ اب ان بموں کو ایک گھنٹے کے بعد قیامت

دھماکوں سے پھٹنا تھا۔

اس کے بعد میں تیز تیز چلتا ہوا دوسرے سیکشن میں آگیا جہاں ہیوی اور میڈیم توپوں کے ڈی سیمبلڈ پارٹس پڑے تھے۔ میں نے یہاں بھی تین بم چپکا کر ان کے ٹین جو ٹائم ڈیوائس تھے دبا دیئے۔ آخر میں میں اس سیکشن میں آگیا جہاں گولہ بارود کا بھاری ذخیرہ موجود تھا۔ یہاں میں نے ٹارگٹ پہلے سے چن رکھے تھے۔ میرے پاس صرف سات بم رہ گئے تھے۔ یہاں زیادہ بم لگانے کی ضرورت نہیں تھی یہ سیکشن خود ایک بہت بڑا بم تھا۔ اسے صرف آگ لگانے کی ہی ضرورت تھی۔ پھر بھی میں نے ایک بم وہاں لگا دیا جہاں لمبی میز پر ہینڈ گرنیڈ بموں اور ہیوی آرٹلری کے گولوں کا بہت بڑا ذخیرہ ڈھیریوں اور دس بارہ قطاروں کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ وہاں بم لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے نکل جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی پر کھڑے سنتری نے ایڑیاں بجا کر میری تعظیم کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"او کے جوان! سب چیکنگ ہو گیا۔ اب ہم میجر پٹیل کے آفس میں جا رہا ہے۔ کیپٹن پرشاد آئے تو بول دینا ہم میجر صاحب کے پاس ہے"

"ٹھیک ہے سر!"

سنتری نے ادب سے ایڑیاں بجا کر کہا۔

ایمونیشن ڈمپ کے آگے چھوٹی سی پتھریلی ڈھلواں سڑک تھی جو باغیچے کے گرد گھومتی ہوئی کوارٹر گارڈ روم کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں میری جیپ اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی تھی بادل اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ لگتا تھا بارش ہونے والی ہے میں نے جیپ میں بیٹھ کر انجن سٹارٹ کیا اور اسے آہستہ سے موڑ کر دوارکا فورٹ کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر چیک پوسٹ تھی۔ بیریئر ڈاؤن تھا۔ دونوں جانب ملٹری پولیس کے سنتری کھڑے تھے۔ مجھے وہ لوگ شکل سے پہچانتے تھے۔ ویسے بھی میں کیپٹن کی وردی میں

تھا۔ میں نے جیپ آہستہ کر دی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بیریئر اٹھا دیا۔ میں دوارکا فورٹ سے باہر تھا۔ باہر آتے ہی میں نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ دن کی روشنی بادلوں کی وجہ سے کافی کم ہو گئی تھی۔ اب مجھے دوارکا کے ساحل سمندر کی جانب جانا تھا جہاں سمندری چٹانوں میں ہمارا ہائیڈ آؤٹ تھا یہ سارا راستہ مجھے معلوم تھا۔ علاقہ غیر آباد تھا۔ میں جیپ کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ میری دائیں طرف سمندر آ گیا۔ یہاں دور تک چھوٹی بڑی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنی نشانی والی دو جھکی ہوئی چٹانوں کے قریب پہنچا تو میں نے جیپ سمندری لہروں میں ڈال دی جب سمندر کی لہریں جیپ کے اندر تک آنے لگیں تو میں نے چھلانگ لگائی اور کمر تک پہنچے ہوئے سمندر کے پانی میں سے گزرتا اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چلنے لگا۔

یہاں میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

میرے حساب سے میرے لگائے ہوئے بموں کے پھٹنے میں بیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ چٹان قریب ہی تھی جس کے کھوہ میں ہم نے اپنا ہائیڈ آؤٹ یا پناہ گاہ بنائی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جاتے ہی فوجی وردی اتار دی اور اپنا وہی جوگیوں والا لباس پہن لیا۔ میرے پاس چھ ٹائم بم بچ گئے تھے۔ وہ پلاسٹک کے لفافے میں تھے۔ میں نے ایک رومال میں انہیں لپیٹا اور رومال کو اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔ میں چٹان کی کھوہ سے باہر آ کر چٹان کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میں نے اور کریم نے اس لئے چنی تھی کہ یہاں سے دوارکا فورٹ کی دیوار دور سے نظر آتی تھی۔ میری نگاہیں دوارکا فورٹ کی دیوار پر لگی تھیں۔ اگر میرے لگائے ہوئے بم ٹھیک وقت پر پھٹ پڑے تو اس دیوار کے پرخچے اڑنے والے تھے۔ کیونکہ میرے قیافے کے مطابق یہ دیوار قلعے کے گولہ بارود والے ذخیرے کی عقبی دیوار تھی۔

سورج بادلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ بادلوں کی سیاہی شام کی سیاہی میں گھل مل رہی تھی۔ بارش ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی سمندر کی طرف تیز ہوا چل رہی تھی۔ میری نظریں دوارکا فورٹ کی دیوار پر لگی تھیں جو آہستہ آہستہ شام کی سیاہی میں تحلیل

ہونے لگی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چمکتی ہوئی سوئیوں نے مجھے بتایا کہ ابھی بموں کے پھٹنے میں سات منٹ باقی ہیں۔ یہ سات منٹ سات دنوں کے برابر لمبے ہو گئے۔ میں چٹان کے اوپر بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ تین منٹ گزر گئے۔ چار منٹ باقی رہ گئے۔ پھر تین منٹ باقی رہ گئے۔ پھر دو اور پھر ایک منٹ باقی رہ گیا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار تھوڑی تیز ہو گئی۔ میں نے دل میں دعا مانگی۔ یا پاک پروردگار! تیرے دین کے نام پر جہاد کرنے والے کشمیری مجاہدین کے لئے یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔ میں نے اسلحہ اور ہیوی آرٹلری کے اس سازوسامان میں بم لگائے ہیں جسے کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا ہے۔ تو میری لاج رکھنا۔ میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔

وقت پورا ہو گیا تھا۔ میرے لگائے ہوئے پہلے دونوں بموں کو اب بلاسٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے بعد لگائے ہوئے بموں میں پندرہ بیس سیکنڈوں کا وقفہ تھا۔ میں پوری آنکھیں کھول کر دوارکا فورٹ کی دیوار کو دیکھ رہا تھا جو رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے اور سیاہ بادلوں کی تاریکی میں اب مجھے بالکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مگر ابھی تک وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری مٹھیاں اپنے آپ بھینچ گئی تھیں۔ دھماکہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ بم بنانے کے فارمولے میں کسی چیز کی کمی رہ گئی تھی۔ میری ساری محنت ساری جدوجہد بیکار ہو کر رہ گئی تھی۔ میری نگاہیں انتہائی مایوسی کے عالم میں بادلوں کی تاریکی اور رات کی سیاہی میں چھپی ہوئی دوارکا فورٹ کی دیوار کی طرف لگی تھیں اور میرے دل پر ناامیدیوں کے سائے منڈلانے لگے تھے کہ اچانک آسمان پر بادلوں میں روشنی کا غبار سا چمک اٹھا۔ اس کے بعد ایسی گونج کی آواز آئی جیسے دور کسی نے ہیوی آرٹلری کی توپ کا فائر کیا ہو۔ ساتھ ہی جس چٹان پر میں بیٹھا تھا وہ ایسے ہلی جیسے زلزلے کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کے بعد دھماکے کی ایک اور گونج بلند ہوئی۔ روشنی کی جگہ دوارکا فورٹ کی جانب بادلوں میں شعلے اس طرح بلند ہوئے جیسے وہاں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ پھر دھماکوں پر دھماکے ہونے لگے۔ باری باری آتش فشاں پھٹنے لگے۔ آسمان کو سرخ زرد سفید اور نیلے رنگ کے شعلوں نے روشن کر کے

رات کو دن بنا دیا۔ دھماکے اس قدر قیامت خیز تھے کہ اتنی دور سے کان پھٹتے محسوس ہونے لگے۔ میں چٹان پر لیٹ گیا اور سر اٹھا کر دوارکا کے فورٹ کو تکنے لگا جہاں اب سوائے آگ کے بلند ہوتے نیلے سفید زرد سرخ شعلوں اور سفید اور سیاہ دھوئیں کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے اپنا سر سجدے میں گرا دیا۔ دوارکا فورٹ کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ خدا جانے وہاں کس قدر طاقتور گولہ بارود اور بم تھے کہ ہر دھماکے پر ایٹم بم کے دھماکے کا گمان ہو رہا تھا۔ زمین ہل رہی تھی آسمان شعلہ بن کر سرخ ہو گیا تھا۔ دھماکوں کا سلسلہ دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد شعلے بدستور بلند ہوتے رہے۔ میں جلدی سے چٹان سے اترا۔ کیپٹن ہری ناتھ کی فوجی وردی کو چادر میں لپیٹ کر سمندر کی لہروں کی طرف اچھالا اور ہائیڈ آؤٹ میں واپس آکر اپنا چھوٹا بٹوہ جس میں کچھ روپے تھے اپنے سادھوؤں والے لمبے کرتے کی بغلی جیب میں ڈالا اور چٹانوں کے درمیان سے ہوتا شہر کی طرف چل پڑا۔

میں دوارکا شہر کو دور سے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے ساتھی کمانڈو اور ماسٹر سپائی کریم کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو اس نے مجھے از خود ملنے کے لئے منع کر رکھا تھا دوسرے مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ دوارکا میں کس جگہ پر ہوگا۔ اس نے مجھے یہی کہا تھا کہ وہ خود مجھ سے ملنے ہائیڈ آؤٹ میں آئے گا۔ میں سمندر سے ہٹ کر چلتا ہوا سڑک پر آگیا جو دوارکا شہر کی طرف جاتی تھی۔ شہر دوارکا فورٹ کے شعلوں سے روشن ہو رہا تھا۔ آسمان پر آتش بازیاں چل رہی تھیں۔ راکٹ شوں شوں کی آوازوں میں چیختے چلاتے آسمان کی طرف بادلوں کو چیرتے جا رہے تھے۔ سڑک پر شہر کی طرف سے ایک ٹرک بڑی تیزی سے آیا اور گزر گیا۔ اس کے بعد موٹر گاڑیاں تیز رفتاری سے گزرنے لگیں۔ سڑک پھٹتے اور جلتے ہوئے اسلحہ کے ذخیرے کے شعلوں میں روشن ہو رہی تھی۔ مجھے گاڑیوں میں گھبرائے ہوئے لوگوں کے خوف زدہ چہرے نظر آئے۔ لوگ شہر سے بھاگے جا رہے تھے۔ ایک آدمی موٹر سائیکل پر تیزی سے آیا میرے قریب سے گزرتے

ہوئے اس کا انجن خراب ہو گیا۔ وہ بار بار پاؤں چلا کر موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بھائی ادھر کیا ہوا ہے؟"

وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شہر میں زلزلہ آگیا ہے۔ ہر طرف آگ لگی ہے یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔ چاروں طرف گولے پھٹ رہے ہیں۔"

وہ موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے بھاگ گیا۔ اس کے بعد ایک اور آدمی بوکھلایا ہوا دوڑتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا لیکن وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے چلا کر بولا۔

"پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔ بھاگ جاؤ بابا۔ پاکستانی فوج آگئی ہے"

میں نے گہرا سانس لیا اور خاموشی سے واپس چل دیا۔ میں سمندری چٹان کے کھوہ میں آکر بیٹھ گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے کسی کے پانی میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ آسمان پر جلتے ہوئے دوارکا فورٹ کے شعلوں کی روشنی اب مدھم پڑ چکی تھی۔ میں نے دھندلی روشنی میں ایک انسانی سائے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو سادھوؤں کی طرح آواز بلند کر کے پوچھا۔

"کیوں بابا! کون ہو تم؟"

اس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چلتا ہوا میرے قریب آیا تو وہ ہمارا احمد آباد والا ماسٹر سپائی کریم بھائی تھا۔ کہنے لگا۔

"اندر آجاؤ"

ہم کھوہ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس نے جیب سے موم بتی نکال کر روشن کر دی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"ہمارا مشن توقع سے بڑھ کر کامیاب رہا"

میں نے اسے مختصر طور پر سارا واقعہ سنایا۔ کریم اپنے ساتھ میرے لئے لفافے میں دو

روٹیاں اور آلو کی بھجیا لایا تھا۔ میں روٹی کھانے لگا وہ اٹھ کر باہر گیا۔ پھر واپس کھوہ میں آکر بولا۔

"ایمونیشن ابھی تک پھٹ رہا ہے"

اندر سے بچے کھچے ایمونیشن کے پھٹنے کی دھمک مجھے بھی سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کب تک یہاں چھپے رہنا ہوگا۔ کریم نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تمہیں کم از کم دو دن یہاں گزار کر احمد آباد گوکل داس پانڈے کے گھر جانا ہوگا۔"

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں گوکل داس پانڈے احمد آباد میں انڈیا کی پاکستان دشمن خفیہ تنظیم را کے مقامی ہیڈ کوارٹر کا چیف تھا اور ہوائی مخلوق چندریکا کی مدد سے میں نے اسے اور اس کی بیٹی میناکشی کو جو شعبدہ بازی دکھائی تھی اس کی وجہ سے وہ میرا زبردست مرید بن چکا تھا۔ پانڈے نے مجھے اپنے عالی شان بنگلے میں ٹھہرا رکھا تھا۔ وہیں سے مجھے یہ خفیہ اطلاع ملی تھی کہ دوارکا فورٹ میں اسلحے کی بھاری کھیپ اسرائیلی حکومت کے تعاون سے ایک سمندری جہاز کے ذریعے پہنچ چکی ہے۔ یہ اسلحہ خاص طور پر کشمیر کے محاذ پر کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا تھا۔ میں گوکل داس پانڈے کے ہاں جینی سادھو کے بھیس میں رہ رہا تھا۔ میں نے سومنات مندر کی یاترا کا بہانہ بنایا اور کریم بھائی کے ساتھ دوارکا پہنچ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کریم کہہ رہا تھا۔

"اس سے پہلے ہم ڈگھاٹ کے سٹیشن پر کشمیر کے محاذ پر جانے والے گولہ بارود سے لدی ہوئی ٹرین اڑا چکے ہیں جس پر را کے چیف مسٹر پانڈے کی انکوائری شروع ہوگئی تھی۔ اب ہم نے دوارکا فورٹ کا گولہ بارود اور اسلحہ اور فوجی سازوسامان کا سارے کا سارا ذخیرہ اڑا دیا ہے۔ یقیناً مسٹر پانڈے کے بنگلے کے باہر سیکرٹ سروس کے آدمیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہوگا۔ تم کل وہاں پہنچے تو خفیہ پولیس والوں کو تم پر شک پڑ سکتا ہے۔ وہ لوگ پہلے ہی تمہاری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم دو تین دن کے بعد جاؤ۔"

کریم کا مشورہ صحیح تھا۔ میں نے اس سے شہر کی فضا کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے

لگا۔

"شہر میں تو قیامت کا سماں ہے۔ سب یہی کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے جہازوں نے بم باری کی ہے۔ لوگ دوارکا چھوڑ کر احمد آباد کی طرف بھاگ رہے ہیں۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کریم بھائی چلا گیا۔

میں نے تین دن چٹانوں کی ہائیڈ آؤٹ میں گزارے۔ کریم بھائی دن میں کسی وقت آکر مجھے کھانے پینے کو دے جاتا تھا۔ چوتھے روز وہ آیا اور کہنے لگا۔

"اب تم احمد آباد روانہ ہو جاؤ۔ میں کل احمد آباد پہنچوں گا۔ وہاں پہنچ کر مجھے میرے خفیہ نمبر پر بھی ہرگز ہرگز فون نہ کرنا ریلوے لائن والے خفیہ کوارٹر کی طرف بھی مت جانا۔ میں خود تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ ہاں اگر کسی قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے تو میرے خفیہ نمبر پر ڈائل کر کے صرف تین بار ہیلو ہیلو ہیلو بول دینا۔ تمہارا پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا۔"

میں اسی روز دوارکا سے احمد آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔

چیونگ گم کی شکل میں چھ ٹائم بم پلاسٹک کے لفافے میں بند میری کمر کے گرد بندھے ہوئے تھے۔ میں نے سادھوؤں والے لمبے گیروے کرتے اور اسی رنگ کی کھدر کی دھوتی میں ملبوس تھا۔ فرق صرف اتنا پڑ گیا تھا کہ میرے بال پہلے کی طرح لمبے نہیں تھے۔ کیونکہ میں نے کیپٹن ہری ناتھ کا روپ دھارنے سے پہلے فوجیوں کی طرح بال کٹوا لئے تھے۔ اس کا علاج میں نے یہ کیا تھا کہ سر پر بھی گیروے رنگ کا رومال باندھ لیا تھا۔ تین دن بعد بھی دوارکا شہر میں خوف و ہراس کی فضا تھی۔ ریلوے سٹیشن خالی خالی تھا۔ میں دوپہر کے تین بجے احمد آباد پہنچا۔ سٹیشن پر انگریزی اور گجراتی کے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ دوارکا فورٹ کی تباہی پر ہر اخبار نے پولیس اور سیکورٹی کے نظام پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ قلعے کی تباہی کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور را کے احمد آباد والے ہیڈ کوارٹر کے چیف اور اپنے بے دام مرید گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر آگیا۔ خفیہ سروس والے تو وہاں پہلے ہی ادھر ادھر موجود تھے۔ لیکن اب بنگلے کے گیٹ پر ایک سنتری

بھی پہرے پر کھڑا تھا۔ میں اندر جانے لگا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس سے ملنا ہے۔

میں نے سادھوؤں کی طرح ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہری اوم! بچہ تم یہاں نئے آئے ہو۔ اندر جا کر خبر کرو کہ گورو دیو سومنات کی یاترا سے واپس آ گئے ہیں"

اس دوران مسٹر پانڈے کی اکلوتی حسین بیٹی میناکشی اوپر والی منزل کے ٹیرس پر آ گئی۔ اس نے مجھے دیکھا تو گارڈ سے کہا۔

"گورو جی کو آنے دو"

میں بنگلے میں داخل ہو گیا۔ میناکشی میرے سواگت کو نیچے پہنچ چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"گورو جی! بڑی بپتا آن پڑی ہے۔ پتاجی کو دلی ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔ یہاں پولیس کا سخت پہرہ لگا ہے"

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیوں بھلا؟ ایسی کون سی بات ہو گئی ہے؟"

میں میناکشی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر والی منزل میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگی

"آپ کو نہیں پتہ؟ دوارکا میں فوج کا جو ایمونیشن ڈمپ تھا کشمیری کمانڈوز نے اسے اڑا دیا ہے۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں بچا۔ پرائم منسٹر نے خود پتاجی کو نئی دلی طلب کر لیا ہے"

میں اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میناکشی میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور میرے گھٹنوں کو پکڑ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"گورو دیو! بھگوان کے لئے میرے پتاجی کو بچا لیں کہیں انہیں سزا نہ ہو جائے۔ سارا الزام ان پر لگایا جا رہا ہے کہ ان کی غفلت کی وجہ سے کشمیری کمانڈوز کو دوارکا کا فورٹ تباہ کرنے کا موقع ملا"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو۔ بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔ تمہارے پتاجی کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا"

میناکشی میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"جب تمہارے گورو جی اس گھر میں ہیں تم لوگوں پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ میں آج رات ہی شیو جی مہاراج کا چلہ کرتا ہوں۔"

میناکشی ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"گورو جی صرف آپ ہی ہمارے گھر کو تباہی سے بچا سکتے ہیں"

میں نے میناکشی کی ٹھوڑی ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ میرے لئے اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر لاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میناکشی مجھے اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک مقدس جہاد کے مشن پر انڈیا آیا ہوا تھا اور اس جہاد کا تقاضا تھا کہ میں اپنے دامن کو ہوس کے چھینٹوں سے آلودہ نہ ہونے دوں اور اپنے کردار کو جتنا بھی باوقار اور پاک صاف رکھ سکتا ہوں پاک صاف رکھوں۔ ہر عظیم مقصد کی کامیابی کے واسطے کردار کا بے داغ اور طاقتور ہونا شرط اول ہے۔ میناکشی کافی تیار کرنے نیچے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے ٹیلی فون میں جو مائیکرو فون لگایا ہوا تھا وہ دوارکا مشن پر جاتے ہوئے اپنے سگریٹ لائٹر والے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ساتھ دونوں کو وزن کرنے والی مشین کے اندر چھپا دیا تھا۔ وزن کرنے والی مشین میرے باتھ روم کے باہر ہوتی تھی مگر اب کسی نے اسے اٹھا کر غسل خانے کی اندر رکھ دیا تھا۔ میں اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور وزن کرنے والی مشین کو نیچے سے کھولنے لگا۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ میرا ریڈیو ٹرانسمیٹر اور قمیض کے بٹن کے سائز کا مائیکرو فون مشین کے اندر موجود تھا۔

میں نے اسے وہیں رہنے دیا۔ مشین کا ڈھکنا لگا کر پیچ کس دیئے اور منہ دھو کر بالوں میں کنگھی پھیری۔ گیروے رنگ کا رومال دوبارہ سر پر باندھا اور ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف سے میناکشی کی آواز آئی۔

"گورو دیو! میں آپ کے لئے کچوریاں بنا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے شما کر دیں"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں بالکی۔ کوئی بات نہیں"

دوسری منزل والے کمرے کی ٹیرس والی شیشے کی دیوار کے پردے گرے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر ایک طرف سے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ یہاں سے نیچے بنگلے کے گیٹ کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کے سامنے کچھ فاصلے پر جو درختوں کا جھنڈ تھا اس کے نیچے لکڑی کے بنچ پر دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی ان کے قریب کھڑا تھا۔ جو آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک نگاہ بنگلے کی اوپر والی منزل کی طرف ڈالی۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کوئی بات کی اور درختوں کی دوسری طرف جو رستہ باہر سڑک کی طرف جاتا تھا اس طرف چلا گیا۔

آپ میری کہانی میں پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ خفیہ پولیس کے آدمی تھے۔ جو احمد آباد کی سیکرٹ پولیس کی طرف سے یہاں تعینات کئے گئے تھے اور اس کی مسٹر پانڈے کو خبر ہو چکی تھی۔ اسے یہی کہا گیا تھا کہ نیشنل سیکورٹی کی خاطر ان کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہاں اس بات کی نگرانی ہو رہی تھی کہ مسٹر پانڈے کے بنگلے پر کون کون اس سے ملاقات کرنے آتا ہے۔ مڈگھاٹ کے سٹیشن پر ہم نے جو اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی ٹرین اڑائی تھی اس کے بعد یہاں سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور میں بھی جب باہر کہیں جاتا تھا تو خفیہ سروس کا ایک آدمی باقاعدہ میرے پیچھے لگ جاتا تھا۔ اگرچہ مسٹر پانڈے نے ان لوگوں کو بتایا ہوا تھا کہ یہ ہمارے گوروجی ہیں اور دلی سے یہاں جین مندروں کی یاترا کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ لیکن خفیہ پولیس والوں کو میری یاترا

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ برابر میری نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اور دوار کا فورٹ کی تباہی کے بعد تو سیکرٹ سروس والوں کی سرگرمیاں تیز ہو جانا یقینی بات تھی۔

میں نے بھی نوٹ کیا کہ پہلے درختوں کے نیچے کوئی بنچ نہیں ہوتا تھا اور آدمی بھی ایک ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اب وہاں تین آدمی آگئے تھے اور ایک آدمی میرے کمرے پر گہری نگاہ ڈالنے کے بعد وہاں سے ابھی ابھی کسی جگہ گیا تھا۔ مجھے قدرتی طور پر تشویش ضرور ہوئی لیکن میں اپنے طور پر مطمئن تھا کہ چونکہ پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے اس لئے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکے گا۔ لیکن یہاں میں نے تھوڑی غفلت کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے تھا کہ اس علاقے میں حالات انتہائی تشویش ناک حد تک سنگین ہو چکے تھے۔ مڈگھاٹ پر فوجی ایمونیشن کی ٹرین کی تباہی کے بعد دوار کا کا مشہور گولہ بارود کے ذخیرے کا تباہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ جب کہ احمد آباد میں پاکستان دشمن تنظیم را کے چیف کو انڈیا کی پرائم منسٹر اندرا گاندھی نے دلی بھی طلب کر لیا ہوا تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ آدمی کتنا ہی عقلمند اور ہوشیار کیوں نہ ہو یہ اس کی فطرت میں ہے کہ کہیں اس سے غلطی یا بھول ضرور ہو جاتی ہے۔ حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ میں مسٹر پانڈے کے بنگلے سے نکل جاتا۔ لیکن میں اس خیال سے وہاں بیٹھا رہا کہ شاید مجھے کوئی اور خفیہ اطلاعات مل جائیں۔ کیونکہ ان دنوں را کی خفیہ تنظیم کی جانب سے انڈیا گورنمنٹ نے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کا ایک خطرناک پروگرام بنایا تھا میں اس پاکستان دشمن منصوبے کو شروع ہونے سے پہلے ہی تباہ کر دینا چاہتا تھا اور اس کے بارے میں مجھے سب سے مستند اطلاعات مسٹر پانڈے کے گھر سے ہی مل سکتی تھیں۔

اس حقیقت کی میں ایک بار پھر یہاں وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں پاکستانی ضرور تھا مگر مجھے پاکستان کی طرف سے انڈیا میں جاسوسی کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا تھا۔ میں پاکستان سے کشمیری مجاہدین کی جدوجہد آزادی سے اپنی محبت اور اپنے والد صاحب کی وصیت کو پورا کرنے کے لئے بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا۔ میں پہلے بھی اپنے قارئین کو بتا چکا ہوں اور اب بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میرے والد صاحب بستر مرگ پر

تھے۔ وہ مشرقی پنجاب کے آگ اور خون کے سمندر سے مجھے اور میری چھوٹی بہن کلثوم کو لے کر اپنے گاؤں سے پاکستان کی طرف چلے تھے کہ قافلے پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا۔ ہم چھوٹے تھے۔ والد صاحب ہم دونوں کو لے کر کھیتوں میں دوڑ پڑے۔ ایک سکھ نے تلوار لے کر ہمارا پیچھا کیا۔ اس نے میری چھوٹی بہن کلثوم کی گردن پر تلوار ماری اور کی گردن آدھی سے زیادہ کٹ گئی اور وہ وہیں شہید ہو گئی۔ والد صاحب کسی نہ کسی طرح اپنی اور میری جان بچا کر پاکستان پہنچ گئے۔ وہ اپنی بیٹی اور میری چھوٹی بہن کلثوم کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو کشمیر میں آزادی کی جنگ تیز ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا اور کہا۔

"بیٹا! میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری دو خواہشیں پوری کرو۔ پہلی خواہش یہ ہے کہ جہاں تمہاری بہن کلثوم شہید ہوئی تھی وہاں جا کر فاتحہ پڑھ کر میری بیٹی کی روح کو ثواب پہنچاؤ اور دوسری خواہش یہ ہے کہ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف لڑو اور جب کشمیر آزاد ہو جائے تو میری قبر پر آکر کہہ دینا کہ میاں جی کشمیر آزاد ہو گیا ہے۔"

میرے والد صاحب کی یہی دو خواہشیں تھیں جنہیں پورا کرنے کے لئے میں نے کمانڈو کی زبردست ٹرینگ لی۔ ہائی ایکسپلوسیز کی تربیت لی اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے لئے کافروں کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ یہی میرا مشن تھا۔ انڈیا میں آکر مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان دشمن را کی خفیہ تنظیم سرکاری سطح پر پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کے منصوبے بنا رہی ہے اور پاکستان میں اس کے ایجنٹوں نے تخریب کاری شروع بھی کر دی ہے۔ چنانچہ میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی میں اس مشن کو بھی شامل کر لیا کہ انڈیا میں رہ کر میں بدنام زمانہ بھارتی را کے پاکستان کے خلاف منصوبوں کو برباد کرنے کی ہر طرح سے کوشش کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لہٰذا میں اپنے قارئین سے جو میری زندگی کی سچی داستان پڑھ رہے ہیں درخواست کروں گا کہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ میں پاکستان کی حکومت کی طرف سے انڈیا میں جاسوسی کرنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ ساری جدوجہد اپنے طور پر کر رہا تھا میری خفیہ سرگرمیوں کا پاکستان کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور آپ میری داستان میں یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ میں جب بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا تو سب سے پہلے ان کھیتوں میں گیا تھا جہاں میری بہن کو سکھ نے شہید کیا تھا۔ مجھے وہ کھیت وہ جگہ یاد تھی۔ اس وقت میری عمر چھ سات برس کی تھی۔ اب میں 20 برس کا نوجوان تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر فاتحہ پڑھی اور اپنی شہید بہن کی روح کو ثواب پہنچایا۔ ظاہر ہے اب وہاں اس کی لاش کی ہڈیاں بھی نہیں رہی تھیں۔ کھیت میں کئی بار ہل چل چکا تھا۔ کئی بار فصل اگ چکی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کے سارے حالات آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔

اتنے میں مسٹر پانڈے کی حسین بیٹی میناکشی میرے لئے کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے ریشمی ساڑھی کا پلو کمر کے ساتھ باندھ رکھا تھا وہ میرے لئے کچوریاں بھی بنا کر لائی تھی۔

"گورو جی! پتہ نہیں میری بنائی ہوئی کچوریاں آپ کو پسند بھی آئیں گی کہ نہیں۔"

وہ کافی بنانے لگی۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میناکشی! تم جو بناؤ وہ مجھے پسند ہے تم خود بھی مجھے بڑی پسند ہو"

وہ شرما گئی۔ کبھی کبھی میں اسے خوش کرنے کے لئے اس سے ایسی باتیں کر لیا کرتا تھا۔ اوپر سے تو میں اس قسم کی شوخی کی باتیں کر رہا تھا لیکن دل میں ایک کھد بد سی لگی ہوئی تھی۔ بار بار میرا دھیان اس خفیہ سروس والے آدمی کی طرف جاتا تھا جس نے میرے دوسری منزل والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ پھر درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کوئی بات کی تھی اور ایک چل دیا تھا۔ کہیں یہ لوگ میری واپسی کے انتظار میں تو نہیں تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں میرے کشمیری کمانڈو ہونے کا یقین ہو گیا ہو اور مجھے واپس بنگلے میں آتا دیکھ کر وہ آدمی فون پر خفیہ پولیس چیف کو اطلاع دینے گیا ہو۔ اس وقت اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے اس بنگلے سے نکل جانا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے میں نے اپنے دل کے اس خیال پر

کوئی توجہ نہ دی۔

اور پھر خوبصورت میناکشی جو واقعی دل سے مجھ سے محبت کرتی تھی میرے سامنے بیٹھی تھی اور کچوری کی پلیٹ میرے سامنے پیش کر کے کہہ رہی تھی۔

"گوروجی! لیجئے نا"

میں نے کچوری اٹھائی اور کھانے لگا۔ کچوری واقعی بڑے مزے دار تھی۔ میناکشی نے کافی کی پیالی میرے آگے رکھی اور ساڑھی کا پلو کھولتی ہوئی ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔

"میں پتاجی کو بتاتی ہوں کہ گورودیو آگئے ہیں۔"

ٹیلی فون اس نے گود میں رکھ لیا اور بار بار کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد اسے نمبر مل گیا۔

"ہیلو! میں میناکشی پانڈے احمد آباد سے بول رہی ہوں۔ پلیز مسٹر گوکل داس پانڈے سے میری بات کروا دیجئے۔ میں ان کی پتری ہوں۔ جی۔ یس۔ یس۔"

اس کے بعد میناکشی انگریزی میں بات کرنے لگی۔ میں کافی پیتے ہوئے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔

"پلیز کوشش کریں۔ مجھے ڈیڈی سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے جو کوئی بھی بول رہا تھا میناکشی اسے سننے لگی۔ پھر اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے ٹیلی فون ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ پرائم منسٹر کے سیکریٹری کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میناکشی جب میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تمہارے ڈیڈی کو کچھ نہیں ہوگا۔ پھر کیوں فکر کرتی ہو"

میناکشی نے کہا۔

"میں پتاجی کو آپ کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ وہ بڑے خوش ہوتے۔ انہیں

حوصلہ ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے وہ آپ سے بھی بات کر لیتے مگر یہ پرائم منسٹر ہاؤس کے بیوروکریٹس بڑے سنگ دل ہیں۔"

میرے صرف کان میناکشی کی باتیں سن رہے تھے۔ دل کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک عجیب بے چینی سی میرے اندر لگی ہوئی تھی۔ میں نے میناکشی سے پوچھا۔

"یہاں کہیں میرا سگریٹوں کا پیکٹ تو نہیں پڑا ہوا؟"

میرا دل سگریٹ کے دھوئیں میں اپنے ذہنی خلفشار کو تحلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت میری جیب میں سگریٹ نہیں تھے۔ دوارکا مشن پر میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ سگریٹ نہیں رکھے تھے۔ میناکشی جلدی سے بولی۔

"ہاں گوروجی! آپ کا سگریٹ کا ایک پیکٹ مجھے آپ کے کمرے کی صفائی کرتے ملا تھا۔ میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا"

وہ دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس کے دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لے آئی۔ ماچس بھی وہیں ساتھ ہی تھی۔ اس میں چار سگریٹ تھے۔ میں نے سگریٹ لگا لیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری ساری توجہ شیشے کی دیوار پر گرے ہوئے پردے پر تھی۔ میں نے میناکشی سے کہا۔

"یہ پردہ کیوں گرایا ہوا ہے۔ باہر کی روشنی اندر آنی چاہئے"

میں نے قریب جا کر پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور کونے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا۔ بنگلے کے سامنے درختوں میں وہی دو خفیہ پولیس والے بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تیسرا آدمی جو جا چکا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں دیوار سے ہٹ کر میناکشی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔

"گوروجی! کیا بات ہے۔ آپ کچھ تھکے سے نظر آتے ہیں۔ آپ نے بڑا لمبا سفر کیا ہے۔ آپ آرام کریں۔ میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ وہ ہاتھ باندھ کر مجھے نمسکار کہہ کر نیچے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر اٹھا اور شیشے کی دیوار کے کونے میں

کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ بظاہر وہاں کوئی بھی تشویش والی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ خفیہ سروس والے آدمی بنچ پر بیٹھے تھے۔ وہ وہاں بیٹھے ہی ہوتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ظاہر ہے اسے کوئی کام یاد آگیا ہو گا۔ اور وہ چلا گیا۔ پھر میرے دل کو کس بات کی بے چینی لگی تھی؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میرا دل مجھے ایک آنے والے انتہائی خطرناک حادثے سے آگاہ کر رہا تھا مگر اس کی آگاہی اور اس کے اشارے میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

مطلع دوارکا سے لے کر احمد آباد تک ابر آلود چلا آ رہا تھا۔ یہاں بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں ابھی تک سادھوؤں والے لباس میں تھا۔ یعنی گیروے رنگ کا لمبا چولا جس کی بغلی جیب میں میرا بٹوا تھا جس میں کچھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ گیروے رنگ کی دھوتی۔ کمر کے ساتھ رومال میں چھ چھوٹے ٹائم بم پلاسٹک میں موجود بندھے ہوئے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے دوپہر کے بعد کی روشنی شام ہونے سے پہلے ہی سرمئی سی ہو رہی تھی۔

میں شیشے کی دیوار کے پاس کھڑا گیٹ کے سامنے والے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں خفیہ پولیس کے آدمی بنچ پر بیٹھے بیڑیاں سگریٹ پی رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر آیا اور ان آدمیوں کے پاس چائے کے دو شیشے کے گلاس رکھ کر چلا گیا۔ وہ دونوں چائے پینے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ مجھے خواہ مخواہ کا وہم ہو رہا ہے کہ یہاں میرے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ میں نے پردہ برابر کر دیا۔ پردہ گرانے سے کمرے میں اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا مجھے اچھا لگا۔ میں صوفے پر بیٹھنے کی بجائے دیوان پر نیم دراز ہو کر سگریٹ پینے لگا اور سوچنے لگا کہ میرا مشن انتہائی کامیاب ہے۔ اب مجھے مسٹر پانڈے سے را کے پاکستان دشمن منصوبوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہو گی تا کہ اس سے پہلے کہ کوئی تخریب کار پاکستان میں دہشت گردی پر روانہ ہو میں اسے یہیں ختم کر دوں۔

مجھے سیڑھیوں والے چھوٹے برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ میناکشی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ساڑھی تبدیل کر لی تھی اور اب صرف بادامی رنگ کی ریشمی پتلون اور اسی رنگ کی کھلے گریبان والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے آتے ہی کمرے میں اعلیٰ ترین پرفیوم کی خوشبو پھیل گئی۔ میں دیوان پر اسی طرح لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے دیوانہ وار پیار کرتی ہے اور میری طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی نہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی مجھ سے پیار محبت کی باتیں کر لیتی ہے۔ میں نے اسے اس کی اجازت دے رکھی تھی اور اس کے جذبات کو ایک خاص حد تک جانے کی اجازت دے دیا کرتا تھا۔ وہ میرے دیوان کے پاس آ کر قالین پر بیٹھ گئی اور میری پنڈلیاں دباتے ہوئے بولی۔

"گورو جی! مجھے اس خیال نے نیچے بیٹھنے نہیں دیا کہ آپ تھکے ہوئے پریشان لگتے ہیں۔ میں آپ کو آرام پہنچانے کے خیال سے آگئی ہوں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟"

مجھے اس وقت میناکشی کی پنڈلیاں دبانا اچھا لگ رہا تھا۔ میں تھکا ہوا بھی تھا۔ اور چاہتا تھا کہ کوئی میرے قریب بیٹھ کر مجھے سکون پہنچائے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میناکشی! مجھے اچھا لگ رہا ہے"

میناکشی کو اور کیا چاہئے تھا۔ اس نے پنڈلیاں دباتے دباتے اوپر اٹھ کر میرے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا اور بولی۔

"گورو جی! میں آپ کو زیادہ سگریٹ نہیں پینے دوں گی۔ اس سے کینسر ہو جاتا ہے"

میں نے کہا۔ "مگر یہ تو وہی سگریٹ ہے جو تم دے گئی تھیں"

اس نے سگریٹ میز پر رکھے ایش ٹرے میں بجھا کر ڈال دیا اور واپس آ کر قالین پر بیٹھنے کی بجائے دیوان پر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میناکشی پر کچھ بھوت زیادہ ہی سوار تھا۔ میں ذرا پرے ہو گیا۔ وہ میرے سینے پر سہلانے کے انداز میں آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ باہر گہرے بادل، کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا اور میناکشی کی ریشمی قمیض اور ریشمی پتلون سے آتی پرفیوم کی مہک۔ سارا ماحول بے حد

رومانٹک بن رہا تھا۔ مگر میں اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا تھا۔
کیونکہ آدمی خطا کا پتلا ہوتا ہے اور اس پر کسی بھی وقت شیطان اگر غالب نہیں آتا تو
ضرور کر سکتا ہے۔

اچانک میناکشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"گوروجی! دیکھیں۔ آپ کی پرارتھنا سے میرے پیٹ پر زخم کا نشان بھی نہیں رہا"

میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے میناکشی اس طرح کھڑی تھی کہ اس نے
قمیض اوپر اٹھا کر پیٹ ننگا کیا ہوا تھا اور پتلون بھی اوپر سے کافی نیچے کھسکا رکھی تھی۔
کی ناف کے نیچے کا ابھار صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ قمیض نیچی کر لو۔"

میناکشی نے بڑی عاجزی کی ساتھ کہا۔

"گوروجی! میری آپ سے صرف ایک التجا ہے بھگوان کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری
کو نہ ٹھکرائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اس نے پیٹ میرے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"میرے پیٹ پر جہاں زخم کا نشان تھا وہ جگہ چوم لیں۔ مجھے یقین ہے آپ
چومنے سے میرے سارے پاپ دھل جائیں گے۔ پھر میں اگلے جنم میں آکاش کی اپسرا
کر جنم لوں گی۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ میرے عشق میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے اس کی بات
لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کا جی خوش ہو جائے گا میں نے سر اٹھایا۔ منہ آگے کر
اس کے پیٹ کو چوما اور جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"بس اب نیچے اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ اس سے زیادہ آگے بڑھنے کی میں تمہیں
اجازت نہیں دوں گا۔"

مگر خدا جانے میناکشی کو کیا ہو گیا تھا۔ جنسی جذبات کے معاملے میں میں نے اسے

ابھی اس قدر بے چین اور اپنے آپ سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو مجھ پر گر پڑی۔ اس
نے قمیض اتار کر پرے پھینک دی اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ میں جھوٹ نہیں
بولوں گا۔ میں نے آپ کو اپنی داستان سنانے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آپ کو سارے
واقعات حرف بحرف اسی طرح بیان کروں گا جس طرح وہ میرے ساتھ پیش آئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے ارادوں کی چٹان بھی ہل گئی۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہل
گیا۔ میں اپنا ہاتھ میناکشی کے جسم سے الگ کرنا چاہتا تھا مگر وہ الگ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی
طاقت نے اسے میناکشی کے جسم کے ساتھ اس طرح پیوست کر دیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے
ایک انچ کیا ایک سوتر کے برابر بھی اوپر نہیں اٹھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ
جنسی جذبات بھی زندگی کی دوسری حقیقتوں کی طرح ایک بہت بڑی حقیقت اور ایک بہت
بڑی طاقت ہے اور اس طاقت کو انسان کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ اس طاقت کو صحیح رخ پر
ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس وقت میری یہ طاقت غلط رخ پر پڑ چکی تھی۔ میناکشی تو
پگھل ہوئی جا رہی تھی۔

عین اس وقت کونے کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے بجنے لگی۔ میں
جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جن خدشوں اور تشویش سے میں نے ذہنی طور پر چھٹکارا حاصل
کیا تھا وہ سارے خدشے اور تشویشناک خیالات دوبارہ میرے دماغ میں بیدار ہو گئے۔
میناکشی بھی جلدی سے الگ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"کہیں پتا جی کا دلی سے فون نہ آیا ہو"

وہ ریشمی قمیض الٹی سیدھی پہنتی فون کی طرف دوڑی۔ ریسیور اٹھا کر بولی۔

"ہیلو"

پھر اس نے فون میز پر رکھ دیا اور پتلون اوپر کرتے ہوئے میرے قریب آکر کہنے
لگی۔

"گوروجی! آپ کا فون ہے۔ جلدی فون سن کر آجانا"

وہ دیوان پر لیٹ گئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف گیا۔ اس بات پر

سخت حیران تھا کہ مجھے یہاں فون کس نے کیا ہے۔ میں نے تو سوائے کریم بھائی کے اور کسی کو یہاں کا فون نمبر نہیں دیا اور اس نے بھی یہاں کبھی فون نہیں کیا۔ اور اس وقت اس کے فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہیلو! میں گوروداس وردھنا بول رہا ہوں"

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"فوراً روپوش ہو جاؤ"

اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ ہمارے ماسٹر سپائی کریم بھائی کی آواز تھی۔ کریم نے مجھے جو پیغام دیا تھا یہ کوئی بھی ماسٹر سپائی اپنے کمانڈو جاسوس کو اس وقت دیتا ہے جب کمانڈو جاسوس انتہائی خطرناک حالات میں گھر چکا ہو۔ یہ ایسا ہی پیغام ہوتا ہے جو کسی جہاز کا پائلٹ جب جہاز گر کر کریش ہونے والا ہو تو آس پاس کے کنٹرول سنٹروں کو مے ڈے مے ڈے کہہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ کر سکتے ہو تو کرو کیونکہ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ "روپوش ہو جاؤ" کا پیغام جب کسی کمانڈو جاسوس یا عام جاسوس کو ملتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ موت تمہارے سر پر پہنچنے والی ہے بھاگ سکتے ہو تو جہاں اور جس حالت میں بھی ہو جان بچا کر بھاگ جاؤ۔

یہ پیغام ملتے ہی مجھے اپنے سارے خدشے اور اندیشے درست نظر آنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے میناکشی سے کہا۔

"نیچے جاؤ۔ فوراً"

میرا لہجہ اس قدر تیز اور تحکمانہ تھا کہ میناکشی ڈر کر اٹھی اور اپنا لباس ٹھیک کرتی سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے دوڑ کر پردے کو ہٹایا اور بنگلے کے گیٹ پر نگاہ ڈالی میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لئے تیز ہو گئی۔ پولیس کی گاڑیاں تیزی سے ایک طرف سے آئیں اور بنگلے کے سامنے آ کر ایک دم بریکیں لگنے

دھچکوں کے ساتھ رک گئیں۔ اب سوائے بھاگنے کے میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے کا کئی بار اس خیال سے جائزہ لے چکا تھا کہ اگر کبھی ایمرجنسی کے حالات پیدا ہو گئے تو مجھے کیا کرنا ہو گا اور کس طرف سے فرار ہونا ہو گا۔ میرے دوسری منزل والے کمرے کے عقب میں نیچے نوکروں کے کوارٹروں کی چھت تھی۔ اس چھت تک ایک پائپ گیا ہوا تھا۔ میرے کمرے کی عقبی کھڑکی اور کوارٹروں کی چھت کے درمیان ایک روشندان کا چھوٹا چھجہ بھی باہر کو نکلا ہوا تھا۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے مسٹر پانڈے کے بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچ چکی تھی اور بہت ممکن تھا کہ پولیس کے کچھ سپاہی اس خیال سے بنگلے کی پچھلی طرف بھی آ جائیں کہ کہیں میں پچھلی طرف سے نہ نکل جاؤں۔ اس لئے میرے پاس سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔

میری کمانڈو ٹریننگ کی تمام صلاحیتیں ابھر آئی تھیں۔ اس وقت میں ایک جینی سادھو کی بجائے ایک انتہائی تربیت یافتہ تجربے کار کمانڈو بن چکا تھا۔ میں کھڑکی میں سے باہر نکل کر نیچے روشندان کے چھجے پر آ گیا اور پائپ کو پکڑ کر اس سے بھی نیچے نوکروں کے کوارٹر کی چھت پر کود گیا۔ میں اس طرح کودا کہ اپنا سر دونوں بازوؤں میں کر لیا اور چھت پر آتے ہی قلابازی کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری جانب بنگلے کی عقبی گلی تھی جس کے آگے اینٹوں کی قد آدم دیوار تھی۔ میں کوارٹروں کی چھت سے گلی میں کودا اور دوڑ کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ یہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں ہر قسم کے درخت اور جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میری حالت اس وقت اس چیتے کی طرح تھی جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو اور اس کی طرف سرپٹ بھاگ رہا ہو۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کس طرح وہ میدان پار کیا۔ آگے ایک اور دیوار آ گئی جس پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں یہ دیوار بھی پھلانگ گیا۔ دوسری طرف ایک سڑک تھی جس پر ٹریفک آ جا رہی تھی۔ مجھے کوئی خالی رکشا یا ٹیکسی نظر نہ آئی۔ میں اب بھاگ تو نہیں رہا تھا مگر سڑک کی دوسری طرف درختوں کے پیچھے آ کر تیز تیز مغرب کی طرف چلا جا رہا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ مغرب کی سمت چلنے سے میں احمد آباد شہر سے باہر نکل جاؤں گا۔

مگر میں زیادہ دیر پیدل چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ پولیس کو جب میں گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر نہیں ملا ہوں گا اور میناکشی نے پولیس کو بتایا ہو گا کہ میں تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں تھا اور مجھے کسی کا فون آیا تھا تو پولیس سمجھ گئی ہو گی کہ میں دوسری منزل سے بنگلے کے پیچھے کی طرف کود کر بھاگ گیا ہوں اور پولیس یقیناً میرے پیچھے اسی طرف آ رہی ہو گی۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر مجھے کوئی ٹیکسی رکشا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک ٹرک پر پڑی جو سڑک پر پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ آگے سڑک کا موڑ تھا۔ میں موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں آ کر ٹرک کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ جب ٹرک موڑ گھوما تو میں نے اس کے پیچھے دوڑ کر اس کے لٹکتے ہوئے رسے کو پکڑا اور لٹک گیا۔ پھر ایک ٹانگ اوپر رکھ کر خود کو ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان گرا دیا۔

میں ٹرک پر لدی ہوئی بوریوں کے درمیان جہاں گرا تھا کچھ دیر وہیں پڑا رہا۔ پھر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ٹرک میں نیچے سے اوپر تک کسی چیز سے بھری ہوئی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ٹرک تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتا جا رہا تھا۔ بوریوں کے اوپر ترپال ڈال کر رسیوں سے باندھ دی گئی تھی۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں کافی جگہ تھی اور ایک ٹائر کی سٹپنی اور دو خالی ڈبے پڑے تھے۔ جس طرح میں بیٹھا تھا باہر سے دیکھنے پر صرف میری گردن ہی نظر آتی تھی۔ اس خیال سے میں نے اپنا سر نیچے کر لیا کہ اگر پولیس کی گاڑی میری تلاش میں اس سڑک پر آئے تو میں اسے دکھائی نہ دوں۔

آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ بارش ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ٹرک کس طرف جا رہا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شہر سے باہر نکل رہا ہے یا آگے جا کر واپس شہر کی غلہ منڈی کی طرف مڑ جائے گا۔ اس وقت میرے لئے یہ بات ہی کافی تھی کہ میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ نکلا ہوں۔ میں ٹرک کے پیچھے بوریوں کے درمیان اس طرح نیم دراز ہو کر لیٹا تھا کہ مجھے اوپر پیچھے کو جاتے ہوئے درخت نظر آ رہے تھے۔ سڑک بالکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ٹرک

اپنی خاص رفتار سے چلتا رہا۔ اس نے سڑک پر ایک موڑ بھی کاٹا۔ پھر سیدھا ہو کر سامنے کے رخ چلنے لگا۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ ٹرک احمد آباد شہر سے باہر کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے دل میں یہی پروگرام بنایا تھا کہ شہر سے باہر نکلتے ہی میں کوئی مناسب جگہ اور موقع دیکھ کر ٹرک سے چھلانگ لگا دوں گا اور کسی جنگل میں غائب ہو جاؤں گا۔ کچھ دن جنگل میں ہی گزاروں گا اور اس کے بعد کسی طرح حلیہ بدل کر دلی پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ دلی میں ہمارا ایک دوسرا ماسٹر سپائی گل خان تھا۔ مجھے اب اس کے پاس پہنچ کر کسی اگلے کمانڈو مشن کی تیاری کرنی تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے بریکیں لگائیں اور ٹرک کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ ٹرک کسی جگہ رک رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ آگے کوئی ٹریفک سگنل والا چوک آ گیا ہے۔ ڈرائیور لال بتی کے اشارے پر ٹرک کو روک رہا ہے۔ لیکن آگے صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ میں نے سر باہر نکال کر آگے کی طرف دیکھا تو میرا رنگ اڑ گیا۔ چوک میں پولیس کی پوری مسلح گارڈ موجود تھی۔ سب انسپکٹر نے ٹرک ڈرائیور کو باہر نکلنے کے لئے کہا۔ ساتھ ہی دو سپاہی ٹرک کا پچھلا حصہ چیک کرنے کے لئے میری طرف بڑھے۔ میں نے اپنے آپ کو پیچھے گرا دیا۔

باہر نکل کر بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر سپاہی کے پاس رائفل تھی۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت تھے وہ بڑی آسانی سے گولی مار سکتے تھے۔ ایک ثانیہ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے پچھلے سارے واقعات فلم کی طرح گھوم گئے۔ مجھے ٹرک کی دونوں جانب سے پولیس والوں کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ٹرک کے پیچھے آ رہے تھے۔ ظاہر ہے پولیس نے میری تلاش کے لئے احمد آباد شہر سے باہر جانے والے سارے راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی اور ایک ایک گاڑی کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اگرچہ پولیس کے پاس میری کوئی فوٹو نہیں تھی لیکن میناکشی نے اور گیٹ والے گارڈ نے میرا حلیہ پولیس کو بتا دیا ہو گا اور میں ابھی تک اسی حلیے یعنی سادھوؤں والے لباس میں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو گرفتار ہونے کے لئے تیار کر لیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں

تھا۔ ٹرک میں بوریاں ایک دوسری کے اوپر اس طرح رکھی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ صرف سامنے تھوڑی سی جگہ تھی جہاں میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ سپاہی ٹرک کے عقب میں آگئے۔

میں ان کے سامنے بوریوں کے پاس سکڑ کر بیٹھا انہیں تکنے لگا۔ دونوں پولیس والوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جو انہوں نے ٹرک کی بوریوں کی جانب تان رکھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ مزاحمت کرنی بیکار تھی۔ یہی طے کیا کہ جاسوس کمانڈو کا گرفتار ہو جانا بھی اس کھیل کا ایک حصہ ہے آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پولیس کے سپاہیوں کو چاہئے تھا کہ رائفلوں کا رخ ایک دم میری طرف کر کے شور مچا دیتے کہ مفرور پیچھے ہے۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے نہ تو دوسرے پولیس سنتریوں یا اپنے سب انسپکٹر کو آواز دی اور نہ آگے بڑھ کر مجھے پکڑا۔ بلکہ انہوں نے مجھے آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ بس مجھے ایسا لگا جیسے ان کی نظریں میرے آس پاس بوریوں کا ہی جائزہ لے رہی ہیں پھر ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔

"سر! پیچھے مفرور مجرم نہیں ہے"

اور دونوں ٹرک کے اگلے حصے کی طرف چل دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا کہ کہیں میں غائب تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں غائب بھی نہیں تھا اور ان سپاہیوں کو میں دکھائی بھی نہیں دیا۔ میں ٹرک کے پیچھے اپنے پورے جسم اور اپنے لباس کے ساتھ موجود تھا۔ پھر یہ سب کیسے ہو گیا کہ سپاہی میری تلاش میں ٹرک کے پیچھے آئے۔ میں پیچھے ان کے سامنے ہاتھ اٹھائے بیٹھا تھا اور ان کو دکھائی نہیں دیا۔ یہ معمہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس دوران ٹرک سٹارٹ ہوا اور آگے چل پڑا۔

ٹرک چوک میں سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ چوک میں ایک جانب احمد آباد پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر سڑک کے درمیان آنے والی گاڑیوں کو روک کر ان کی چیکنگ کر رہے تھے۔ ٹرک چوک میں سے گزرنے کے بعد

پوری رفتار سے چلنے لگا۔ میں ابھی تک عالم حیرت میں تھا۔ اگرچہ میری زندگی میں بڑے بڑے عقل کو حیران کر دینے والے مافوق الفطرت واقعات رونما ہو چکے تھے مگر اس واقعے نے ایک بار تو مجھے بھی چکرا دیا تھا۔ ٹرک شہر کی آبادی والے علاقے سے نکل کر کھیتوں میدانوں اور غیر آباد علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ پھر دریائے سابرمتی کا پل آگیا۔ ٹرک پل پر سے گزرنے لگا۔ جب پل کی دوسری طرف پہنچا تو اچانک مجھے لوبان کی تیز خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ کیونکہ یہ ہوائی مخلوق یا جے پور کی نرتکی کی بدروح چندریکا کی خوشبو تھی۔ یہ عورت مجھے جے پور کی سنگ مرمر کی چھتریوں والی مڑھیوں میں ملی تھی اور اس نے میرے سامنے ظاہر ہو کر کہا تھا کہ تم پچھلے جنم میں میرے خاوند رہ چکے ہو۔ اسے سخت صدمہ تھا کہ میں اس جنم میں کسی ہندو گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کی ان بے سروپا توہمات کی باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا مگر میں اس کا شکر گزار ضرور تھا کیونکہ اس نے جیسا کہ آپ میری کہانی میں پڑھ چکے ہوں گے مصیبت کے وقت میری بڑی مدد کی تھی۔

میں نے اسے آواز دی۔

"چندریکا! کیا یہ تم ہو؟"

چندریکا میرے سامنے ظاہر ہو گئی۔ وہ زعفرانی کلر کی گوٹہ لگی بڑی قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں پہلے روز کی طرح سفید پھولوں کا گجرا سج رہا تھا۔ مگر خلاف معمول اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ورنہ پہلے وہ مجھ سے ملنے آتی تھی تو مسکرا رہی ہوتی تھی۔ وہ میرے پاس ہی ٹرک کے پچھلے حصے میں بوریوں کے پاس کھڑی تھی۔ پھر وہ ایک بوری پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم پچھلے جنم میں میرے خاوند نہ رہ چکے ہوتے اور میں نے تم سے تمہاری مدد کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں کبھی تمہاری مدد کو نہ آتی"

میں سمجھ گیا کہ ٹرک میں پولیس کے سپاہیوں کو جو میں موجود ہونے کے باوجود دکھائی نہیں دیا وہ اسی بدروح چندریکا کی شعبدہ بازی تھی۔ میں چپ رہا۔ چندریکا نے کہا۔

"جب پولیس کے آدمی ٹرک کے پیچھے تمہاری تلاش میں آئے تھے تو میں تمہارے آگے کھڑی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس والوں کو تم نظر نہیں آئے۔"

میں نے کہا۔

"چندریکا! میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

چندریکا کے چہرے پر گہری متانت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"مگر آج کے بعد میں تمہاری مدد کو نہیں آؤں گی میں تمہیں یہی بتانے کے لئے تمہارے سامنے ظاہر ہوئی ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تمہارے سامنے بھی نہ آتی۔"

میں نے ذرا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ آخر مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟"

چندریکا کے لہجے میں درشتی آگئی۔ کہنے لگی۔

"یہ درست ہے کہ تم پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہے اور اگلے جنم میں بھی تمہیں واپس میرے پاس آنا ہے۔ لیکن آخر میں برہمن ہندو ہوں۔ بھارت ماتا کی سنتان ہوں۔ میں یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ تم میرے ملک بھارت ورش کو تباہ کرو۔"

میں نے اسے کہا۔

"سین چندریکا! تم نے خود ہی پچھلی ملاقات میں مجھے کہا تھا کہ تم میرے معاملے میں دخل نہیں دوگی تم میری اگر مدد نہیں کروگی تو میرے کمانڈو مشن کی مزاحمت بھی نہیں کروگی۔ اب کیا بات ہوگئی ہے کہ تم اپنے قول سے پھر گئی ہو"

چندریکا نے اسی درشت لہجے میں کہا۔

"تم نے دوارکا فورٹ کو جس طرح برباد کیا ہے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تمہیں آخری بار یہ کہنے کے لئے آئی ہوں کہ اب میں کسی مشکل وقت میں تمہاری مدد کرنے کو نہیں آؤں گی۔ یہ آخری بار تھی جب میں آج تمہیں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچالیا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے کسی کمانڈو مشن میں دخل نہیں دوں گی۔ میں اس وعدے پر قائم رہوں گی۔ تم

جو چاہے کرو۔ میں دخل نہیں دوں گی۔ لیکن اگر تم پکڑے گئے اور تمہیں گولی سے اڑا دیا گیا یا تمہیں پھانسی لگ گئی تب بھی میں تمہیں بچانے نہیں آؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"لیکن تم نے خود ہی کہا تھا کہ تمہیں میری غیر قدرتی اور بڑھاپے سے پہلے کی موت قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح تمہارے عقیدے کے مطابق تمہیں میرے اگلے جنم کے لئے ایک لاکھ سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

چندریکا نے جواب دیا۔

"ہاں میں جانتی ہوں کہ اگر تم بوڑھے ہو کر قدرتی موت نہ مرے تو مجھے ایک لاکھ سال تک تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر مجھے یہ بھی قبول نہیں کہ تم میرے ملک بھارت کو نقصان پہنچاؤ اور میں تمہاری مدد کرتی رہوں۔"

میں نے بھی تھوڑا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو تم بھارت کے حکمرانوں کو جا کر یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ کشمیریوں پر ظلم و ستم کرنا' ان کے مکانوں کو آگ لگانا' ان کی خواتین کو بے عزت کرنا' ان کے نوجوانوں کو گولیوں سے اڑانا بند کردیں۔ کشمیر کے لوگ اپنا حق خود ارادی مانگتے ہیں جو ان کا جائز حق ہے۔ کشمیر میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے بھارت نے کشمیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے تمہاری بھارت ماتا اندرا گاندھی پاکستان میں را کے تخریب کار بھیج کر وہاں بے گناہ انسانوں کا خون بہا رہی ہے۔ تم اندرا گاندھی کو جا کر کیوں نہیں سمجھاتیں کہ وہ پاکستان میں تخریب کار بھیجنے بند کردے۔ میں نے تو یہاں صرف گولہ بارود کے وہ ذخیرے اڑائے ہیں جو اپنی آزادی کے لئے جہاد کرنے والے کشمیریوں کے خلاف استعمال کئے جانے تھے۔ میں نے کسی ریلوے سٹیشن' بس سٹیشن کسی سینما ہال' کسی ایئرپورٹ کسی شاپنگ سنٹر میں بم کا دھماکہ نہیں کیا۔ میں نے تو تمہارے بھارت کے کسی بے گناہ انسان کا خون نہیں بہایا تم مجھے سمجھانے کی بجائے بھارت کے حکمرانوں کو جا کر سمجھاؤ کہ وہ بے گناہ انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنا بند کرے۔

میری باتوں کا چندریکا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ الٹا وہ غصے میں آ گئی۔ کہنے لگی۔
"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں یہ کہہ کر جا رہی ہوں کہ اب میں اگر تمہارے معاملے میں دخل نہیں دوں گی تو تمہاری مدد کرنے بھی نہیں آؤں گی۔ تم جانو اور تمہارا کام"
اور چندریکا میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

چندریکا کے غائب ہونے کے بعد لوبان کی خوشبو بھی غائب ہو گئی۔
اگرچہ چندریکا نے کئی بار عین وقت پر میری مدد کی تھی اور میں اس کا شکر گذار تھا لیکن اس کے ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو جانے سے ایک طرح کا اطمینان بھی ہوا۔ کیونکہ یہ عورت جو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرتی تھی میرے لئے ذہنی الجھن کا باعث بھی تھی۔ اس کی ساری بے سروپا توہماتی باتیں میرے اسلامی عقیدے کے خلاف تھیں جو مجھے پسند نہیں تھیں۔ میں اس کی مدد کا محتاج نہیں تھا۔ میں خدا کی مدد کا محتاج تھا اور اسی کا محتاج رہنا چاہتا تھا۔
ٹرک اس وقت اونچے نیچے میدان میں سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں ریت کے بھورے رنگ کے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ شام آ رہی تھی۔ دن کی روشنی کم ہونے لگی تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک کس شہر کی طرف جا رہا ہے۔ میرے لئے یہی تسلی کافی تھی کہ میں احمد آباد شہر سے نکل آیا تھا اور مزید اس شہر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دیہاتی آبادی شروع ہو گئی۔ کوئی شہر یا قصبہ آ رہا تھا۔ میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اگر ٹرک یہاں پر رکتا ہے تو مجھے ٹرک سے اتر کر کسی جگہ چھپ جانا تھا۔ سڑک کے کنارے دو تین بیل گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ٹرک کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ ٹرک یہاں رکنے والا تھا۔ میں ہوشیار ہو گیا۔ جیسے ہی ٹرک سڑک

سے اتر کر کچے راستے پر آیا میں نے ٹرک میں سے چھلانگ لگا دی۔ میں جھاڑیوں میں گرا۔ میری کمانڈو ٹریننگ نے مجھے سکھایا ہوا تھا کہ تیز رفتار ٹرک ریل گاڑی یا آہستہ ہوتے ہوئے ٹرک اور ریل گاڑی میں سے کس طرح منہ آگے کی طرف رکھ کر چھلانگ لگانی ہے اور چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی کس طرح دو چار قدم آگے کی طرف دوڑنا ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر بھی میں جھاڑیوں میں گر گیا۔

جلدی سے اٹھا اور درختوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

ٹرک ایک اڈے پر جا کر رک گیا تھا۔ یہ کوئی قصبہ تھا۔ سڑک کی دونوں جانب لکڑی کے کھوکھوں کی دکانیں تھیں جہاں چائے سگریٹ وغیرہ بک رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا یہاں سے کوئی دوسری سواری پکڑوں یا اسی ٹرک میں سوار ہو جاؤں۔ میں سب سے پہلے یہ پتہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ سڑک آگے کون سے شہر کو جاتی ہے۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ آگے سے کوئی گاڑی آتی تھی یا پیچھے سے کوئی گاڑی کراس کرنا چاہتی تھی تو اگلی گاڑی کو سڑک پر سے کچے پر اترنا پڑتا تھا۔ راستے میں کوئی ریلوے پھاٹک بھی نہیں آیا تھا۔ یہاں بھی دور تک کوئی ریلوے سگنل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کوئی ریلوے سٹیشن قریب ہو گا۔ اور میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل کر کسی ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر کوئی گاڑی پکڑ لیتا۔ یہ ضرور تھا کہ میں خطرے والے شہر احمد آباد سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا گمان ضرور تھا کہ احمد آباد پولیس نے آس پاس کے بڑے شہروں کو میرے فرار ہونے کی وائرلیس پر اطلاع کر دی ہو گی اور پولیس سٹیشنوں کو میرا حلیہ بھی بتا دیا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں کوئی معمولی مجرم نہیں تھا۔ میں دوارکا فورٹ کو تباہ و برباد کر کے فرار ہوا تھا۔ ایک بات کا خیال بھی مجھے آتا تھا کہ پولیس نے میرے کمرے کی زبردست تلاشی لی ہو گی اور عین ممکن ہے کہ انہیں غسل خانے کے باہر رکھی ہوئی وزن کرنے والی مشین میں سے مائیکرو فون اور چھوٹا ٹرانسمیٹر مل گیا ہو۔ یہ چیزیں مجھے غیر ملکی جاسوس اور تخریب کار ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ میں درخت کی اوٹ میں جھاڑیوں کے پاس بیٹھا یہ سوچ بھی رہا تھا اور اس ٹرک کو ہاہے

بھی دیکھ رہا تھا جس پر بیٹھ کر میں آیا تھا۔ ٹرک پر کچھ اور سامان لادا جا رہا تھا۔ یہ سامان ترپال کھول کر بوریوں کے اوپر رکھا جا رہا تھا۔ جب سامان لادا جا چکا تو اس پر دوبارا ترپال ڈال دی گئی۔ شام کی ہلکی ہلکی سیاہی پھیلنے لگی تھی۔ دور ایک کھوکے کے باہر بجلی کا بلب روشن ہو گیا تھا۔

میری نگاہیں ٹرک پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے اسی ٹرک پر سوار ہو کر آگے جانا تھا۔ میں نے ٹرک کی کھڑکی کھول کر ڈرائیور کو اپنی سیٹ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس نے دو تین بار ہارن دیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا ٹرک کی طرف آیا۔ اور دوسری طرف سے کھڑکی کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ کلینر ہی ہو سکتا تھا۔ ٹرک چلنے والا تھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر سڑک کی دوسری طرف آکر تیز تیز آگے کو چلنے لگا۔ مجھے آگے جا کر چلتے ٹرک میں سوار ہونا تھا۔ میں ٹرک سے آگے نکل کر ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ ٹرک چل پڑا تھا۔ ابھی اس نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے دو چار قدم دوڑ کر اس کے پیچھے جو رسی لٹک رہی تھی اسے پکڑا اور اچھل کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔

قصبے کی آبادی والے علاقے سے دور نکلنے کے بعد ٹرک نے ایک خاص نپی تلی رفتار پکڑ لی۔ سامان زیادہ لدے ہونے کی وجہ سے ٹرک کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ٹرک ایک بار پھر غیر آباد میدانوں اور چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ لیکن میری سخت کمانڈو ٹریننگ نے مجھے دیر تک بھوکا پیاسا رہنا سکھا دیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد رات ہو گئی۔ آس پاس میدانوں میں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ اب اگر کوئی بڑا قصبہ یا چھوٹا شہر آیا تو میں ٹرک سے اتر جاؤں گا اور کسی نزدیکی ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ وہاں جا کر مجھے کم از کم یہ تو معلوم ہو گا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔

میری منزل دلی تھی۔ اور یہ بات واضح نہیں تھی کہ یہ ٹرک دلی والے روٹ پر چل رہا ہے یا راجستھان کی طرف جا رہا ہے۔ میدانوں کے منظر سے کوئی چیز کھل کر صاف نہیں

ہو رہی تھی۔ نہ ریت کے ٹیلے تھے کہ میں سمجھتا کہ میں راجستھان کے صوبے میں دا
ہوگیا ہوں اور نہ جنگل اور گہرا سبزہ تھا کہ مجھے یہ خیال آتا کہ ٹرک رتلام کی طرف جا
ہے جو بمبئی سے دلی جانے والی مین لائن پر واقع تھا۔ کوئی دو گھنٹے تک ٹرک اسی رفتار
سڑک پر چلتا گیا اس کے بعد مجھے اردگرد کہیں کہیں روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ضرو
کسی شہر کی روشنیاں تھیں۔ کوئی شہر آرہا تھا۔ میں ٹرک کے پیچھے بیٹھا تھا۔ روشنیاں می
عقب سے آکر گزر رہی تھیں۔ میں نے دور سرخ رنگ کی بتی دیکھی۔ یہ ریلوے
کی بتی ہی وہ سکتی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ اب مجھے علم ہو سکتا تھا کہ میں کہاں پر ہوں
آگے کون سا شہر ہو گا۔ ویسے درخت وغیرہ بتا رہے تھے کہ یہ راجستھان کا علاقہ نہیں
زیادہ تر تاڑ کے درخت ہی راستے میں نظر آئے تھے۔ اور تاڑ کے درخت راجستھان
نہیں ہوتے۔

ٹرک کی رفتار ایک بار پھر آہستہ ہونے لگی۔ اردگرد مکانوں کی روشنیاں نظر آ
تھیں۔ پھر ٹرک ایک بازار میں داخل ہو گیا۔ دکانیں کھلی تھیں۔ ان دکانوں کی وضع
سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ ٹرک ایک اڈے کی طرف مڑ
جیسے ہی میں نے اڈے میں کچھ اور ٹرکوں کو دیکھا میں ٹرک میں سے کود کر باہر آگیا۔
سادھوؤں کے لباس میں تھا اور اس لباس میں ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لوگ
عزت سے پیش آتے تھے۔ لوگ سادھوؤں سے اس لئے بھی ڈرتے تھے کہ اگر ا
نے سادھو مہاراج کی تکریم نہ کی تو کہیں وہ انہیں شراپ یعنی بد دعا نہ دے دے۔
سیدھا ایک کھوکے پر گیا جہاں بہت بڑے توے پر پھلکے پکائے جا رہے تھے۔ میں نے
بچھے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر روٹی اور دال کھائی۔ پانی پیا۔ دوسرے کھوکھے پر جا کر
سگریٹ لیا۔ دونوں کھوکھوں والوں نے مجھ سے ایک پیسہ بھی نہ لیا۔ میں ایک طرف
بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا۔ مجھے پہنچا ہوا سادھو سمجھ کر ایک بوڑھا دبلا پتلا آدمی
پاس آگیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"مہاراج! میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتائیں"

میں نے بھی پہنچے ہوئے سادھوؤں کی طرح اداکاری کرتے ہوئے اسے نزدیک آنے
کو کہا۔ جب وہ آدمی میرے قدموں کے پاس بیٹھ گیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تیرا کلیان ہو بابا ہمیں کسی سیوا کی ضرورت نہیں۔ ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں۔ کسی
سے کچھ نہیں مانگتے۔"

وہ آدمی میری پنڈلی دبانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"بابا! ہم اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس شہر کا نام کیا ہے"

اس آدمی نے کہا۔

"گوروجی! یہ جبوہا شہر ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

"بابا اس کے آگے کون سا شہر ہے اور اس کے آگے کون سا شہر آتا ہے"

وہ آدمی بولا۔

"گورو مہاراج! آگے شردھا پور کا شہر آتا ہے۔ اس کے آگے بہت بڑا شہر اندور
ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دلی لائن پر ہی تھا۔ میں نے
دوسری پنڈلی اس آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"بابا لوگ! یہاں کوئی سٹیشن بھی ہے جہاں ریل گاڑیاں چلتی ہیں؟"

اس آدمی نے بتایا کہ جبوہا کا ریلوے سٹیشن وہاں سے قریب ہی ہے

"مہاراج! اگر آپ کو ریلوے سٹیشن جانا ہے تو میں آپ کو اپنے یکے پر چھوڑ آتا
ہوں۔ میں شہر میں یکہ چلاتا ہوں"

مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"تمہارا کلیان ہو۔ جاؤ جا کر اپنا یکہ ادھر لے آؤ۔"

اس آدمی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! یکہ ریلوے سٹیشن جانے والی سڑک پر وہ سامنے کھڑا ہے۔ اگر تکلیف نہ

ہو تو میرے ساتھ آجائیے۔ یہاں لاری اڈے پر یکہ لانے نہیں دیتے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو بابا لوگ! ہم وہیں چلتے ہیں"

یکہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا کچے راستے پر سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کھیتوں
اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور سے سٹیشن کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ابھی
آدھے راستے میں تھا کہ بادلوں میں بجلی چمکی۔ ہلکی گرج سنائی دی اور بارش ہونے لگی
یکے پر چھت پڑی تھی۔ میں پچھلی نشست کے درمیان میں ہو کر بیٹھا تھا۔ جس کی
سے بارش سے بچا ہوا تھا۔ یہ جبوہا کا سٹیشن تھا۔ پہلے میں ادھر کبھی نہیں گزرا تھا۔ یہ
آباد سے اندور کی برانچ لائن تھی۔ اندور سے اوپر بھوپال جھانسی سے دلی آگرہ کی مین لا
شروع ہوتی تھی۔

جبوہا کا چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ ایک ہی لمبا پلیٹ فارم تھا۔ میں نے احتیاطاً دلی کا ٹ
لے لیا اور پلیٹ فارم پر آکر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر چند ایک ہی دیہ
ٹائپ کے مسافر بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر گیٹ سے
فاصلے پر سٹیشن کی چھت کے نیچے بیٹھا تھا۔ چھت پر بارش کی بوندیں گرنے کی آواز
آرہی تھی۔ اندور جانے والی پسنجر ٹرین کوئی ایک گھنٹے بعد آئی۔ مسافروں سے بھری
تھی۔ یہ احمد آباد سے آرہی تھی۔ میں اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ بڑے غور سے ایک ا
ڈبے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی پولیس کا سپاہی نہیں تھا۔ ٹرین رکی تو کچھ مسافر اترے۔
سوار ہو گئے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ٹرین کے ساتھ پولیس کا کوئی سپاہی نہیں
میں ٹرین کے پچھلے ڈبوں میں سے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔
گیروے لباس میں دیکھ کر ایک مسافر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"پدھاریئے مہاراج؟"

میں نے بھی انکار نہ کیا اور اس آدمی کی سیٹ پر خوب چوڑا ہو کر بیٹھ گیا۔ ٹرین
تین منٹ ہی رکی۔ پھر چل پڑی۔ ایک مسافر نے تھیلے میں سے مٹھائی نکال کر مجھے

کی۔ دوسرے نے صراحی میں سے کٹورے میں پانی بھر کر پیش کیا۔ غرض کہ میری خوب
آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ میں نے بھی سنسکرت اور ہندی کے دوہے اور اشلوک پڑھ کر
نہیں طرح طرح کے اپدیش دینے شروع کر دیئے۔ سارے ڈبے کے مسافر میری طرف
متوجہ ہو گئے۔ ٹرین اندور کی طرف دوڑتی چلی جارہی تھی۔ مگر ابھی اندور بہت دور تھا۔
بھی ہندوؤں کے عام سادھو جوگی لوگوں کی طرح اداکاری کر رہا تھا۔ ایک عورت کی گود
بچہ دیکھا تو اس عورت کی طرف گھورتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا۔

"تو ستی ساوتری ہے۔ تیرا بالک بڑا ہو کر افسر لگے گا۔"

عورت کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور بار بار مجھے پرنام کرنے لگی۔ ایک آدمی کی
نکھوں کو جھک کر دیکھا اور کہا۔

"تمہیں جو پریشانی ہے بابا لوگ اس کے لئے صبح اٹھ کر بھگوان مہاویر کے نام کی مالا کا
سو ایک مرتبہ جاپ کیا کر۔ تیری ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔"

اس آدمی نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور رونے لگا۔ دنیا میں ایسا کون آدمی ہو گا جسے
پریشانی نہیں ہو گی۔ یہ سادھو لوگ سارے فراڈ ہوتے ہیں اور لوگوں کی اسی کمزوری
فائدہ اٹھا کر ان پر اپنا اثر جما لیتے ہیں اور ان سے خدمتیں کرواتے ہیں۔ اس ڈرامہ
سے میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ ڈبے میں ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں نام
ری پکا جین بھگت ہوں۔ جب سب لوگوں پر میرا اثر بیٹھ گیا اور میں نے بھی اپنی تیز
وں سے ہر ایک مسافر کا جائزہ لے کر دیکھ لیا کہ ان میں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی نہیں
تو بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر کے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے آرام کرتا دیکھ
سب پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔

ٹرین دوڑتی جارہی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا۔ بارش تیز ہو گئی تو پانی کی بوچھاڑ اندر
لگی۔ میں نے آنکھیں بند کئے ہوئے بلند آواز میں حکم دیا۔

"کھڑکی کا شیشہ چڑھا دو"

فوراً کسی مسافر نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے تین چار سٹیشنوں پر کھڑی ہونے کے بعد شردھا پور کے بھی
بڑے سٹیشن پر رکی تو میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ آنکھیں ادھر ادھر گھما کر پلیٹ فا
کا جائزہ لیا۔ مجھے صرف ایک ہی دبلا پتلا پولیس کا سنتری نظر آیا۔ یہاں سے ٹرین چل
آگے بڑی دیر تک چلتی رہی۔ راستے میں ایک دریا کا پل بھی آیا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھ
میں نے کھڑکی کا شیشہ اتروا دیا تھا۔ ٹھنڈی اور بارش میں بھیگی ہوئی ہوا کے جھونکے اندر
آ رہے تھے۔ شردھا پور کے سٹیشن سے ہمارے ڈبے میں ایک ٹی ٹی چڑھ آیا تھا۔ اس
سب کے ٹکٹ چیک کیے۔ مجھ سے اس نے ٹکٹ کا نہ پوچھا۔ انڈیا میں سادھوؤں فقیروں
اور نابیناؤں کو ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت ہے۔ میں نے اسے بلا کر کہا۔

"تم نے ہمارا ٹکٹ چیک نہیں کیا بابو۔ ہم سادھو لوگ ضرور ہیں۔ پرنتو ہمارا
ورش کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ یہ لو ہمارا ٹکٹ بھی چیک کرو۔"

ٹی ٹی نے بڑے ادب سے میرا ٹکٹ چیک کیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مسافر
میرا مزید رعب بیٹھ گیا۔ مجھے اب اندور کا انتظار تھا ان دیہاتی مسافروں پر مجھے مزید ر
جمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ مسافروں نے دوار کا فوٹ میں گولہ بارود کو آگ لگے
باتیں شروع کر دیں۔ وہ لوگ بڑے ڈرے ہوئے تھے کہ کشمیر کے کمانڈو انڈیا کے
دراز شہروں تک پہنچ رہے ہیں۔ میں آنکھیں بند کیے خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا
رات کے کسی لمحے مجھے نیند آگئی۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ دوسرے دن کوئی
بجے کے قریب اندور کا سٹیشن آگیا۔ اندور ایک بڑا شہر اور جنکشن تھا۔ یہاں مجھے ہو
رہنے کی ضرورت تھی۔ سٹیشن پر چند ایک پولیس والے ادھر ادھر پھرتے دیکھے۔
ریلوے پولیس تھی۔ پھر بھی میں محتاط ہو گیا۔ یہاں سے مجھے ایک دوسری ٹرین میں
ہونا تھا جو دلی جا رہی تھی۔ یہ ٹرین کسی دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔
میں پل پر سے ہو کر اس پلیٹ فارم پر آیا۔ ٹرین فارم پر آیا۔ ٹرین تیار کھڑی
اسے احمد آباد سے آنے والی پسنجر ٹرین کا ہی انتظار تھا۔ میں ٹرین میں سوار ہونے کی
ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ جب ٹرین کے انجن نے سیٹی دی ا

مطمئن ہو گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے تو دوڑ کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یہاں
بمبئی بروڈہ مین لائن کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ٹرین بھی ایکسپریس تھی۔ خدا جانے
اس کا کیا نام تھا۔ آزادی ملنے کے بعد انڈیا نے بھی سب پرانی ریل گاڑیوں کے نام بدل
دیے تھے۔ اندور سے آگے بڑا سٹیشن بھوپال ہی تھا۔ اس کے بعد جھانسی گوالیار آگرہ اور
دلی تھا۔ یہ ریلوے ٹریک میرا دیکھا بھالا تھا۔ ٹرین نے اندور سٹیشن سے نکلتے ہی سپیڈ پکڑ
لی۔ تین ساڑھے تین گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین بھوپال کے گرد و نواح میں داخل ہو چکی
تھی۔ یہ بہت اہم ریلوے جنکشن تھا۔ یہاں مجھے خطرہ تھا کہ پولیس نے کہیں سٹیشن کی
ناکہ بندی نہ کر رکھی ہو۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ایک سٹیشن پیچھے اتر جاؤں۔ لیکن جب
ٹرین اسی سٹیشن پر نہ ٹھہری تو میں ڈبے میں بیٹھا رہا۔

ٹرین بھوپال کے کشادہ ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی۔ ریل کی پٹڑیوں کے
بدلنے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ٹرین کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ بھوپال کے سٹیشن کی
عمارت قریب آ رہی تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میں نے کھڑکی میں سے سر
نکال کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر اتنے مسافر نہیں تھے جتنی پولیس تھی۔ یہ پولیس کی دو
تین گارڈیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میری تلاش میں وہاں آئی تھیں۔ ٹرین کا انجن اور
اگلے دو تین ڈبے ہی ابھی پلیٹ فارم میں داخل ہوئے تھے۔ میں ڈبے کے دوسرے
دروازے میں سے خاموشی سے نیچے دوسری ریلوے لائن پر اتر گیا۔ پھر ریلوے لائنوں کو
پھلانگتا ریلوے یارڈ کی اس جانب نکل آیا جہاں دو چار خالی ڈبے کھڑے تھے۔ میں ایک
خالی ڈبے میں چڑھ کر اس کے دوسرے دروازے میں سے دوسری طرف نیچے اتر گیا۔
اب میں ریل کی پٹڑیوں کے جال سے نکل آیا تھا اور تیز تیز ایک طرف چل رہا تھا۔
بھوپال سٹیشن پر میں اس سے پہلے کبھی اترا نہیں تھا۔ بس ٹرین میں بیٹھا آگے نکل گیا تھا۔
یہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے رک کر دیکھا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔
جس پلیٹ فارم پر میری ٹرین کھڑی ہوئی تھی وہ مجھ سے کافی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں
سٹیشن کے مال گوداموں کی طرف آ گیا تھا۔ بادل پیچھے سے آسمان پر چلے آ رہے تھے۔ یہاں

بارش رک چکی تھی۔ میری بائیں جانب کسی گودام کا احاطہ تھا جس کا گیٹ کھلا تھا۔ سا
گیٹ کی دوسری جانب مجھے تانگے اور ٹیکسیاں وغیرہ کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ میں گودام
احاطے میں سے گزر کر سڑک پر آیا۔ میں نے بھوپال کے کسی سیتلا مندر کا نام سن رکھا
کہ وہاں ایک بڑا تالاب ہے جس میں سونے کی نتھنیوں والی مچھلیاں تیرتی ہیں۔ اس
سوا یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا۔ اتنا مجھے ضرور معلوم تھا کہ اس شہر میں مسلمان بھا
اکثریت میں آباد ہیں۔ میں نے ایک ٹیکسی والے کو سیتلا مندر چلنے کا کہا اور پچھلی سیٹ
بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے دوسرے ٹیکسی ڈرائیور ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں وہا
سے فوراً فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر پولیس کی اتنی بھاری نفری مجھے گرفتار کر
پلیٹ فارم پر موجود تھی تو پولیس سٹیشن کے باہر بھی موجود ہو گی۔ ٹیکسی پارک سٹیشن ک
مین دروازے سے ایک طرف ہٹ کر تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بڑے رعب
کہا۔

"مورکھ! دیر کیوں کرتا ہے۔ ہماری پوجا پاٹھ کا وقت ہو رہا ہے۔ ہمیں جلدی مند
پہنچنا ہے۔"

ڈرائیور یقیناً کوئی مسلمان تھا۔ اس پر میری بات کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ بس
خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا اور انجن سٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے کچھ
نہیں تھا کہ بھوپال شہر میں یہ سیتلا مندر کہاں پر ہے۔ ٹیکسی شہر کے ایک پرانے درواز
والی سڑک پر سے ہوتی ہوئی شہر کے گنجان علاقے سے گزرنے لگی۔ یہاں سے گزر
کے بعد ایک اور دروازہ آیا ٹیکسی اس دروازے سے دوبارہ شہر سے باہر آ گئی۔ پھر کئی ایک
علاقوں سے گزرنے کے بعد ایک غیر آباد سڑک پر سے ہوتی ہوئی سیتلا مندر پہنچ گئی۔ سیتا
مندر ایک ٹیلے کے دامن میں پرانا سا مندر تھا۔ مندر کے مخروطی مینار کے اوپر زعفرا
رنگ کے دو تین جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ شردھالو لوگ مندر کے پرا
دروازے میں سے گزر کر اندر جا رہے تھے۔ میں بھی کچھ سادھو لوگوں کے پیچھے پیچھے مند
میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک احاطہ تھا۔ سامنے مندر کا بڑا دروازہ تھا جس کی سیڑھیاں چڑھ

کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بالکل ویسا ہی ماحول تھا
جیسا میں اس سے پہلے مندروں کا ماحول دیکھ چکا تھا۔

میری اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ کسی طرح میں اپنا سادھوؤں والا
لباس تبدیل کروں۔ کیونکہ میری احمد آباد سے فرار ہوتے وقت یہی شناخت تھی اور
پولیس اسی لباس میں مجھے پکڑ سکتی تھی۔ مگر مندر میں لباس تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں
ایک طرف درخت کے نیچے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ میں نے درخت کی طرف منہ کر کے جیب
سے بٹوہ نکال کر پیسے گنے میرے پاس ایک سو کے قریب روپے موجود تھے۔ ان پیسوں میں
میں بازار سے سلے سلائے نئے کپڑے خرید سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ذرا اندھیرا ہو تو میں
شہر میں جا کر نئے کپڑے خرید کر پہن آؤں۔

اس مندر میں سوائے وقت گزارنے کے میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ اگرچہ وہاں یہ
خطرہ ضرور تھا کہ کہیں پولیس میری تلاشی میں مندروں میں چھاپے مارتی وہاں بھی نہ پہنچ
جائے۔ لیکن یہ کوئی اتنی ایمرجنسی والی بات نہیں تھی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے
بعد اٹھ کر مندر کے عقب میں آ گیا۔ یہاں وہ تالاب تھا جس میں نتھنیوں والی مچھلیاں تیر
رہی تھیں جو توہم پرست ہندو لوگ منتیں مانتے تھے وہ بازار سے کوئی کوئی سنہری یا زرد
رنگ کی مچھلی خرید کر اس کے نتھنوں میں سونے کی بالی ڈال کر اسے تالاب میں چھوڑ
دیتے تھے۔ تالاب کنارے عورتیں اور مرد کھڑے مچھلیوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

جب شام کا اندھیرا پھیل گیا تو میں اس خیال سے مندر کے بڑے دروازے کی طرف
چل پڑا کہ شہر میں جا کر کسی دوکان سے سلی سلائی قمیض پتلون خرید کر پہنتا ہوں تا کہ اس
خطرناک حلیے سے تو نجات ملے۔ جیسے ہی میں مندر کے بڑے گیٹ کے قریب آیا میں
نے پولیس کی ایک گاڑی سڑک پر سے آ کر وہاں رکتی دیکھی۔ گاڑی کے رکتے ہی تین چار
پولیس کے سپاہی گاڑی میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور مندر کی طرف بڑھے۔ میں
وہیں سے پلٹ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا مندر کے عقب میں آیا اور باہر نکلنے کا کوئی
راستہ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک سادھو زمین پر بیٹھا

سلفے کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ مجھے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ یہ دروازہ ک
طرف نکلتا ہے۔ میں جلدی جلدی چلتا دروازے سے نکل گیا۔ دوسری طرف مندر ک
ٹیلے کی ڈھلان تھی۔ نیچے ایک گہری کھائی تھی جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں ڈھلان اتر
کھائی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ گندے پانی کا نالہ نہیں تھا۔ یہ کوئی برساتی نالہ تھا ج
میں اس علاقے کا گندا پانی بھی گرتا تھا۔ نالے کے ساتھ چلتے چلتے میں ایک پلی کے پا
آگیا۔ چڑھائی چڑھ کر میں پلی پر سے ہوتا ہوا شہر کی طرف جانے کی بجائے دوسری جانب
جہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے۔ مڑ گیا۔

میں اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ میں اس راستے پر پڑ گیا ہوں جو آگے جا
بھوپال کے خطرناک جنگلوں میں نکل جاتا ہے۔ لیکن اس وقت مجھے کسی طرح اپنے آپ
پولیس کی گرفت سے بچانا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور درختوں کے نیچے رات
اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کچا راستہ تھا جو درختوں کے نیچے جھاڑیوں کے درمیا
سے آگے جا رہا تھا۔ میرے لئے اس قسم کا ماحول کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس سے پ
ہوشنگ آباد کے گھنے جنگلوں میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران کافی وقت گزار چکا تھا۔ پھر ا
میں جنگل میں زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جنگل میں کچھ دور آگے جا
مجھے کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ مل جائے جہاں میں رات گزار سکوں اور صبح کا اجالا ہوتے
یہاں سے دور کسی دوسری طرف نکل جاؤں۔ دن کی روشنی میں جنگل اتنا خطرناک نہ
ہوتا۔ ویسے بھی میں نہتا تھا۔ میرے پاس نہ تو کوئی پستول تھی اور نہ کمانڈو چاقو ہی تھا۔

اچانک مجھے طبلے ہارمونیم کی آواز آئی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اس جنگل میں ط
ہارمونیم کون بجا رہا ہے۔ آواز کچھ فاصلے سے آرہی تھی۔ اس وقت میں جھاڑیوں
اونچی اونچی گھاس کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔ ذرا آگے جا کر کچا راستہ ایک طرف
مڑ گیا۔ میں نے کچھ فاصلے پر بجلی کے بلب کی روشنی دیکھی۔ میں اس خیال سے روشنی
طرف چل پڑا کہ یہ کوئی گاؤں ہی ہو سکتا ہے یہاں مجھے رات گزارنے کے لئے کوئی ک
جگہ مل جائے۔ ہارمونیم اور طبلے کی آواز جہاں روشنی ہو رہی تھی اسی طرف سے آ

تھی۔ پھر گھنگھروؤں کی آواز بھی آنے لگی۔ لگتا تھا وہاں شادی بیاہ کی کوئی تقریب ہے اور
مجرا ہو رہا ہے۔ میں اس طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر دوسری طرف سے ہو کر
ادھر چلنے لگا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا طبلے ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی آواز قریب آرہی
تھی۔ اب کسی عورت نے گانا شروع کر دیا تھا۔ ذرا قریب جا کر میں نے دیکھا کہ ایک
مکان کے آگے درختوں کے درمیان شامیانہ لگا ہے۔ اور نیچے ایک عورت زرق برق
لباس میں طبلے کی تھاپ پر رقص کر رہی ہے۔ کچھ لوگ اس کے اردگرد دائرے کی شکل
میں بیٹھے تھے۔

میں ان لوگوں کی منڈلی سے پیچھے نکل کر کوئی پناہ گاہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا
گاؤں تھا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ مکانوں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ اس قسم کے
دیہات میں جانوروں کو باندھنے کے لئے باڑے ضرور بنے ہوتے ہیں۔ میں اس قسم کی جگہ
کی تلاش میں تھا۔ جیسے ہی میں بیاہ شادی کی تقریب والے مکان کے نزدیک سے گزرا
ایک آدمی اچانک کسی طرف سے نکل کر میرے سامنے آگیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

”مہاراج! ہمارے دھن بھاگ کہ آپ ایسے مہاتما کے درشن ہو گئے۔“

میں ابھی تک سادھوؤں جوگیوں والے حلیے میں ہی تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ اس
آدمی نے اونچی آواز میں جدھر ڈانس ہو رہا تھا ادھر منہ کر کے کہا۔

”ارے گردھر لال! دیکھ مہاتما جی نے پرویش کیا ہے۔ ارے تیرا بیٹا بڑا ہو کر افسر
بنے گا بڑا اچھا شگون ہوا ہے رے۔“

گانے بجانے والی منڈلی سے ایک نوجوان جس نے ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھ
رکھی تھی دوڑتا ہوا آیا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں تمبو کے نیچے لگے بڑے بلب کی کافی
روشنی پڑ رہی تھی۔ نوجوان نے جس کا نام گردھر لال تھا آتے ہی میرے قدموں کو چھوا
اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”مہاراج! میں کتنا سوبھاگی ہوں کہ آپ نے میرے بچے کے جنم دن پر درشن
دیئے۔ مجھے نراش نہ کیجئے گا۔ مجھے سیوا کرنے کا موقع دیں۔“

کچھ اور لوگ بھی آگئے جو اس نوجوان کے دوست اور رشتے دار لگتے تھے۔ ان
نے میرے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اب اگر میں وہاں سے چلا
جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں بابا دنیا داری کے جھمیلوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ پرنتو
مجبور کرتے ہو تو چلے چلتے ہیں۔"

اس دوران گانا بجانا بند ہو گیا۔ وہ لوگ بڑی عزت توقیر کے ساتھ مجھے لے کر گانے
بجانے والی محفل میں لے آئے اور ایک طرف جہاں دری پر سفید چادر بچھی تھی اور
تین گاؤ تکیئے رکھے ہوئے تھے وہاں بٹھا دیا۔ معلوم ہوا کہ گاؤں کے ایک نوجوان گردھر
لال کے ہاں پہلی اولاد ایک لڑکا پیدا ہوا تھا اور اس خوشی میں اس نے شہر سے ایک گا
بجانے والی کو مجرا کرنے کے لئے بلا رکھا تھا۔ محفل میں پندرہ بیس آدمی ہی بیٹھے تھے۔ مجھے
دیکھ کر وہ سب احترام سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سب کو تیز نگاہ
سے دیکھا۔ ان میں کوئی بھی آدمی مجھے اپنے لئے خطرناک دکھائی نہ دیا۔

میں خاموشی سے تکیئے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گردھر لال میرے پاؤں دبا
لگا۔ گانے بجانے والی اپنی جگہ پر اسی طرح درمیان میں بیٹھی تھی۔ ایک ہٹے کٹے موٹے تا
والے آدمی نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑا اور کہا۔

"اری جا کر گورو جی کے چرن چھو"

میں نے محسوس کیا کہ طوائف مجبوراً اٹھی اور پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھرو چھنا
میرے قریب آئی۔ جھک کر اس نے میرے قدموں کو بڑی بے دلی سے ہاتھ لگایا اور
دوسری طرف موڑ کر واپس چلی گئی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ کیونکہ ہندو عورتیں اور خا
طور پر ہندو طوائف عورتیں جوگی سنیاسیوں کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ یہ بات ہندوستان
اتنی دیر سے رہتے ہوئے کئی بار میرے مشاہدے میں آچکی تھی۔ مگر اس طوائف نے
سادھو جوگی کو دیکھ کر کسی قسم کی عقیدت مندی اور گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔
دوران میں طوائف کا بھرپور جائزہ لے چکا تھا۔

اس کی عمر چوبیس پچیس سال کی ہوگی۔ رنگ گورا تھا۔ نقش بڑے تیکھے اور آنکھیں
خاص طور پر بڑی خوبصورت تھیں۔ اس نے بڑی قیمتی نیلے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی
تھی جس پر چاندی کے تاروں سے بنے ہوئے پھول بلب کی روشنی میں ستاروں کی طرح
چمک رہے تھے۔ اس نے سونے کا زیور بھی کافی پہنا ہوا تھا۔ جس موٹے آدمی نے اسے
میری طرف بھیجا تھا وہ خود بھی میرے قریب آیا۔ میرے قدموں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر
بولا۔

"مہاراج! گوری بائی بڑی ضدی ہے۔ اس کو معاف کر دیجئے گا۔ ہم تو آپ کے
سیوک ہیں مہاراج"

گوری بائی اس نوجوان طوائف کا نام تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آشیرباد دینے کے انداز
میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بچہ! جوگی سنیاسی کسی سے ناراض نہیں ہوا کرتے۔"

طوائف نے مجرا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ٹھمری گا رہی تھی۔ میری ٹھمری کی طرف
الکل توجہ نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں رات گزاری جا سکتی ہے۔ یہ
سارے بے ضرر سے آدمی لگ رہے تھے۔ اتنے میں انہوں نے میرے سامنے پوریوں
کچوریوں اور مٹھائیوں سے بھرا ہوا تھال اور پانی کا جگ لا کر رکھ دیا۔ یہ مسلمانوں والی
خوراک نہیں تھی۔ ہم مسلمان تو پلاؤ' چاول روٹی اور گوشت والا سالن کھانے کے عادی
ہیں مگر اتنی دیر سے ہندوؤں کے ملک میں رہتے رہتے مجھے اس قسم کے کھانوں کی عادت
ہو گئی تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے سیر ہو کر پوریاں کچوریاں کھائیں۔
گردھر لال نے بڑی عقیدت سے مجھے عمدہ قسم کا سگریٹ پیش کیا۔ میں نے سگریٹ بھی لگا
لیا۔ جوگی سنیاسی ہندوستان میں سگریٹ وغیرہ عام پی لیا کرتے ہیں وہ تو سب کے سامنے
سلفے کے بھی لمبے لمبے کش لگاتے ہیں۔ میں مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور اب طوائف
کے گانے کی طرف بھی دھیان دیا۔ ٹھمری گاتے ہوئے وہ ساتھ اٹھ کر رقص بھی کرنے
لگی تھی۔ لوگ اس پر پیسے اور نوٹ لٹا رہے تھے جنہیں وہی موٹا آدمی جو طوائف کا مالک

لگتا تھا جلدی جلدی اٹھا کر ایک تھیلی میں ڈالے جاتا تھا۔

اتنے میں وہاں ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

طوائف گاتے گاتے ایک آدمی کے ہاتھ سے روپے کا نوٹ لینے اس کے پاس گئی اس آدمی نے طوائف کی چٹکی لی۔ طوائف نے ہائے اللہ کہہ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا اس کے مالک موٹے آدمی نے غصے کے ساتھ کہا۔

"ہائے اللہ کیوں کہتی ہے ری ہائے رام کہا کر"

طوائف نے بھی غصے میں جواب دیا۔

"نہیں کہوں گی ہائے رام۔ ہائے اللہ ہی کہوں گی"

موٹے آدمی نے اٹھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ طوائف رونے لگی اور بے اختیار ہو کر ہاتھ اوپر اٹھا کر بولی۔

"اے اللہ! مجھے ان ظالموں سے بچا لے"

موٹے آدمی نے طوائف کو بازو سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا اور گالی دے کر کہا۔

"بک بک بند کر اور ناچ دکھا۔ چل ناچ"

وہ تالی بجانے لگا اور طبلے والے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"چلو استاد جی۔ تم کیوں ڈھیلے پڑ گئے ہو۔"

طبلہ زور زور سے بجنے لگا۔ ہارمونیم کی لے بھی تیز ہو گئی۔ طوائف نے بھی ناچنا شروع کر دیا۔ مگر اس کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ بادل نخواستہ ناچ رہی ہے۔ میں اس کی طرف اب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ یہ طوائف مسلمان ہے۔ ہندو نہیں ہے اور اسے زبردستی نچوایا جا رہا ہے۔ چونکہ میں بھی مسلمان تھا اس لئے قدرتی طور پر مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی مگر میں اس کی کوئی خاص مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود اپنے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ اس عورت کا پتہ کرنا چاہیے کہ اگر یہ مسلمان ہے اور طوائف نہیں ہے تو اس پیشے میں کیسے آ گئی ہے۔

آدھی رات تک مجرا جاری رہا۔ جب مجرا ختم ہو گیا تو میرے عقیدت مند میزبان گردھر لال نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اگر آپ رات یہاں بسرام کرنا چاہتے ہیں تو یہ ہمارے بڑے بھاگ ہوں گے آپ کے لئے میں نے چوبارے میں بستر لگوا دیا ہے۔"

میں نے گردھر لال سے پوچھا۔

"یہ گانے والی یہیں رہے گی یا واپس شہر چلی جائے گی؟"

گردھر لال نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ بولا۔

"مہاراج! آپ کی اچھیا ہو تو آپ حکم کریں وہ رات یہیں رہ لے گی۔ یہ لوگ میرے غلام ہیں۔ اگر انہیں واپس جانا بھی ہوا تو نہیں جائیں گے۔"

میں نے مہاتما لوگوں کی طرح ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا

"گردھر لال! ہمیں اس نرتکی عورت میں آکاش کی نرتکیوں کا روپ نظر آتا ہے۔ ہم اسے کچھ اپدیش دینا چاہتے ہیں۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے ہمارے پاس بھیج دینا۔ ہم تیرے پتر کے واسطے بھگوان شیو سے خاص پرارتھنا کریں گے۔"

گردھر لال اپنے بیٹے کے حق میں بھگوان شیو کے آگے پرارتھنا کا بن کر بہت خوش ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج آپ اپنے کمرے میں پدھاریں۔ میں نرتکی کو لے کر آپ کے پاس آتا ہوں"

اس نے مجھے اپنے ملازم کے ساتھ کر دیا۔ گردھر لال کا چوبارا گاؤں میں پکا چوبارا تھا۔ اوپر والی منزل میں ایک چھوٹے سے کمرے میں میرے لئے پہلے سے بستر لگوا دیا گیا تھا۔ میں بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا ہے اور ظاہر ہے میری منزل دلی تھی مگر ٹرین کا راستہ اب میرے لئے محفوظ نہیں رہا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کیا کہ گردھر لال کے تعاون سے میں کسی ٹرک وغیرہ میں بیٹھ کر آگے گوالیار آگرہ تک جانے کی کوشش کروں گا۔ اتنے میں گردھر لال طوائف کو لے کر آ گیا۔

طوائف کے خوبصورت چہرے پر سخت ناراضگی کے اثرات تھے۔ کمرے میں بلب جل رہا تھا۔ جس چارپائی کے بستر پر میں نیم دراز تھا اس کے پاس ہی لوہے کی دو کرسیاں اور چھوٹی سی تپائی پڑی تھی۔

گردھرلال ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ کی داسی حاضر ہے۔"

اتنا کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ طوائف وہیں دروازے کے پاس کھڑی مجھے نفرت انگیز آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس سے کسی قسم کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ میں تو صرف اس سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اگر وہ مسلمان عورت ہے اور اس پیشے کو پسند بھی نہیں کرتی تو پھر وہ ان کنجر قسم کے لوگوں کے ساتھ کیوں رہ رہی ہے۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

طوائف وہیں کھڑی رہی۔ جب میں نے اسے زبان سے کہا کہ بیٹھ جاؤ نرتکی تو وہ غصے میں آکر بولی۔

"تم مہاتما ہو گے اپنے گھر پر ہو گے یا ان ہندوؤں کے لئے ہو گے۔ میں تمہیں کچھ نہیں سمجھتی۔ میں تم سے بالکل نہیں ڈرتی۔ مجھے معلوم ہے تم نے مجھے یہاں کس لئے بلایا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ میں مسلمان ہوں۔ سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے نہیں ڈرتی۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی"

طوائف کا اردو بولنے کا لہجہ پنجابی تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ پنجابی لڑکی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایک مسلمان پنجابی لڑکی یا طوائف ان لوگوں کے پاس اتنی دور کیسے آگئی؟ کیونکہ مشرقی پنجاب میں تو ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک بھی پنجابی خاندان پیچھے نہیں رہا تھا۔ یا تو وہ لوگ قافلوں کی شکل میں سارے کے سارے پاکستان کی جانب ہجرت کر گئے تھے یا سکھوں ہندوؤں نے انہیں ان کے گھروں یا کھیتوں یا ریلوے سٹیشنوں پر بال بچوں سمیت شہید کر دیا تھا۔ میں نے طوائف کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نرتکی! ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے"

اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"تو پھر مجھے یہاں کس لئے بلایا ہے تم نے؟ میں جاتی ہوں"

جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر کہا۔

"ٹھہرو نرتکی! اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ میں نے تمہیں اس گناہ کی دلدل سے نکالنے کے لئے بلایا ہے تو کیا تم میرے ساتھ چلی چلو گی؟"

طوائف لڑکی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور نفرت سے کہا۔

"تم ہندو ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ تم مجھے یہاں سے کیوں نکالو گے؟ ایسا فریب میں کئی بار پہلے بھی کھا چکی ہوں لیکن گناہ کی ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں گرا دی گئی۔"

میں نے اسے اپنے رویے کو مشفقانہ بناتے ہوئے مزید نرم لہجے میں کہا۔

"گوری بائی! میں تمہیں اس گندی نالی سے اس لئے نکالنا چاہتا ہوں کہ جب موٹے ہندو دلال نے تمہیں مارا تھا تو تم نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ مجھے اس جہنم کی زندگی سے بچا لے۔"

طوائف لڑکی نے طنزاً کہا۔

"تمہیں آخر مجھ سے کس لئے ہمدردی ہے مہاتما جی؟ کیا میں تمہاری خالہ لگتی ہوں؟ کیا تم مسلمان ہو؟"

میں نے تھوڑا مسکرا کر کہا۔

"نرتکی اگر فرض کر لو کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کے ناطے تمہیں کافروں کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا ہوں تو کیا پھر بھی تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گی؟"

طوائف لڑکی میرے پاس آئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اگر تم مسلمان ہو تو تم نے یہ ہندو سادھوؤں والا ڈھونگ کیوں رچا رکھا ہے؟"

میں نے اسے جواب دیا۔

"اس کی بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔"

وہ بولی۔

"اگر تم مسلمان ہو تو کلمہ شریف پڑھ کر سناؤ"۔

اصل میں جس وقت مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ لڑکی مسلمان ہے اور نہ جانے کن اذیت ناک حالات کی وجہ سے اسے ہندوؤں نے پکڑ کر اس دھندے میں ڈال دیا ہے اس وقت سے میرے دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کافروں کے جال سے نکال کر ہندوستان کے کسی شہر کے مسلمانوں کے رفاہی ادارے کے حوالے کر دوں۔ میں نے اسے کلمہ شریف پڑھ کر سنایا تو اس نے سر جھکا لیا اور بڑے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بولی۔

"مگر کلمہ شریف تو ایک ہندو بھی اسے یاد کر کے پڑھ سکتا ہے۔ ایک کافر نے مجھے اسی طرح دھوکا دیا تھا۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہیں ان ظالم کافروں سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور وہ کیا حالات تھے جنہوں نے تمہیں گناہ کے اس مقام تک پہنچایا۔"

چونکہ میری نیت خراب نہیں تھی اس لئے میں نے دروازے کو اندر سے نہیں لگائی تھی۔ طوائف لڑکی آنچل سے آنسو پونچھ کر اپنی داستان حیات شروع کرنے والی تھی کہ دروازہ دھڑاک سے کھلا اور اس کا موٹا ہندو ایجنٹ اس حالت میں اندر آیا اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اپنے کاندھے سے بند کیا اور مجھے گالی دے بولا۔

"او ڈھونگی مہاتما تو ہماری عورت کو یہاں سے بھگا کر لے جانا چاہتا ہے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا"

اور اس نے مجھ پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ یہ اس موٹے ہندو کی سخت غلطی اور

بدقسمتی تھی کہ اس نے مجھ پر خنجر سے وار کر دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے جس آدمی پر وار کیا ہے وہ ایک انتہائی تربیت یافتہ صف اول کا کمانڈو ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہ جرات کبھی نہ کرتا۔ لیکن جب کسی کی موت آئی ہوئی ہو تو کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ میرے بازو یا ٹانگوں پر خنجر کا وار کرتا تو بھی میں اسے کچھ نہ کہتا۔ بس صرف اسے کسی طرح بے ہوش کر کے وہیں ڈال دیتا۔ لیکن اس نے خنجر کا وار سیدھا میری گردن پر کیا اور میری گردن کاٹنے کی کوشش کی۔ وہ موٹا تازہ ہٹا کٹا تھا۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو ایک بار تو اس نے میری گردن میں خنجر اتار دیا تھا۔ لیکن یاد رکھیں ایک تربیت یافتہ مسلمان کمانڈو سوتے ہوئے بھی غافل نہیں ہوتا۔

جیسے ہی اس کا خنجر والا ہاتھ میری گردن کے پاس آیا اور وہ مجھ پر گرا میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا اور اس کے خنجر والے بازو کو نیچے سے ہاتھ مار کر اوپر کو اچھالا اور اپنے دائیں بازو کو کہنی تک اس کے حلق کے اوپر رکھ کر اتنی زور سے نیچے کو جھٹکا دیا کہ اس کا نرخرہ اس کی گردن کے پیچھے ریڑھ کی ہڈی کے جوڑوں میں جا کر پھنس گیا۔

یہ ایسا کاری وار تھا کہ اسے کوئی بھینسا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ میں نے کبھی کسی انسان کے منہ سے پہلے ایسی آواز نہیں سنی تھی اور وہ پچھاڑ کھا کر وہیں چارپائی کے پاس فرش پر بے جان ہو کر گر گیا۔ طوائف لڑکی تڑپ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی اور اب سہمی ہوئی اور دہشت زدہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی فرش پر پڑی اپنے ہندو دلال کی بے جان لاش کو دیکھ رہی تھی۔ اب میرا اور اس مسلمان طوائف لڑکی دونوں کا وہاں ٹھہرنا پھانسی کے پھندے کو اپنے گلے میں ڈالنے کے برابر تھا۔ پھر بھی میں اس لڑکی کی مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے اسے کہا۔

"میں یہاں سے فرار ہو رہا ہوں۔ کیا تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟"

طوائف لڑکی میری بہادری سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم سچ مچ مسلمان ہو تو مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جانا۔ یہ لوگ جگو کی لاش دیکھ کر

مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

معلوم ہوا کہ اس موٹے دلال کا نام جگ دیال تھا۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی تو
جو بند تھی۔ میں نے اسے کھول کر نیچے دیکھا۔ باہر تنگ سی گلی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔
دلال کی موت اسے اکیلا ہی وہاں لے آئی تھی۔ میں نے چارپائی پر بچھی ہوئی نیلے رنگ کی
کھدر کی چادر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے اپنی چمکیلی ساڑھی اتار کر یہ چادر لپیٹ لو۔ جلدی کرو۔ اس ساڑھی کی
چمک لوگ اندھیرے میں بھی دیکھ لیں گے۔"

میں نے چادر لڑکی کے کاندھے پر پھینک کر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ اس
کمرے کے آگے کوئی دو تین فٹ کی گیلری تھی جو آگے سیڑھیوں کے دروازے تک جاتی
تھی۔ یہ سیڑھیاں نیچے پہلی منزل کی ڈیوڑھی میں اترتی تھی۔ یہ طوائف لڑکی جب
گردھر لال کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرنے آئی تھی تو اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بدکردار
جوگی کے پاس رات بسر کرنے آرہی ہے چنانچہ وہ سوائے کانوں کے سونے کے کانٹوں کے
باقی سارا زیور اتار کر رکھ آئی تھی۔ گردھر لال نے نہ جانے کیوں طوائف لڑکی کے دلال
جگو کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے یقین ہو کہ جگو لڑکی کو میرے پاس اکیلا
بھیجنے پر تیار نہیں ہو گا اور اگر تیار ہو گا تو بھاری رقم طلب کرے گا۔ دلال کی موت اسے
کھینچ کر لے آئی تھی۔

میں نے دروازہ بند کر کے پلٹ کر دیکھا۔ کمرے میں جلتے بجلی کے بلب کی روشنی میں
طوائف لڑکی منہ دیوار کی طرف کئے ساڑھی اتار رہی تھی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"جلدی کرو۔ دیر کیوں کر رہی ہو۔ کوئی آگیا تو تم یہیں رہ جاؤ گی"

لڑکی نے ساڑھی اتار کر کونے میں پھینکی۔ اس نے نیچے نیلے رنگ کا لہنگا سا باندھ
رکھا تھا۔ اسی رنگ کی اوپر شمیض تھی۔ وہ جلدی سے چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر
دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کے بازو کو مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے اس سے
پوچھا۔

"کیا میرے ساتھ جنگل میں دوڑ سکو گی؟"

طوائف لڑکی نے کہا۔

"میں اس جہنم سے نکلنے کے لئے ساتویں منزل سے بھی کود سکتی ہوں۔"

ہم جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر چھوٹی سی گلی میں آگئے۔ یہاں سے میں جنگل کی
طرف رخ کرنے لگا تو لڑکی نے کہا۔

"ادھر کیوں جاتے ہو؟ اس طرف آؤ میرے ساتھ"

وہ اس شہر بھوپال سے اچھی طرح واقف تھی۔ میں اس کے پیچھے ہو گیا۔ پھر اس کے
آگے آکر کہا۔

"ادھر تو شہر ہے۔"

شہر کی جانب جاتے ہوئے مجھے اپنا خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں میں پولیس کے ہتھے نہ
چڑھ جاؤں۔ اس نے کہا۔

"ہم شہر میں نہیں جائیں گے۔"

"کوئی ایسا راستہ اختیار کرو جو ہمیں بھوپال سے باہر نکال کر لے جائے۔ میں دلی کی طرف
جانا چاہتا ہوں"

وہ مجھ سے ایک قدم آگے چل رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"پہلے بھوپال سے تو نکلیں مہاتما جی"

میں نے اسے کہا۔

"کیا تم سٹیشن پر جانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔

"تم دیکھتے چلو۔ فکر نہ کرو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گی"

میں نے کہا۔

"میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔ میں تو صرف تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں"

لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"تمہاری شکر گزار ہوں مہاراج! پتہ نہیں تمہیں شکر گزار کے معنی بھی آتے ہیں نہیں"

میں خاموش رہا۔ ہم شہر کی ایک باہر کی آبادی کے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے یہاں اندھیرا تھا۔ ایک طرف مکان تھے دوسری طرف اندھیرے میں دور تک کھیت کھیت تھے یا گھاس کا میدان تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم ایک جگہ چھوٹا سا کوئی پل عبور کیا۔ دوسری جانب مکان شروع ہو جاتے تھے جس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کہیں روشنی نظر آتی تھی۔ ہم ایک چھوٹے سے بازار میں آ گئے۔ کوئی دیہاتی بازار لگتا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ لڑکی نے مجھے ایک جگہ کھڑا کیا اور خود ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئی۔ میں سوچنے لگا یہ کہاں گئی ہو گی۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔ کہنے لگی۔

"میں گھر سے کچھ کپڑے اور پیسے لے آئی ہوں"

معلوم ہوا کہ اس کا مکان اسی گلی میں تھا۔ اب ہم شہر کے باہر سے گزرنے والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں ایک سینما گھر تھا جس کے باہر روشنی میں جو فلم چل رہی تھی اس کے بڑے بڑے بورڈ لگے تھے۔ ایک جانب کچھ خالی رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہاؤس میں سیکنڈ شو چل رہا تھا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر ایک خالی رکشا لیا۔ یہ موٹر رکشا تھا رکشا میرے قریب لا کر بولی۔

"مہاراج آ جائیں"

میں رکشے میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ رکشہ بھوپال کے مختلف بازاروں میں گزرنے لگا۔ میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ کچھ دیر کے ہمارے سامنے بھوپال کا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں جلدی سے نیچے اتر آیا۔ لڑکی نے رکشے والے کو پیسے دیئے اور ہم سٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھے۔ اب مجھے یہ فکر لگی تھی کہیں یہاں کوئی پولیس والا نہ مجھے پہچان لے۔ لیکن خیریت گزری ہم ٹکٹ والی کھڑکی پاس آ گئے۔ لڑکی نے آگرہ کے دو ٹکٹ لئے۔ اور مجھے ساتھ لے کر پلیٹ فارم کی طرف

بڑھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"گاڑی کب جائے گی؟"

اس کی کلائی پر زنانہ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"بس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائے گی یہ گاڑی پیچھے بمبئی سے آ رہی ہے"

جب وہ مجھے ساتھ لے کر گردھر لال کے مکان سے نکلی تھی تو اسے معلوم تھا کہ ایک گاڑی رات کے سوا دس بجے کے قریب بھوپال سے دلی کی طرف جاتی ہے۔ میں جوگیوں والے حلیے میں تھا۔ لڑکی نے نیلی چادر بدن کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ چادر ذرا سی ایک طرف ہٹی تو میں نے دیکھا کہ اس کے نیچے اسی رنگ کی سوتی ساڑھی تھی۔ گھر میں اس نے چادر کے نیچے اسی رنگ کی عام سی ساڑھی پہن لی تھی۔

ہم پلیٹ فارم پر آ کر کافی آگے جا کر ریلوے کے پڑے ہوئے سامان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں آگرہ پہنچا کر وہاں سے آگے دلی چلا جاؤں گا۔"

اس نے نیلی چادر سے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ موسم رات کو سرد ہو جاتا تھا۔ اوپر دلی آگرہ کے علاقے سے سردی شروع ہو جاتی تھی۔ اس کا گورا چہرہ چادر کے درمیان میں سے چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس قسم کے گناہ آلود ماحول میں رہ کر بھی قدرتی حسن برقرار تھا۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر تم مجھے میرے گھر پہنچا کر واپس جاؤ گے"

میں نے پوچھا۔

"کیا آگرہ میں بھی تمہارا کوئی گھر ہے؟"

اس نے کہا۔

"نہیں۔ آگرہ سے تھوڑی دور ایک جگہ ٹنڈلہ ہے وہاں میری ایک جگری سہیلی رہتی ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ میں اس کے پاس کچھ دن ٹھہروں گی۔ پھر جہاں قسمت لے جائے گی چلی جاؤں گی۔"

وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو نرتکی؟"

وہ بولی۔

"اب مجھے یقین آگیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ جس بہادری سے تم نے جگو کو ہلاک کیا ہے وہ ایک مسلمان ہی کر سکتا تھا۔ لیکن مہاراج تم نے یہ ہندو جوگیوں والا حلیہ کس لئے بنا رکھا ہے؟ کیا تم لوگوں کو فریب دیتے پھرتے ہو جس طرح دوسرے سادھو کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ حلیہ میں نے محض شوق کی خاطر بنایا ہوا ہے"

"میں اسے نہیں مانتی۔"

وہ بولی۔

"تم ضرور کوئی پراسرار آدمی ہو۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر موقع ملا تو ضرور بتا دوں گا۔"

میں نے جو سادھوؤں والے کپڑے پہن رکھے تھے اس کی طرف سے مجھے خطرہ لگا کہ کہیں پولیس کا کوئی سپاہی مجھے پہچان نہ لے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم ایسا کرو۔ یہ اپنی نیلی چادر مجھے دے دو۔ تم نے تو نیچے ساڑھی پہن ہی رکھی ہے"

لڑکی نے جلدی سے چادر اتار کر مجھے دے دی۔ میں نے چادر کو اس طرح اپنے لپیٹ لیا کہ میرے گیروے رنگ کے جوگیوں والے کپڑے بہت کم دکھائی دیں۔

اتنے میں ٹرین آگئی۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ ڈبے میں مرد عورتیں اکھٹے تھے۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ بھوپال سے آگرہ کا سفر کافی طویل سفر ہے۔ لڑکی نے اوپر

پر سونے کے لئے جگہ بنالی اور اوپر چڑھ کر لیٹ گئی۔ میں چادر کی بکل مارے سیٹ پر ہی بیٹھا رہا۔ میں نیند پر قابو پا سکتا تھا۔ ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ میں جب جی چاہتا بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ جب ضرورت محسوس کرتا جاگ پڑتا۔ جھانسی کا سٹیشن دوسرے دن آیا۔ ہم دونوں سٹیشن پر بالکل نہ اترے۔ ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ لڑکی جس کو دلال جگو گوری بائی کے نام سے پکارتا تھا اس کا اصلی نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ مجھے اس کا نام معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو اسے محفوظ ہاتھوں تک پہنچا کر اس سے الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے آگے دلی اور اپنے ماسٹر سپائی گل خان سے جا کر ملنا تھا۔ جھانسی کے بعد گوالیار آیا اور پھر دوسرے دن رات کو ٹرین آگرہ پہنچ گئی۔ سٹیشن سے ہم منہ سر لپیٹ کر نکل گئے۔ لڑکی نے سٹیشن کے باہر آکر کہا۔

"ٹنڈلہ جانے والی ٹرین رات کو نہیں ملے گی۔ ہم لاری اڈے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے ٹنڈلہ کے لئے لاریاں آدھی رات تک چلتی رہتی ہیں۔"

وہ آگرہ شہر سے بھی بخوبی واقف تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس شہر کے بازار حسن میں بھی رہ چکی تھی۔ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی جس نے ہمیں لاری اڈے پہنچایا۔ آگرہ میں سردی تھی۔ میں نے چادر لڑکی کو دینی چاہی۔ اس نے نہ لی اور کہا۔

"میرے پاس اٹیچی کیس میں ایک گرم چادر ہے"

اور اس نے اٹیچی کیس کھول کر نسواری رنگ کی گرم چادر نکال کر اوڑھ لی۔ لاری اڈے سے ہمیں آسانی سے ٹنڈلہ جانے والی بس مل گئی جس نے کوئی گھنٹے سوا گھنٹے میں ہمیں ٹنڈلہ پہنچا دیا۔ یہ اس زمانے میں چھوٹا سا شہر تھا۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ایک تانگے میں بیٹھ گئے لڑکی نے کسی محلے کا نام لیا جو اب مجھے بھول گیا ہے اور تانگہ اس محلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ محلہ شہر کے کونے میں تھا۔ ایک گلی تھی۔ لڑکی ایک معمولی سے مکان کے آگے جا کر رک گئی۔ اس نے بند دروازہ پر آہستہ سے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد مکان کے اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھول کر کسی عورت نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

لڑکی نے اوپر دیکھ کر کہا۔

"اماں بی! میں ہوں رضوانہ"

کھڑکی میں جو عورت جھانک رہی تھی اس نے کہا۔

"اچھا بیٹی ٹھہرو۔"

کھڑکی بند ہو گئی۔ آواز کسی بوڑھی عورت کی تھی۔ اس کے کوئی ایک منٹ بعد ا نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا اور وہ "رضوانہ تم اس وقت کیسے" کہہ کر اس کے گلے ل گئی۔ پھر میری طرف ایک نظر دیکھا اور ہمیں اوپر لے گئی۔ ایک معمولی سا کمرہ تھا۔ ب سردی تھی مگر کمرہ نیم گرم تھا۔ آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں جن پر بستر اور کم پڑے تھے۔ جس عورت نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا وہ بوڑھی عورت بھی چار پر کمبل اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس نے رضوانہ کی بلائیں لے کر کہا۔

"بیٹی خیریت تو ہے۔ اس وقت اچانک تم کیسے آ گئیں؟"

رضوانہ نے کہا۔ (اب مجھے اس طوائف لڑکی کا چونکہ نام معلوم ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے رضوانہ ہی لکھوں گا)"

"اماں بی! بس اچانک آپ لوگوں سے ملنے کو جی چاہا اور آ گئی۔"

اس عورت نے میری طرف اور خاص طور پر میرے گیروے کپڑوں کی طرف د اور پوچھا۔

"یہ سادھو جی کون ہیں بیٹی؟"

رضوانہ نے کہا۔

"یہ بڑے پہنچے ہوئے سادھو ہیں اماں دلی جا رہے تھے۔ میں اکیلی تھی۔ میں انہیں کہا مجھے ٹنڈلہ چھوڑتے جائیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں"

میرے لئے اوپر والی کوٹھڑی میں بستر لگا دیا گیا۔ رضوانہ میرے لئے چائے اور کھانے کو لے کر آئی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ لیکن یہ معمہ ابھی حل نہیں ہوا کہ تم نے یہ بہروپ کس لئے بنا رکھا ہے۔ کیا تم اس راز کو نہیں کھولو گے؟"

میں ہنس پڑا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم اس برے دھندے میں کیسے آئیں۔"

رضوانہ نے ایک ثانیہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ ماضی کے زمانے میں کھو گئی ہو۔ یہ میں آپ کو ایک بار پھر بتاتا چلوں کہ جس زمانے میں میں انڈیا میں داخل ہوا تھا اس وقت پاکستان کو قائم ہوئے بارہ تیرہ برس بیت چکے تھے۔ رضوانہ نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور شکستہ سی آواز میں کہا۔

"ہمارا گھر لدھیانہ شہر کے باہر ایک بستی میں تھا۔ میرا باپ محکمہ نہر میں ہیڈ کلرک تھا۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی جب پاکستان قائم ہونے کا اعلان ہوا۔ میرے دو بڑے بھائی اور ایک بڑی بہن تھی۔ مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں کی طرح لدھیانہ میں بھی مسلمانوں نے ڈٹ کر ہندو سکھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن 14 اگست کے بعد جب ڈوگرہ اور گورکھا فوج بھی ہندو سکھوں کے ساتھ شامل ہو گئی تو لدھیانہ کے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شہر میں مسلمانوں کے گھروں پر سکھوں ہندوؤں نے حملے شروع کر دیئے لوگ گھروں سے نکل کر قافلے کی شکل میں پاکستان کی طرف چل پڑے۔ ہم بھی پاکستان کی طرف نکل جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک سکھوں کے ایک جتھے نے ہماری بستی پر حملہ کر دیا۔ دس بارہ سکھ تلواریں کرپانیں لہراتے ہمارے گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے میرے والد کو تلواریں مار مار کر شہید کر دیا۔ میری ماں انہیں بچانے کے لئے روتی ہوئی آگے آئی تو اسے بھی ظالموں نے مار ڈالا۔ میرے بھائیوں نے ڈنڈوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ دو سکھوں نے میری بڑی بہن کو اٹھا لیا اور لے گئے۔ ایک سکھ مجھے اٹھا کر لے گیا۔"

رضوانہ نے سرد آہ بھری اور بولی۔

"اس کے بعد میری دکھوں' عذابوں' اذیتوں اور گناہوں سے بھری ہوئی زندگی آغاز ہو گیا۔ اگر اسلام میں خود کشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کی مر چکی ہوتی۔ میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مسلسل چلی گئی اور آج اس مقام پر پہنچ چکی ہوں جہاں تم مجھے دیکھ رہے ہو"

رضوانہ کی اندوہناک آپ بیتی قیام پاکستان کے وقت ہندو سکھوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والی ہزاروں مسلمان عورتوں کی دردناک آپ بیتی تھی۔ میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میری چھوٹی بہن کلثوم شہید نہ ہوتی اور اغوا ہو جاتی تو اس کا انجام بھی شاید ایسا ہی ہوتا۔ میں نے رضوانہ سے کہا۔

"اب جب کہ تم گناہ کے جہنم سے نکل آئی ہو۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم کسی طرح کوشش کر کے پاکستان چلی جاؤ۔"

رضوانہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے میرے ایک قاتل کو ہلاک کر دیا ہے۔ ابھی میرے تین قاتل زندہ ہیں۔ جب تک میں اپنے ہاتھوں ان کا خون نہیں کر لوں گی پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

میں خاموش رہا۔ رضوانہ کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں اپنی زندگی کی داستان سنا دی ہے۔ اب تم اس راز پر سے پردہ ہٹاؤ کہ تم اصل میں کون ہو اور مسلمان ہو کر سادھو کے بھیس میں کس لئے پھر رہے ہو؟"

اس لڑکی رضوانہ کو اپنے بارے میں اصلیت بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر اسے اپنے بارے میں حقیقت بیان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اسے یونہی ایک فرضی کہانی جوڑ کر سنا دی کہ میرا ایک بہت پیارا مسلمان دوست گم ہو گیا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اسے ہندو سادھو اغوا کر کے گجرات کاٹھیا واڑ کی طرف لے گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ہندو سادھو بن کر اپنے دوست کو تلاش کروں۔

"بس یہ ہے میرے سادھو بننے کا راز"

رضوانہ جانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

"میں صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو۔ کیا صبح کے وقت آگرہ سے دلی کی طرف کوئی گاڑی جاتی ہے؟"

رضوانہ نے کہا۔

"صبح کے وقت ایک دو ایکسپریس ٹرینیں بمبئی کی طرف سے ضرور آتی ہیں۔ یہ تو تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو گا۔"

میں اپنے سادھوؤں والے لباس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رضوانہ سے کہا۔

"اب میں چونکہ واپس دلی جا رہا ہوں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مجھے سادھوؤں کے حلیے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیا یہاں سے مجھے دوسرے کپڑے مل سکتے ہیں؟"

رضوانہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میری سہیلی کا بھائی آگرہ کے کسی کارخانے میں ملازم ہے۔ وہ ہفتے میں ایک بار گھر آتا ہے۔ اس کے کپڑے ضرور صندوق میں پڑے ہوں گے۔ میں اذان کے وقت آؤں گی تو مردانہ کپڑے ساتھ لیتی آؤں گی۔"

وہ سلام کر کے چلی گئی۔ میں اس لڑکی کی زندگی پر سوائے افسوس کرنے اور دل میں دکھ محسوس کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کو احساس ہونا چاہئے کہ پاکستان کتنی بڑی قربانیاں دے کر قائم ہوا ہے اور اس کا وجود کس قدر ضروری اور قیمتی ہے۔ میری کمر کے ساتھ ٹائم بم جو چیونگ گم کی ٹیبلٹ کی شکل میں تھے رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ چھ دھماکہ خیز بم تھے۔ میں نے انہیں کمر کے ساتھ ہی بندھے رہنے دیا اور بتی بجھا کر بستر میں گھس گیا۔ مجھے چندریکا اور مینا کشی کا خیال آنے لگا۔ میں نے دونوں کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا اور پھر مجھے نیند آ گئی۔

صبح کی اذان کے وقت رضوانہ نے آکر مجھے جگایا۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ میرے لئے ایک پرانی پتلون۔ ایک پرانی قمیض جیکٹ اور بوٹ لے کر آئی تھی۔ یہ سارے کپڑے وغیرہ اس کی سہیلی کے بھائی کے تھے۔ کہنے لگی۔

"تم کپڑے تبدیل کر لو۔ میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں"

اس کے جانے کے بعد میں نے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ بہت غنیمت تھے۔ اس کی سہیلی کا بھائی میرے قد کاٹھ کا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے پتلون پوری آگئی۔ جیکٹ بھی پوری آگئی۔ سب سے زیادہ فکر مجھے جوتوں کی تھی کہ اگر وہ تنگ یا کھلے ہوئے تو میں انہیں نہیں پہن سکوں گا۔ لیکن جرابیں پہن کر وہ بھی پورے آگئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ سادھوؤں والے کپڑوں میں میرے پکڑے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ ظاہر ہے احمد آباد پولیس اور سیکرٹ سروس والوں نے احمد آباد سے لے کر جھانسی بھوپال گوالیار آگرہ بلکہ دلی تک کی پولیس کو میرا حلیہ بتا کر انہیں الرٹ کر دیا ہو گا۔ میرے بال بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ اسی وضع قطع میں تھے جیسے کیپٹن ہری ناتھ کو ہلاک کرتے اور دوار کا فورٹ کو تباہ کرتے وقت تھے۔ مجھے احمد آباد کی سیکرٹ پولیس نے اسی وضع قطع کے بالوں میں دیکھا تھا۔ بالوں کو ایک ہی دن میں لمبے کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

میں نے کمر کے گرد بندھا ہوا ٹائم بموں والا رومال کھول کر چھ کے چھ ٹیبلٹ بم سامنے رکھ لئے۔ یہ ٹائم بم انتہائی دھماکہ خیز تھے۔ ایسے ہی تو بم تھے جنہوں نے دوار کا

فورٹ کے اتنے بڑے ایمونیشن ڈمپ کو اڑا کر راکھ کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ ان بموں کو کمر کے ساتھ باندھنے کی بجائے مجھے کسی ڈبی میں ڈال کر جیب میں رکھ لینا چاہئے۔ اگر آگرہ سے دلی جاتے ہوئے راستے میں میں پکڑا گیا تو میری کمر کے گرد بندھی ہوئی چیونگ گم کی ٹیبلٹ کو دیکھ کر پولیس کو ضرور شک پڑ جائے گا اور جب انہوں نے لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیونگ گم نہیں بلکہ انتہائی دھماکہ خیز مواد کی چوکور گولیاں ہیں۔ اس طرح میرے غیر ملکی جاسوس یا کشمیری کمانڈو ہونے کا انہیں واضح ثبوت مل جائے گا۔ یہ ٹائم بم دیکھنے میں بالکل چیونگ گم لگتے تھے۔ وہی سائز اور وہی رنگ ہم نے انہیں دیا ہوا تھا۔ میرے پاس کوئی ڈبی نہیں تھی۔

رضوانہ چائے لے کر آگئی۔ اس نے میرے سامنے چیونگ گم کی گولیاں دیکھ کر پوچھا۔

"تم چیونگ گم بھی کھاتے ہو کیا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"کھاتا نہیں چباتا ہوں"

رضوانہ نے ایک گولی اٹھائی اور منہ میں ڈالنے لگی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھماکہ خیز ٹائم بم جس کو وہ چیونگ گم سمجھ رہی تھی اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ کا اظہار کیا تھا کہ رضوانہ حیران ہو کر بولی۔

"کیا اس میں زہر تھا؟"

میں نے کہا۔

"یونہی سمجھ لو"

میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے چھوٹی سی کوئی ڈبی لا دے۔ وہ نیچے گئی اور ٹین کی چھوٹی چوکور ڈبی لے آئی۔ میں نے چھ کے چھ چیونگ گم ٹائم بم ڈبی میں ڈالے۔ ڈبی کو بند کیا اور پتلون کی جیب میں سنبھال کر رکھ لی۔ وہ میرے کپڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں تو کپڑے بالکل ٹھیک آئے ہیں"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ اب مجھے سردی بھی نہیں لگے گی۔"

رضوانہ اپنے ساتھ کچھ روپے بھی لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں کچھ پیسے لائی ہوں یہ تم اپنے پاس رکھ لو تمہیں ضرورت پڑے گی۔"

میں نے اسے بٹوہ کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں رضوانہ میرے پاس یہ کچھ پیسے ہیں۔ دلی تک پہنچ جاؤں گا۔"

مگر اس نے مجھے زبردستی سو روپے دے دیئے۔ میں نے رکھ لئے۔ چائے پینے کے بعد میں جانے لگا تو رضوانہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہنے لگی۔

"تم سے بڑی تھوڑی دیر کی ملاقات رہی ہے۔ لیکن مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں ایک مدت سے تمہیں جانتی ہوں۔ اب تم جا رہے ہو جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔"

یہ لڑکی جذباتی ہو رہی تھی۔ مجھے چندریکا اور میناکشی دونوں عورتیں یاد آگئیں۔ وہ بھی کبھی کبھی اسی طرح جذباتی ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس لڑکی رضوانہ کے جذبات سچے ہیں۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ہماری پھر بھی کبھی ملاقات ہو جائے"

وہ کہنے لگی۔

"تم نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تم نے مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں پھر میں کیسے امید لگاؤں کہ تم سے پھر بھی ملاقات ہو گی"

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑا لیا۔ اور کہا۔

"قدرت کو منظور ہوا تو ہم پھر بھی کبھی ضرور ملیں گے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں خدا حافظ!"

وہ مجھے چھوڑنے نیچے تک آئی۔ مکان کی ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ یہاں اس نے مجھے میری گردن میں باہنیں ڈال کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اس جذباتی گرمجوشی کے لئے

بالکل تیار نہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں وہیں اس لڑکی کے پاس رہ جاؤں۔ انسان کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو ایک شیطان اس کے ساتھ ضرور لگا رہتا ہے جو اسے اس کے سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایک شیطان شروع ہی سے میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ آپ اس سے پہلے بھی میری داستان میں پڑھ چکے ہوں گے۔ جب شیطان نے مجھے اپنے قابو میں تقریباً کر لیا تھا مگر خدا نے مجھے عین موقع پر عقل دے دی اور میں بچ گیا۔

اس وقت بھی شیطان مجھ پر بڑی تیزی سے غالب آنے لگا تھا۔ رضوانہ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ عین وقت پر خدا نے مجھے عقل دے دی اور میں جلدی سے پیچھے ہٹا اور خدا حافظ کہہ کر مکان کی ڈیوڑھی سے نکل گیا۔

ٹنڈلہ شہر کی مسجدوں میں اذانیں ہو چکی تھیں۔ آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا تھا۔ مجھے وہاں کے لاری اڈے کا راستہ آتا تھا۔ رات کو جہاں جہاں سے ہم گزر کر آئے تھے وہ راستے میں نے یاد رکھے تھے۔ لاری اڈے پر ایک بس آگرہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مسافر آنے لگے۔ لاری آگرہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرا ذہن رضوانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی نہ جانے لدھیانہ کے کس محلے کی رہنے والی شریف ماں باپ کی اولاد تھی مگر 1947ء کے خونی حالات نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر یہ اغوا نہ کی جاتی۔ اگر اسے سکھ اٹھا کر نہ لے جاتے تو آج اس کی شادی ہو چکی ہوتی اس کے بچے ہوتے۔ یہ اپنے خاوند کی خدمت اور بچوں کی پرورش کرتے ہوئے لدھیانہ شہر میں شریفانہ زندگی بسر کر رہی ہوتی۔

یہی سوچ رہا تھا اور سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دن نکل آیا اور لاری آگرہ پہنچ گئی۔ لاری اڈے سے اتر کر میں سیدھا ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ پتہ چلا کہ دلی جانے والی ٹرین ایک گھنٹے بعد آئے گی۔

میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا ہوا تھا اس لئے کچھ بے فکر ہو گیا تھا اور پلیٹ فارم پر ایک طرف خاموشی سے بیٹھنے کی بجائے ادھر ادھر ٹہل کر کتابوں کے سٹال پر اخبارات

وغیرہ دیکھنے لگا۔ یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ کمانڈو سپائی کو کبھی اور کسی بھی وقت
دشمن کے ملک میں غافل نہیں ہونا چاہئے وہ چاہے جس حلیے میں ہو دشمن ملک میں کسی
بھی جگہ کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے۔

میں سٹال پر ایک اردو اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی
بالکل میرے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ دوسرا اخبار دیکھنے کی بجائے میری طرف جھک کر
میرے اخبار کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے تو میں ویسے ہی کھڑا رہا لیکن جب وہ آدمی
پیچھے نہ ہٹا تو میں نے اخبار سٹال پر چھوڑ دیا اور خود پرے ہٹ گیا۔ اس آدمی نے مسکرا کر
میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بھائی صاحب آپ کے پاس ماچس ہو گی"

اس دوران اس آدمی نے جیب سے سگریٹ نکال کر اسے انگلیوں سے سیدھا کر کے
منہ میں دبا لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں بھائی صاحب میں سگریٹ نہیں پیتا"

وہ سگریٹ منہ سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"بھائی صاحب آپ مجھے ادھر کے رہنے والے نہیں لگتے۔ کیا آپ پنجاب سے آئے
ہیں"

اس آدمی کا حلیہ یہ تھا کہ جسم دبلا پتلا تھا۔ عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ خشخشی ڈاڑھی
میں سفیدی آ رہی تھی۔ سر پر جناح کیپ تھی۔ بدن پر پرانا سا گرم کوٹ اور نیچے پاجامہ
پہنا ہوا تھا۔ موسم سرد تھا جس کی وجہ سے اس نے قمیض کے سارے بٹن گلے تک بند
کئے ہوئے تھے۔ مجھے اس آدمی پر شک ہوا۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"پنجاب میں کس شہر سے آئے ہیں؟ آپ کا لہجہ جالندھریوں والا بھی نہیں ہے۔ کیا آپ
امرتسر سے آئے ہیں"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"جی ہاں"

اور وہاں سے ہٹ کر ایک طرف چل پڑا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھے یوں
آزادی سے پلیٹ فارم پر گھومنا پھرنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ آدمی یقیناً سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔
جانے اسے کس طرح مجھ پر شک پڑ گیا تھا کہ میں کوئی مشکوک آدمی ہوں۔ میں ٹی سٹال کے
کاؤنٹر پر آ گیا۔ چائے کا گلاس بنوایا اور کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر چائے پینے اور بک
سٹال کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آدمی وہاں نظر نہ آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس
سے پیچھا چھوٹا۔ سردی واقعی کافی تھی۔ گرم گرم چائے نے میرے بدن کو گرم کر
دیا۔ اس وقت میرا جی سگریٹ پینے کو بہت چاہا۔ سگریٹ والا کھوکھا قریب ہی تھا۔ میں نے
وہاں جا کر ایک سگریٹ خریدا اور وہیں ایک طرف کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے مجھے کہا۔

"بھائی صاحب آپ تو کہتے تھے کہ میں سگریٹ نہیں پیتا"

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہی آدمی میرے پیچھے کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکرا
رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سگریٹ تھا جو سلگ رہا تھا۔ میں نے اپنے سگریٹ کی راکھ
جھاڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ کبھی کبھی پی لیا کرتا ہوں"

وہ آدمی میرے قریب ہو گیا۔ مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں صاف نظر آ رہی
تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں مجھ پر جمائی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب آپ مجھے امرتسر کے بھی نہیں لگتے۔ کہیں آپ لاہور کے رہنے
والے تو نہیں ہیں۔"

اس کے منہ سے لاہور کا نام سن کر میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ بات
ثابت ہونے لگی تھی کہ یہ آدمی خفیہ پولیس والا ہے اور اتنی آسانی سے میری جان نہیں
چھوڑے گا۔ وہ تنہا مقام بھی نہیں تھا۔ آگرہ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھا۔ وہاں کافی لوگ تھے
ایک طرف مجھے پولیس کے سپاہی بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنے حواس کو قابو میں

رکھا۔ اس کی مجھے خاص طور پر اور بڑی سخت ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والا؟ آپ کو کس نے بتایا
میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ جائیے اپنا کام کریں"

میں یہ کہہ کر وہاں سے دوسری طرف چلا گیا۔ میرا رخ پلیٹ فارم کے شمالی سرے
جانب تھا۔ وہاں پلیٹ فارم کی ڈھلان تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ڈھلان اتر گیا۔ ریلوے
لائن کراس کی اور دوسرے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں چونکہ کوئی گاڑی آنے والی یا جا
والی نہیں تھی اس لئے پلیٹ فارم تقریباً خالی پڑا تھا۔ ٹی سٹال اور بک سٹاک کے کھو
بھی بند تھے۔ میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھیں
سامنے والا پلیٹ فارم بھی مجھے نظر آرہا تھا۔ کیونکہ دو پلیٹ فارموں کی درمیانی لائن پر
گاڑی کھڑی نہیں تھی۔ جہاں وہ آدمی پہلے کھڑا تھا اب وہاں نہیں تھا۔ وہ خدا جانے کہاں
غائب ہو گیا تھا۔

اصل میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ مجھے وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا مگر
ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں بنچ پر بیٹھا رہا۔ میری نگاہ پلی
فارم کے آخری حصے کی طرف گئی جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں
وہی سی آئی ڈی کا آدمی دو سپاہیوں کے ساتھ میری طرف چلا آرہا ہے۔ اب مجھے وہاں
بھاگنا تھا۔ مگر میں نے ایک بار پھر تساہل سے کام لیا۔ بنچ سے ضرور اٹھا مگر آہستہ آہ
دوسری طرف چلنے لگا۔ جیسے میں نے سپاہیوں کو دیکھا ہی نہیں۔ دوسری طرف نیچے ریل
پٹڑی تھی۔ میں ریل کی پٹڑی پر اتر گیا۔ ذرا آگے ایک خالی ڈبہ کھڑا تھا۔ میں اس
چڑھ گیا۔ اندر آتے ہی میں ایک دم ایکشن میں آگیا۔ تیزی سے خالی ڈبے کے دوس
دروازے میں سے دوسری طرف اترا اور ریلوے لائن پر دوڑنے لگا۔ وہاں کوئی
ریلوے لائن نہیں تھی۔ ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ میں تیزی سے نہیں
سکتا تھا۔ پھر بھی میں الانگتا پھلانگتا جتنی جلدی جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا۔

کر میں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے سٹیشن سے باہر نکلنے
کو راستہ بھی ہے یا نہیں۔ ریلوے یارڈ ختم ہوا تو سامنے ایک جانب دیوار آگئی۔ دیوار
بہت اونچی تھی۔ میں دوسری طرف دوڑ پڑا۔ ادھر آگے ایک ورکشاپ آگئی جہاں کچھ
مزدور ایک ریلوے انجن کی صفائی وغیرہ کر رہے تھے۔

مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟"

میں نے یونہی پوچھا۔

"رحمت علی مکینک یہیں کام کرتا ہے کیا؟"

"کون رحمت علی؟"

ایک نے پوچھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے سی آئی ڈی والا اور دونوں سپاہی
کہیں نظر نہ آئے۔ میں نے کام کرنے والے مزدوروں یا مستریوں سے کہا۔

"میرا واقف ہے۔ کہتا تھا۔ میں یہیں کام کرتا ہوں۔ شاید اس نے کوئی دوسری جگہ
ہو گی"

یہ کہہ کر میں ایک طرف چلا تو پیچھے سے ان میں سے کسی نے آواز دی۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو؟ باہر نکلنے کا دروازہ اس طرف ہے"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک مستری سامنے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔
جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ تھا جو ریلوے یارڈ کی
دوسری طرف نکلتا تھا۔ جیسے ہی میں اس دروازے سے باہر نکلا سامنے وہی سی آئی ڈی والا
کھڑا تھا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ چار سپاہی کھڑے تھے جن میں سے ایک سپاہی کے
رائفل تھی۔ اس نے رائفل ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔
سی آئی ڈی کے آدمی نے اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی تین سپاہی میری طرف بڑھے اور
ل نے آن واحد میں دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ چوتھے سپاہی نے میری طرف رائفل
کر رکھی تھی۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ مجھے کس جرم میں پکڑ رہے ہو۔ میرے پاس دلی کا ٹکٹ ہے۔ میں بے ٹکٹ نہیں ہوں"

وہ آدمی مکارانہ ہنسی ہنسا۔

"مہاراج! آپ کو ہم لاہور لے جا رہے ہیں۔ ذرا تھانے تک ہمارے ساتھ چلیے"

وہ مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ ایک طرف تیز تیز چلانے لگے۔ میں بڑی آسانی سے گرفت سے نکل کر فرار ہو سکتا تھا مگر خطرہ مجھے رائفل والے سپاہی سے تھا جو را تانے میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ شاید انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہ آدمی کشمیری کمانڈ اور اس کی طرف سے ذرا بھی غفلت نہ برتنا۔ ہم سڑک پر آئے تو وہاں پولیس والی جیپ کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے جیپ میں دھکیل دیا اور تین سپاہی اس طرح بر دائیں بائیں اور پیچھے آگے آگئے کہ میں ان کے شکنجے میں تھا۔ جس سپاہی کے پاس را تھی وہ جیپ کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ سی آئی ڈی کا آدمی آگے ڈرائیور کے بیٹھ گیا۔

جیپ سٹارٹ ہوئی اور بازار میں ایک طرف چل پڑی۔ مجھے ہر حالت میں ان کی حراست سے فرار ہونا تھا۔ اور اس قسم کے فرار کی مجھے سخت ٹریننگ ملی ہوئی میں اتنی آسانی سے پولیس کے جال میں پھنسنے والا نہیں تھا۔ میں نے رائفل والے کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی رائفل کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ جیپ جس بازار میں گزر رہی تھی وہاں لوگ آجا رہے تھے اور ٹریفک بھی جاری تھی۔ اس قسم کا میرے فرار کے لئے بڑا موزوں تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ مجھے کس سپاہی کو نیچے لگانی ہے اور کس سپاہی کی گردن توڑنی ہے۔ سب سے پہلے میں رائفل والے سپاہی کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی اس کا منصوبہ ہی تیار کر رہا تھا کہ جیپ اچانک ایک طرف اور ایک عمارت کے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں پہلے سے ایک بندوق بردار سپاہی پہرے پر موجود تھا۔

جیپ ایک احاطے میں آکر رک گئی۔ میں پولیس کے تھانے میں پہنچ چکا تھا۔

دیکھ کر سامنے والے کمرے سے ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جب مجھے جیپ سے اتارا جا رہا تھا تو سب انسپکٹر نے گالی دے کر کہا۔

"اس کو ہتھکڑی کیوں نہیں لگائی؟"

اس وقت ایک سپاہی نے میرے ہاتھ پیچھے کر کے مجھے ہتھکڑی لگا دی میں نے جنگ نہیں ہاری تھی۔ صرف ایک لڑائی ہار گیا تھا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میں نے دوسری لڑائی کے لئے ذہن تیار کرنا شروع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس میری کوئی تصویر نہیں ہے جو احمد آباد کی پولیس نے انہیں بھیجی ہو۔ اگر انہیں احمد آباد پولیس نے میری گرفتاری کے لئے کوئی اطلاع دی ہے تو بھی میں کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کروں گا کہ میں وہی آدمی ہوں جس نے دوارکا فورٹ کا ایمونیشن کا ذخیرہ اڑایا ہے۔ یہ لوگ کسی طرح بھی کم از کم آگرہ میں بیٹھ کر مجرم ثابت نہیں کر سکتے۔ مجھے اسی وقت حوالات میں لے جا کر بند کر دیا۔ میں نے چلا کر کہا۔

"مجھے کس جرم میں یہاں بند کیا گیا ہے۔ مجھے ٹیلی فون دیا جائے۔ میں ایس ایس پی کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے پتا جی کے دوست ہیں۔"

سب انسپکٹر پولیس جو شکل ہی سے بڑا جابر لگتا تھا۔ حوالات کی سلاخوں کے پاس آگیا۔ اس نے مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"ابھی ایس ایس پی صاحب بھی آ رہے ہیں۔ تم اپنے پتا جی کو بلانے کا انتظام کرو"

یہ کہہ کر وہ اپنے دفتر میں چلا گیا۔

حوالات میں تین حوالاتی کونے میں پرانا کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ان میں ایک سکھ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"بھاجی! کسی کی جیب کاٹی ہے یا ہیروئن سمگل کی ہے۔ ادھر آجاؤ۔ ادھر بڑی سردی ہے"

حوالات میں واقعی بڑی سردی تھی۔ تنگ سی حوالات تھی۔ میرا ذہن تیزی سے وہاں سے فرار کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ مگر بظاہر فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تھوڑی

دیر بعد وہی سب انسپکٹر ایک سپاہی کے ساتھ آیا۔ میری ہتھکڑی حوالات کے اندر
انہوں نے نہیں اتاری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں میرے خطرناک کمانڈو ہونے
اطلاعات مل چکی تھیں۔ میں احتجاج کرنے لگا کہ مجھے بتایا جائے کہ مجھے یہاں کیوں بند
گیا ہے۔ مجھے کس جرم میں ہتھکڑی لگائی گئی ہے۔ سب انسپکٹر مجھے ساتھ لے کر تھا
میں جو کشادہ برآمدہ تھا اس کے درمیان والے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایس پی، ایس کے بھنڈاری لکھا تھا۔ اندر ایک بھاری تن و توش کا ہندو لالہ
کٹ گرم جیکٹ اور کھدر کا سوٹ پہنے بڑی کرسی میں دھنسا ہوا بیٹھا تھا۔ سب انسپکٹر
سلیوٹ کیا۔ ایس ایس پی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر سب انسپکٹر سے انگریزی میں پوچھا

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

اس نے کہا۔

"یس سر! مجھے پورا یقین ہے"

ایس ایس پی نے سنہری فریم والی عینک اتار کر رجسٹر پر رکھ دی اور سب انسپکٹر
طرف دیکھ کر کہا۔

"مسٹر جوشی اگر تمہارا یہ ونچر کامیاب ہوا تو تمہارے ساتھ میری بھی پرموشن
ہے۔ جاؤ۔ اس کی دو تصویریں اترواؤ"

میری سمجھ میں نہ آیا یہ میری تصویریں کس لئے اتروانے لگے ہیں۔ میں یہی سمجھا
کہ تھانے کی ریکارڈ کے لئے تصویریں اتروا رہے ہیں۔ وہ مجھے ایک دوسرے کمرے
لے گئے جہاں ایک فوٹو گرافر بیٹھا ایک تصویر کے نقوش باریک برش سے درست کر
تھا۔ فوراً میری دو تصویریں اتاری گئیں۔ اس کے بعد مجھے حوالات کی بجائے ایک ا
کمرے میں بند کر دیا گیا جس کو کوٹھڑی کہنا درست ہو گا۔ اس میں کوئی روشندان ن
تھا۔ صرف لوہے کا دروازہ تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔

کوٹھڑی کا ننگا فرش سردی میں اور زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہاں صرف فرش پر
میں ایک پرانا سا کمبل بچھا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور کمبل پڑا تھا۔ مجھے جیکٹ میں

سردی لگ رہی تھی۔ میں کونے میں کمبل لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ لوگ اب مجھ سے پوچھ گچھ شروع کرنے والے ہیں۔ یہ مجھے ٹارچر کریں گے اور مجھ سے اعتراف کروانے کی کوشش کریں گے کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ مگر مجھے اس قسم کے ٹارچر کی ہوشنگ آباد کے جنگل میں انتہائی اذیت ناک ٹریننگ مل چکی تھی۔ میرے ٹریننگ ماسٹر نے مجھے ٹارچر کے شدید سے شدید مرحلوں میں سے گزارا تھا اور یہ بھی تربیت دی تھی کہ جب اذیت حد سے گزر جائے تو مجھے اپنے جسم کو کس طرح سن کر کے اپنے اوپر یک طرفہ بے ہوشی طاری کر لینی ہے۔ یعنی ایسی بے ہوشی کہ جس میں جسم پر کسی اذیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا مگر آدمی ہوش میں رہتا ہے۔

ایک بات پر میں بڑا حیران تھا کہ انہوں نے ابھی تک میری تلاشی نہیں لی تھی۔ اس کوٹھڑی میں میں دو دن تک بند رہا۔ تیسرے روز ایس ایس پی سب انسپکٹر جوشی کے ساتھ خود میری کوٹھڑی میں آیا۔ دو سپاہی ساتھ تھے۔ یہاں میری ہتھکڑی اتار دی گئی تھی۔ سپاہیوں نے فوراً دو کرسیاں اندر ڈال دیں۔ سب انسپکٹر جوشی اور ایس ایس پی بھنڈاری کرسیوں پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ کوٹھڑی کی چھت کے ساتھ ایک بلب دن رات روشن رہتا تھا۔ ایس ایس پی بھنڈاری بڑا خرانٹ اور تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ اس نے مجھ سے بڑی ملائمت اور نرمی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ وہ کشمیر کے بارے میں باتیں کرنے لگا کہ کشمیر کے مسلمان کشمیری ناحق اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ آدھے سے زیادہ کشمیری مسلمان ہندوستان کے ساتھ ہیں اور وہ ہندوستان کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔

جب اس پولیس آفیسر نے آتے ہی کشمیر کی تحریک آزادی کے بارے میں گفتگو شروع کی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ ان لوگوں کو پتہ لگ چکا ہے کہ میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ پھر بھی میں اپنی طرف سے بالکل انجان بنا رہا اور میں نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ کشمیر کے سارے مسلمان ہندوستان سے الگ ہو کر پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی ہیں۔ ہندوستان نے زبردستی کشمیر پر اپنی فوج کے ذریعے قبضہ کر رکھا ہے۔"

مجھے اتنی جلدی ایسی باتیں زبان سے نہیں نکالنی چاہئیے تھیں۔ ان باتوں نے کم از کم
یہ ضرور ثابت کر دیا کہ میں کشمیر کی تحریک آزادی کا حامی ہوں اور کشمیری مسلمانوں کے
حق خود ارادی کے حق میں ہوں۔ ایس ایس پی نے مسکراتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا
کہنے لگا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہارا کشمیری مجاہدین کی تحریک سے تعلق ہے۔ اور
کشمیری کمانڈو ہو جسے بھارت میں تخریبی کارروائیوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔“

اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ مجھے کسی ملک نے انڈیا میں جاسوسی کے لئے نہیں بھیجا۔ کشمیر کی
تحریک آزادی کی میں نے جو بات کی ہے وہ کشمیر اور بھارت کے ہر مسلمان کے دل کی
آواز ہے۔“

ایس ایس پی بھنڈاری مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے میرے
بارے میں کسی خفیہ بات کا علم ہو چکا ہے۔ اس نے میری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے
میری طرف ذرا سا جھک کر پوچھا۔

”احمد آباد آگرہ اور دلی میں تمہارے دوسرے ساتھی کہاں پر ہیں؟ اگر تم ہمیں ان
کے صحیح ٹھکانے بتا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ہم تمہیں
اپنی نگرانی میں پاکستان واپس پہنچا دیں گے۔“

میں نے بھی ایس ایس پی کو گھورتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں جالندھر میں محنت مزدوری کرتا ہوں۔“

”کیا تم ہندو ہو؟“

”ہاں میرا نام دیوی ناتھ ہے۔“

اس وقت یہی ہندوانہ نام میری زبان پر آیا اور میں نے یہی بول دیا۔ حقیقت یہ
کہ میں اس وقت ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان لوگوں کو میرے بارے
میں سب پتہ چل چکا ہے۔ اب انہوں نے صرف کوئی ثبوت ہی میرے سامنے لانا تھا۔

جب میں نے کہا کہ میں ہندو ہوں تو یہ اندھیرے میں کیا ہوا فائر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے
ہندو یا مسلمان ہونے کی قلعی ایک سیکنڈ میں کھل سکتی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایس ایس پی
بھنڈاری نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ میری پتلون کھولی جائے۔
دوسرے لمحے میرا مسلمان ہونا ثابت ہو گیا۔ سب انسپکٹر جوشی نے بھی نرم رویہ
اختیار کیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”ہمارے پاس اس بات کا مکمل ثبوت موجود ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو تم کشمیری
کمانڈو بھی نہیں ہو۔ کیونکہ تم کشمیری نہیں ہو۔ مگر تم کشمیریوں کے ساتھ مل کر بھارت
میں تخریبی کارروائیاں کرنے آئے ہو اور کر رہے ہو۔ ایس ایس پی صاحب نے تمہیں جو
پیش کش کی ہے وہ تمہیں اذیت ناک موت سے بچا سکتی ہے۔ ہمیں صرف اتنا بتا دو کہ
انڈیا میں تم لوگوں کے خفیہ ٹھکانے کہاں کہاں پر ہیں اور تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ
ہیں۔“

میرے پاس انکار کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مگر مجھے اقرار بھی نہیں کرنا تھا
اپنے احمد آباد اور دلی والے ساتھیوں کے کسی حالت میں نام نہیں بتانے تھے۔ میں نے
صاف انکار کر دیا۔

”میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔“

تب ایس ایس پی بھنڈاری نے مجھے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور گالی دے کر
بولا۔

”ہم نے تمہاری تصویر احمد آباد سیکرٹ پولیس کو بھیجی تھی۔ وہاں سے انہوں نے
تمہاری تصویر دیکھ کر تصدیق کر دی ہے کہ تم ہی وہ پاکستانی جاسوس ہو جو گوکل داس
کے گھر میں جینی سادھو کے بھیس میں رہ رہا تھا جس کمرے میں تم رہتے تھے وہاں
سے ہم نے مائیکروفون اور چھوٹا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی برآمد کر لیا ہے۔ تم پولیس ریڈ پر وہاں
سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر آخر یہاں پکڑ لئے گئے۔ تم ہی وہ پاکستانی
جاسوس ہو جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ڈھ گھاٹ سٹیشن پر ملٹری ایمونیشن کی

گاڑی تباہ کی تھی۔ تم نے ہی دوار کا فورٹ کے ایمونیشن ڈمپ کو اڑایا ہے۔ کیا ا
بھی انکار کرتے ہو؟"

میرا سارا راز فاش ہو چکا تھا۔ میں نے دوسرا موقف اختیار کر لیا جو اصل حقیقت
تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں کشمیری کمانڈو ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔ مگر پاکستانی جاسوس نہیں
ہوں۔ مجھے پاکستان نے یہاں جاسوسی کے لئے نہیں بھیجا۔ میں اپنی مرضی سے صرف
کے نام پر اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ میں نے
اور دوار کا فورٹ کے اسلحہ کو بھی اس لئے تباہ کیا تھا کہ وہ اسلحہ میرے کشمیری
بھائیوں کے خلاف استعمال کیا جانے والا تھا۔ میں نے آپ کو سچ بات بیان کر دی ہے۔
آپ میرے ساتھ جو چاہے سلوک کریں۔"

سب انسپکٹر جوشی نے کہا۔

"لیکن تم نے ابھی تک اپنے ساتھی کمانڈوز کے بارے میں نہیں بتایا کہ وہ کہاں
ہوئے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور میں نے اکیلے ہی مڈگھاٹ کی
اڑائی تھی اور دوار کا فورٹ کا ایمونیشن کا ذخیرہ تباہ کیا تھا"

ایس ایس پی بھنڈاری کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"احمد آباد سے چیف انٹیلی جنس آفیسر شام تک آگرہ پہنچ جائے گا۔ وہ تمہیں
ہے وہ تمہاری شناخت کرے گا۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ تم کس طرح اپنے
منصوبوں کے بارے میں اور اپنے ساتھیوں کے نام پتے کس طرح نہیں بتاتے۔"

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔

"اس کی کڑی نگرانی کی جائے"

یہ سپاہی سب انسپکٹر اور ایس ایس پی کے ساتھ ہی کوٹھڑی سے نکل گیا۔ باہر

اس نے کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کو بند کر کے بھاری تالا لگا دیا اور پہلے والے
سنتری سے کہا۔

"تم جاؤ۔ میں ڈیوٹی دوں گا"

پہلے والا سپاہی چلا گیا۔ میں بازی ہار چکا تھا۔ لیکن اس بات پر بڑا حیران تھا کہ ابھی
کسی نے تھانے میں میری تلاشی نہیں لی تھی۔ خدا جانے وہ کس لمحے کا انتظار کر رہے
تھے۔ اتنی بہت غنیمت تھی کہ کوٹھڑی کے اندر مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی تھی۔ ویسے
میری جیب میں سوائے کچھ نقدی اور چھوٹی سی ڈبی کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس چھوٹی
ڈبی میں چھ ٹائم بم بند تھے۔ یہ چیونگ گم بم کی چھ چوکور ٹکیاں تھیں جن کی وضع قطع
بالکل چیونگ گم کی طرح بنائی گئی تھی لیکن ان کے اندر انتہائی دھماکہ خیز مواد بھرا ہوا تھا۔
آپ کو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ ٹائم ڈیوائس والے چھوٹے سے بم دلی میں ہائی
ایکسپلوسیوز کے ماہر گل خان کی زیر نگرانی تیار کئے گئے تھے۔ اس سے پہلے میرے پاس
ہوں کا محلول تھا جس کا ایک قطرہ پانی میں ڈال کر اگر وہ پانی پی لیا جائے تو اس قطرے
دھماکہ خیز کیمیکلز معدے کے تیزاب سے مل کر چین ری ایکشن شروع کر دیتے ہیں اور
منٹ کے بعد اس آدمی کے پیٹ میں دھماکہ ہوتا ہے اور اس کے پرخچے اڑ جاتے
ہیں۔ مگر دلی سے احمد آباد را RAW کے احمد آباد والے چیف گوکل داس پانڈے کی
ہوی کرنے جب چلا تھا تو گل خان کے مشورے پر ہم نے اس محلول کو پہلے اسپرو کی
گولیوں میں اور اس کے بعد میں نے خود اسے چیونگ گم کی ٹکیوں کی شکل میں بنا لیا تھا تاکہ
کسی کو ان پر شک نہ ہو۔ اس قیامت خیز دھماکوں والے ٹائم بم کا فارمولا بھی ہمارے پاس
تھا جو اس وقت میرے پاس نہیں تھا بلکہ ہمارے احمد آباد والے ماسٹر سپائی کریم بھائی کے
سے باہر ریلوے لائن والے غیر آباد کوارٹر کے تہہ خانے میں میری دوسری خفیہ چیزوں
کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

ایس ایس پی بھنڈاری کی زبانی مجھے علم ہو چکا تھا کہ احمد آباد سیکرٹ پولیس کا کوئی
آفیسر وہاں سے آگرہ کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے اس نے مجھے گوکل داس

پانڈے کے گھر پر دیکھا ہو گا۔ اس کو میری تصویر بھی مل چکی تھی۔ اب اس نے
میں آکر صرف میری شناخت کرنی تھی اور اس کے بعد مجھ پر حیوانی ٹارچر کا سلسلہ
ہو جانا تھا۔ جس کو مجھے موت کی سرحدوں تک برداشت کرنا تھا۔ لیکن تشدد اور غیر
اذیت کے لمحات شروع ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ سوال
کہ آگرہ کے اس پولیس سٹیشن کی سلاخوں والی کوٹھڑی سے کس طرح فرار ہوا جائے
جس کے دروازے پر بھاری تالا پڑا تھا اور ایک رائفل بردار سپاہی دروازے کے
پہرہ دے رہا تھا۔ یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جو اس وقت میرے سامنے تھا اور مجھے
تربیت یافتہ تجربہ کار کمانڈو ہونے کی حیثیت سے اس مسئلے کو بہت جلد حل کرنا تھا۔
مسئلے کا ایک حل میری جیب میں موجود تھا۔ لیکن یہ آخری حل تھا اور اس میں میری
جانے کا شدید خطرہ تھا۔ اگر میں جیب میں رکھی ہوئی ڈبی میں سے ایک چیونگ گم کی
نکال کر کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے میں کسی طرح لگا دوں تو ایک گھنٹے
زبردست دھماکے کے ساتھ دروازہ اڑ سکتا تھا۔ لیکن اس بم کی شدت اور طاقت
زیادہ تھی کہ اس بات کا خدشہ تھا کہ دروازے کے ساتھ پوری کی پوری کوٹھڑی کے
ساتھ ہی میرے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔

میں فرار کے کسی دوسرے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں
کھڑے سنتری کو کسی طرح دروازے کی سلاخوں کے پاس بلاؤں۔ سلاخوں میں سے
نکال کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالوں اور اس کی بیلٹ کے ساتھ جو چابیوں کا گچھا لٹکا
تھا۔ وہ اپنے قبضے میں کروں اور اس میں سے اپنی کوٹھڑی کے دروازے والی چابی
دروازہ کھولوں اور تھانے کی عقبی دیوار پھلانگ کر فرار ہو جاؤں۔ یہ حل بالکل ایسا
کہ بگلے کو پکڑنے کے لئے اس کے سر پر موم رکھ دی جائے۔ دھوپ میں موم پگھل
بگلے کی آنکھوں پر گرے۔ بگلا اندھا ہو جائے تو پھر اسے پکڑ لیا جائے۔ کیونکہ اس
مرحلے میں کسی نہ کسی کے وہاں آجانے کا پورا امکان تھا۔ آخر وہ کوئی ویران مکان
تھا۔ آگرہ پولیس کا بڑا تھانہ تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ برآمدے میں پولیس کے سپاہی

دوسرے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ سامنے احاطے میں بھی ایک جانب جہاں گاڑیاں
کھڑی تھیں وہاں دو تین آدمی بنچ پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔

مجھے اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ احمد آباد سے اگر انٹیلی جنس چیف یہاں پہنچ گیا اور
مجھے شناخت کر لیا گیا تو مجھے یہاں سے ہتھکڑیاں اور ممکن ہے بیڑیاں ڈال کر واپس احمد آباد
لے جایا جائے۔ وہاں پہنچ کر میرے لئے فرار ہونا مزید مشکل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے جو کچھ
بھی کرنا تھا بڑے سے بڑا خطرہ مول لے کر ابھی کرنا تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ یا نو بجے کا
ٹائم ہو گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ میں نے باہر کھڑے سنتری سے وقت پوچھا۔ اس
نے پہلے تو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ
ڈالی اور نفرت سے کہا۔

"نو بجنے والے ہیں۔ بس تمہاری موت میں تھوڑا وقت ہی باقی رہ گیا ہے۔"

میں کمبل اوڑھے کونے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ اور وقت
گزرتا جا رہا مجھے احساس ہوا کہ اب سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ایکشن کا وقت
شروع ہو گیا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے اسی وقت کر ڈالنا چاہئے۔ آخر میں نے کوٹھڑی
کو دھماکے سے اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں
ہے۔ اگر میری زندگی ہو گی تو بچ جاؤں گا۔ اگر مر گیا تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ مر جاؤں گا۔
لیکن انڈیا کی ہندو پولیس کے بے عزتی اور تشدد سے تو نجات حاصل کر لوں گا۔ مجھے
معلوم تھا کہ احمد آباد میں مجھ پر صرف تشدد ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ میری بے عزتی بھی کی
جائے گی۔ تشدد تو میں برداشت کر سکتا تھا۔ اس کی مجھے ٹریننگ ملی ہوئی تھی لیکن بے عزتی
اور ذلت میری برداشت سے باہر تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ کچھ دیر بعد آکر مجھے یہاں سے کسی
دوسری جگہ منتقل کر دیں جہاں مجھے چیونگ گم لگانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اور ایک بات
یہ بھی تھی کہ بم لگانے کے بعد مجھے مزید ایک گھنٹے تک اس کے پھٹنے کا انتظار کرنا تھا۔ اس
کی کیمیاوی ساخت ایسی بنائی گئی تھی کہ بم کی چیونگ گم ٹکیا کسی جگہ چپکانے کے بعد اس

کے ایک طرف کے کنارے کو ذرا سا دبایا جاتا تھا۔ وہاں مواد کے نیچے چھوٹی سی شیشے ٹیوب لگی تھی جس میں تیزاب تھا۔ دبانے سے شیشے کی ٹیوب ٹوٹ جاتی تھی اور تیزا دھماکہ خیز مواد میں حل ہونے لگتا تھا۔ مگر اس کی رفتار ست تھی۔ یہ رفتار جان بوجھ ست رکھی گئی تھی تاکہ کسی جگہ بم لگانے کے بعد ہمیں وہاں سے دور نکل جانے کا مو مل سکے۔ ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد تیزاب نے مواد میں حل ہو کر ایک خاص کیمیا تک پہنچنا تھا اور اس کے بعد دھماکہ ہونا تھا۔ مگر یہاں تو میں بم پھٹنے سے پہلے نہیں بھا سکتا تھا۔ مجھے بم بلاسٹ ہونے کے بعد بھاگنا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اگر میں ز بچ گیا تو بم لگانے کا فیصلہ درخت کی اس اونچی شاخ پر کلہاڑی چلانے کے برابر تھا جس میں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مگر اس کے سوائے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی میں نے کمبل کی بکل کے اندر ہی اندر پتلون کی جیب ہاتھ ڈال کر ڈبی نکالی۔ اسے کھولا اور چیونگ گم بم کی ایک چھوٹی چوکور ٹکیا نکال کر ڈبی بند کر کے واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بم کی ٹکیا میرے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں تھی۔ اور میں کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کسی حد تک بچاؤ کر ایک صورت یہ تھی کہ میں یہ بم دروازے کے باہر کی جانب دیوار سے چپکاؤں۔ لیکن کام بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا۔ سنتری دروازے کے سامنے چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے اس کے قدموں کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ وہ ایک طرف سے پانچ قدم چل کر دروازے کی دوسری جانب پہنچتا تھا۔ وہاں ایک لمحے کے لئے رک جاتا۔ پھر پلٹ کر واپس قدم قدم چلنے لگتا۔ میں نے ذہن میں ایک سکیم تیار کر لی۔

اس کے ساتھ ہی میں کمبل اوڑھے اٹھا اور دروازے کے قریب آیا۔ سنتری نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ پیچھے چل کر بیٹھو"

میں نے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر سو روپے کا نوٹ نکال لیا اور بڑی عاجزی

ساتھ جس طرح نشئی لوگ بولا کرتے ہیں سنتری کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! آپ کو آپ کے بھگوان کا واسطہ ہے میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ایک سگریٹ بیڑی کہیں سے لا دیں۔ یہ سو روپیہ مجھ سے لے لیں"

میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے آگے کر دیا۔ سنتری پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ اس نے دائیں بائیں جائزہ لیا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ 1960ء کا زمانہ تھا۔ اس زمانے تک سو روپے کے نوٹ کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ سنتری نے جلدی سے سو روپے کا نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے پیچھے دھکیل کر بولا۔

"چلو پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ چلو"

میں جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ میں ایک نشئی کی اداکاری کر رہا تھا جس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کے اندر چیونگ گم بم چپکا ہوا تھا۔ میں وہیں سلاخوں کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ سنتری بولا۔

"ابھی کوئی آتا ہے تو تمہارے لئے بیڑی سگریٹ منگاتا ہوں۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

میں نے دل میں اسے بڑی سخت گالی دی۔ وہ میرے منصوبے کو ناکام بنا رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ہٹ جائے گا مگر وہ سو روپے لے کر بھی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میں نے کہا۔

"بھیا کسی دوسرے سنتری سے سگریٹ مانگ کر لے آؤ میرے لئے، تمہاری بڑی مہربانی ہو گی"

اس نے ایک بار پھر مجھے غصے سے ڈانٹ دیا۔

"پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ تم وائسرائے لگے ہو کہ تمہارے لئے میں کسی سے سگریٹ بھی مانگوں"

لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس دوران وہ برآمدے کے دوسرے کونے کی جانب

دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی ایسے سنتری کی تلاش میں تھا جو بیڑی وغیرہ پیتا ہو۔ مگر وہ میرے
سگریٹ بیڑی فراہم کرنے کے معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ سو روپے کا نوٹ
طرف سے ہضم کر گیا تھا۔ اب وہ دروازے کے باہر چل پھر کر دوبارہ پہرہ دینے لگا
اس دوران میں بے معلوم انداز میں کھسکتا ہوا دروازے کے کونے میں آ گیا تھا۔ میں
اس کی موجودگی میں دروازے کی ایک جانب بم لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں وہیں کم
اوڑھے بیٹھا اس طرح آہستہ آہستہ کراہنے لگا تھا جس طرح واقعی میرا نشہ ٹوٹ رہا
سنتری اس دوران ادھر ادھر ضرور دیکھ لیتا تھا۔ شاید وہ میری خاطر کسی تمباکو پینے وا
چپڑاسی قسم کے آدمی کی تلاش میں تھا۔ ایک بار جب وہ دروازے کے آگے پہرہ دینے
انداز میں ٹہلتا ہوا ذرا آگے گیا تو میں نے کمبل میں سے ہاتھ نکال کر سلاخوں وا
دروازے کے کونے میں چیونگ گم کا ٹائم بم چپکا دیا۔ بم چپکانے کے ساتھ ہی میں نے
کا خاص کنارا ذرا سا دبا دیا۔ جس وقت سنتری پانچ قدم چلنے کے بعد واپس مڑا اس و
میرا ہاتھ کمبل کے اندر تھا اور میں کراہنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ سنتری نے مجھے گالی د
کر کہا۔

"تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ چلو۔ پیچھے چلو ادھر دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھو۔ اٹھو
مجھے تو خود اب کونے میں دیوار کے ساتھ جا کر ہی بیٹھنا تھا۔ کیونکہ اگر میری
بچنی تھی تو وہیں بچ سکتی تھی۔ میں نے دھماکے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ
والی دیوار کو دروازے اور سنتری کے ساتھ ہی بھک سے اڑ جانا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ
نہیں تھا کہ پچھلی دیواریں اور چھت اڑ کر کس طرف کو جاتی ہے۔ میری عقل کہہ
تھی کہ اگر میں پچھلی دیواروں کے درمیان کونے میں فرش پر اوندھا لیٹ جاؤں تو دھ
کے زبردست دباؤ کے علاوہ سامنے والی دیواروں اور چھت کے ملبے سے بچ سکتا ہو
جب دھماکہ ہوتا ہے تو سب سے پہلا نقصان ہوا کے وہ تھپیڑے پہنچاتے ہیں جن میں
شدید دباؤ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بم میں ڈالے ہوئے لوہے کے کیل لوہے اور شیشے
ٹکڑے آدمیوں کو گولیوں کی طرح آ کر لگتے ہیں۔ لیکن میں نے جو بم چپکایا تھا اس

صرف دھماکہ پیدا کرتا تھا۔ اس میں لوہے کے کیل یا شیشے کے ٹکڑے بالکل نہیں تھے۔
لیکن اسے انتہائی دھماکہ خیز بنایا گیا تھا۔ زمین پر اوندھے لیٹنے میں ایک فائدہ ضرور تھا کہ
دھماکے سے پیدا ہونے والی ہوا کے شدید دباؤ کے تھپیڑے میرے اوپر سے نکل جاتے اور
بہت ممکن تھا کہ چھت کے ساتھ میرے پیچھے والی دیوار کو بھی اڑا ڈالتے۔ جو کچھ بھی تھا
اب مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا تھا۔ بم میں نے لگا دیا تھا اور بم کے اندر کیمیاوی رد عمل
شروع ہو چکا تھا۔ میں نے سنتری کو آواز دے کر کہا۔

"مہاراج! ٹائم ہی بتا دیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے"

اس نے بیزاری سے گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔

"نو بج رہے ہیں"

مجھے ٹائم کا پورا حساب رکھنا تھا۔ اس بم کا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوار کا فورٹ میں جو بم
میں نے لگائے تھے وہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اس حساب سے میرے
پاس صرف ایک گھنٹہ تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد پولیس سٹیشن میں قیامت برپا ہونے والی
تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس قیامت میں میں بھی رگڑا جاتا۔ لیکن جو کچھ کرنا تھا میں نے کر دیا
تھا۔ اب آگے تقدیر کا کھیل تھا۔ میں نے سوچا۔ زندگی ہو گی تو بچ کر نکل جاؤں گا۔ اگر
زندگی کا وقت پورا ہو چکا ہے تو اللہ مالک ہے۔ صرف ایک بات کا خیال مجھے پریشان کر رہا
تھا کہ اس دوران کسی وجہ سے مجھے اس کوٹھڑی سے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ بند کر دیا
جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایس ایس پی سیکورٹی کے پیش نظر مجھے سامنے والی قطار میں جو
حوالات تھے وہاں پہنچا دے۔ ایسی صورت میں میرے منصوبے پر پانی پھر سکتا تھا۔ بم کو تو
ایک گھنٹے بعد پھٹ کر وہاں تباہی مچانی ہی تھی لیکن اس کا مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور میں اپنے ذہن میں ایک ایک سیکنڈ کا حساب لگا رہا تھا۔ ایک
طرح سے ٹائم بم کی الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے اس دوران تین بار باہر پہرہ
دینے والے سنتری سے وقت پوچھا۔ تیسری بار اس نے مجھے گالی دی اور کہا۔

"خبردار جو اب تم نے ٹائم پوچھا ٹائم تو تم ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تم نے کہیں بم چلانا

ہے۔"

دوسری بار اس نے جب ٹائم بتایا تھا تو اس حساب سے بم کے پھٹنے میں آدھا گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ میرے پاس وقت کا حساب رکھنے کے لئے اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بس اندازے لگاتا جا رہا تھا کہ اب پانچ منٹ گزر گئے ہیں۔ اب آدھا گھنٹہ گزرے ہوئے بیس منٹ ہو گئے ہوں گے اور صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ جب میرے حساب بلکہ اندازے کے مطابق بم لگانے کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا یا گزرنے والا تھا تو میں احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے کونے میں جا کر بالکل دیوار کے ساتھ لگ کر اوندھا ہو کر لیٹ گیا اور مزید احتیاط سے کام لیتے ہوئے کمبل کا سرہانہ سا بنا کر اپنے سر کے اوپر رکھ لیا۔

سنتری نے سلاخوں کے پاس آ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ میں ایک آنکھ ذرا کھول کر اسے تک رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کمبل منہ میں ڈال کر دانتوں میں دبا بھی لیا تھا۔ سنتری نے مجھ سے کوئی بات نہ کی اور بدستور ادھر اودھر چل کر پہرہ دینے لگا۔ اتنے میں تھانے کے اندر زور سے گھنٹہ بجا۔ یہ بالکل ایسا گھنٹہ تھا جیسے سکول کے زمانے میں جب پیریڈ ختم ہوتا تو بجا کرتا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ تھانوں میں جب ایک گھنٹہ گزر جاتا ہے تو اسی طرح گھنٹہ بجایا جاتا ہے۔

میں نے اپنا گال زمین پر جو کمبل بچھا ہوا تھا اس کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ میرے اوپر دوسرے کمبل کا سرہانہ تھا۔ اس طرح میرا سر بالکل چھپ گیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اگر سنتری نے ٹھیک وقت بتایا تھا تو اس حساب سے بم کو لگے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ میں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ مجھے سنتری کی آواز آئی۔

"کیوں بے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ابے بولتا-----"

بس میں نے یہیں تک ہی اس کا فقرہ سنا۔ سنتری یہیں تک ہی بول سکا۔ یہ نامکمل جملہ اس کی زندگی کا آخری جملہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری بند آنکھوں کے اندر بجلی

چمک گئی۔ میرا جسم فرش پر سے دو فٹ اوپر اچھل کر ایک طرف کو گرا۔ ایک دھماکہ ہوا تھا جس کی آواز نے جیسے میرے کان بند کر دیئے تھے۔ میرے حلق سے بے قدرتی طور پر ایک چیخ نکل گئی تھی۔ میرے اوپر مٹی اور ملبہ گر رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ میں نے آنکھوں کے آگے آئے ہوئے کمبل کو زور سے پرے ہٹایا۔ مگر کمبل پرے نہ ہٹا۔ میرا سانس گھٹنے لگا تھا۔ میں نے ٹانگیں زور سے ایک طرف ہلائیں۔ میرے اوپر سے مٹی اور لکڑیاں دوسری طرف گرنے لگیں۔ میرا سر مٹی میں دب گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھوں سے مٹی پرے ہٹا کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ میں ملبے کے اندر گردن تک دھنس چکا تھا۔ میں بہت صحت مند تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا میں باڈی بلڈر قسم کا کمانڈو تھا۔ میں نے فوراً تھوڑی سی جدوجہد کر کے اپنے آپ کو ملبے میں سے باہر نکالا اور ادھر ادھر دیکھا۔

جہاں میری کوٹھڑی تھی اور جہاں میں بند تھا وہاں سوائے ملبے کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اٹھ کر ملبے کے ڈھیر کے اوپر سے نیچے چھلانگ لگائی اور ایک طرف کو دوڑا خدا کا شکر ہے کہ میرا جسم سلامت تھا۔ نہ میری کوئی ہڈی ٹوٹی تھی نہ مجھے کوئی چوٹ لگی تھی۔ مجھے دوڑتے ہوئے لوگوں نے بلکہ تھانے کے عملے نے شاید دیکھ لیا تھا۔ اور کسی نے چلا کر کہا۔

"اسے پکڑو۔ اسے پکڑو۔ یہ بھاگ رہا ہے؟"

میرا رخ تھانے کے مین گیٹ کی طرف تھا جہاں پولیس کی دو گاڑیاں الٹی پڑی تھیں۔ صرف ایک گاڑی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میں جتنی طاقت سے اور جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگا۔ مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے دوڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ جیسے ہی میں بے تحاشا بھاگتا ہوا تھانے سے باہر آیا بازار میں سے اس وقت ایک موٹر سائیکل سوار میرے سامنے سے گزرا۔ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے موٹر سائیکل کی رفتار ہلکی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سوار کو دھکا دیا۔ وہ موٹر سائیکل کے ساتھ ہی گرا۔ میں نے جلدی سے موٹر سائیکل اٹھایا۔ وہ ابھی تک چل رہا تھا

اس پر چھلانگ لگا کر بیٹھا اور جس طرف اس کا منہ تھا اس طرف اسے دوڑا دیا۔

میرے پیچھے مجھے کسی جیپ کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ پولیس کی جیپ تھی جو میرے پیچھے آرہی تھی۔ میں ٹریفک کے درمیان لوگوں سے موٹر سائیکل کو بچاتا تیز رفتاری کے ساتھ بازار کی بھیڑ سے نکل کر ایک جگہ پہنچا جہاں سے ایک خالی خالی سڑک بائیں طرف جاتی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو اس سڑک پر ڈالا اور اسے فل سپیڈ پر چھوڑ دیا۔ خدا جانے یہ سڑک کس طرف جاتی تھی اور موٹر سائیکل میں پٹرول کتنا تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو اس علاقے سے بس کسی نہ کسی طرح نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کے ہینڈل کی ایک طرف لگے ہوئے گول شیشے کو دیکھا۔ اس شیشے میں سے سڑک کا پچھلا منظر نظر آتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں پریشان ہوا کہ میرے پیچھے پولیس کی جیپ لگی ہوئی تھی۔ پولیس کی جیپ اپنے رنگ روغن سے صاف پہچانی جاتی تھی۔ اب مجھے ایک اور بات کا خطرہ تھا کہ اگر پیچھے سے پولیس نے فائر کیا تو میں بچ کر نہیں نکل سکوں گا۔ چھوٹی سی سڑک اونچے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں موٹر سائیکل کو سانپ کی طرح سڑک پر لہرا لہرا کر چلانے لگا۔ اس طرح سے توازن بگڑنے لگا۔ موٹر سائیکل کے الٹنے کا خطرہ تھا۔ میں نے اسے سیدھا کر لیا۔ ابھی تک پیچھے سے مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فائر کا دھماکہ ہوا۔ یہ پستول کے فائر کا دھماکہ تھا۔

گولی مجھے یا میری موٹر سائیکل کو نہیں لگی تھی۔ ظاہر ہے قریب سے ہو کر گزر گئی تھی۔ دوڑتے ہوئے ٹارگٹ پر انڈیا کی پولیس کا سپاہی ٹھیک نشانہ نہیں لگا سکتا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی گولی اتفاق ہی سے مجھے لگ سکتی تھی۔ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں سڑک پر لوگ بھی آجا رہے ہوں۔ پھر پولیس مجھ پر اس ڈر سے فائرنگ نہیں کرے گی کہ کہیں گولی کسی دوسرے راہ گیر کو نہ لگ جائے۔ اس دوران پیچھے سے پولیس کی جیپ نے اوپر تلے مجھ پر تین فائر کئے۔ ایک گولی یقیناً موٹر سائیکل کے عقبی مڈگارڈ کو لگی تھی۔ کیونکہ مجھے اپنے پیچھے ایسی آواز سنائی دی جیسے

نے مڈگارڈ پر زور سے ہتھوڑا مارا ہو۔ مگر ٹائر بچ گیا تھا۔

مصیبت یہ تھی کہ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر اچانک ایک طرف سے ایک بہت بڑا ٹرک گڑ گڑ کرتا نکل کر سڑک پر آگیا اور آگے کی طرف چل پڑا۔ میں جلدی سے موٹر سائیکل اس کے آگے لے آیا۔ پولیس کی جیپ مجھ سے کافی پیچھے تھی مگر ذرا آگے گیا تو مجھ پر ایک اور فائر ہوا۔ جیپ نے سائرن بجانا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ آگے مجھے سڑک پر گاڑیاں اور لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے یہ بڑی سڑک تھی جس سڑک پر میں موٹر سائیکل بھگائے لئے جارہا تھا وہ چھوٹی تھی اور آگے جا کر بڑی سڑک کے ساتھ مل گئی۔ پولیس نے بڑی سڑک کی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سائرن بجانا شروع کر دیا تھا۔ بڑی سڑک پر آیا تو پولیس کے سائرن کی آواز سے لوگ اور گاڑیاں ایک طرف ہٹنے لگیں۔ کم بخت سڑک یہاں بھی خالی ہونے لگی تھی۔ پولیس کو فائرنگ کے لئے میدان خالی مل رہا تھا۔ سائرن کی آواز پر لوگ جلدی سے ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ میری موٹر سائیکل فل سپیڈ پر جا رہی تھی۔ آگے کسی دریا کا بہت بڑا پل آگیا۔ جیسے ہی میری موٹر سائیکل پل پر آئی پولیس نے پیچھے سے مجھ پر پستول کے فائر شروع کر دیئے۔ ایک فائر رائفل کا بھی ہوا۔ اس کا دھماکہ سب سے زیادہ تھا۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ اب میرا بچنا مشکل ہے۔ پل لوگوں اور گاڑیوں سے خالی ہو گیا تھا۔ پولیس نے اس طرح فائرنگ شروع کر دی تھی جیسے محاذ پر فوجی مورچے میں بیٹھے دشمن پر فائرنگ کرتے ہیں۔ اچانک میری موٹر سائیکل لڑکھڑائی۔ گولی اس کے پچھلے ٹائر کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ موٹر سائیکل بے قابو ہو گئی۔ میں نے اس پر سے چھلانگ لگائی۔ وہ پل کے فٹ پاتھ پر لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور تک چلا گیا۔ پولیس کی جیپ میری طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھا۔ اور تو کچھ نہ سوجھا۔ میں پل کے آہنی گارڈروں کی قینچی پر چڑھا اور بغیر نیچے دیکھے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

دریا کی سطح کافی نیچے تھی۔ میں قلابازیاں کھاتا ہوا دریا میں جا کر گرا اور ٹھنڈے پانی میں نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا۔ اوپر سے پولیس جہاں میں گرا تھا وہاں گولیاں چلا رہی تھی۔

فائرنگ کی آواز مجھے دریا کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔ دریا میں گرنے کے فوراً
میری کمانڈو کی تمام صلاحیتیں اور سخت کوشی اور سختیوں کو برداشت کرنے کی طاقتیں ا
آئی تھیں۔ میں پانی کے اندر ہی اندر آگے بڑھنے لگا۔ دریا چڑھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن چو
کافی بڑا دریا تھا اس لئے اس کے پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ یہ تیزی بہاؤ مجھے بڑی تیزی
آگے کی طرف لئے جا رہا تھا۔ دریا کی سطح پر سے سر باہر نکالنے پر مجھ پر گولیوں کی بو
پڑ سکتی تھی۔ کیونکہ پولیس پل پر کھڑی برابر فائر کر رہی تھی۔

میں پانی کے اندر ہی اندر جتنی دور تک جا سکتا تھا ہاتھ پاؤں چلاتا نکل گیا۔ دریا کا
میری مدد کر رہا تھا۔ جب میرے سانس نے مزید سینے میں رکنے سے انکار کر دیا تو
ہاتھوں اور ٹانگوں کو سیدھا ہو کر چلاتا اوپر کی طرف آیا۔ میں نے اپنا سر باہر نکال کر ا
لمبا سانس لیا اور دوبارہ پانی کے اندر غوطہ لگا گیا۔ اب مجھے گولیاں چلنے کی آواز نہیں آ
تھی۔ شاید پولیس مجھے دریا کے آگے کسی جگہ کنارے پر پکڑنے کا انتظام کر رہی تھی۔
دور تک میں پانی کے اندر ہی اندر بڑھتا چلا گیا۔ جہاں سانس رکتا سر باہر نکال کر لم
سانس لے لیتا اور پھر دریا میں غوطہ لگا جاتا۔

آپ ہوشنگ آباد میں میری کمانڈو ٹریننگ کے دوران پڑھ چکے ہیں کہ میرے انسٹ
اور استاد کمانڈو مجاہد نے مجھے پانی میں تیرنے اور پانی کے اندر زیادہ سے زیادہ دیر تک
رہنے کی زبردست تربیت دی تھی۔ میں عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک سانس
روک سکتا تھا۔ پانی کے اندر مجھے سردی کا بھی زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اگرچہ آ
میں یہ سردیوں کا موسم تھا اور جب میں دریا میں گرا تھا تو مجھے پانی بے حد ٹھنڈا لگا
لیکن پانی میں غوطہ لگانے کے بعد اس کی شدید ٹھنڈک ختم ہو گئی تھی۔

آخر ایک جگہ میں اپنے آپ کو دریا کی سطح پر لے آیا۔ میں نے دونوں بازو
ٹانگیں چلاتے ہوئے گھوم کر پیچھے پل کی طرف دیکھا تو حیران ہوا۔ کیونکہ میں پل سے
آگے نکل آیا تھا۔ پل پر مجھے لوگ دور سے کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں نے دریا
کناروں کی طرف دیکھا۔ یہ جمنا کا دریا تھا اور اس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ حالانکہ سر

کے موسم کی وجہ سے دریا کا پانی اترا ہوا تھا اور کئی جگہوں پر مجھے ریت ابھری ہوئی نظر
آ رہی تھی۔ مگر میں نے دریا کے عین وسط میں چھلانگ لگائی تھی جہاں دریا کا پانی کافی تھا
اور پاٹ بھی چوڑا تھا اور اس کا بہاؤ بھی تیز تھا۔ جیکٹ اور پتلون کی وجہ سے میں پوری
آسانی سے نہیں تیر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اپنی کمانڈو ٹریننگ اور بہترین تیراک ہونے کی
وجہ سے میں آگے ہی آگے تیرتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس طرح تیر رہا تھا کہ میری ٹانگیں پانی
کے اندر مینڈک کی طرح قینچی کی مانند کھلتی اور بند ہو رہی تھیں۔ صرف دریا کے اوپر
میرے بازو بڑے سکون کے ساتھ چل رہے تھے۔

میں نے تیرتے تیرتے تھوڑا سا رخ بائیں جانب والے کنارے کی طرف موڑ لیا۔
میں کنارے کے قریب ہونے لگا۔ میں دریا میں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ دریا کی سطح پر
پانی سرد تھا جس سے میرا جسم برف ہونے لگا تھا۔ میں تیرتے تیرتے دور کافی آگے جا کر
کنارے پر آ گیا۔ یہاں اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ یہ دریائی سرکنڈے تھے۔ میں ان کے
درمیان پانی میں چلتا جا رہا تھا۔ دریا کا کنارا اونچا تھا۔ میں جھاڑیوں کو پکڑ کر کنارے پر چڑھ
گیا۔ میں اوپر آتے ہی بیٹھ گیا اور آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ کھیت ہی کھیت تھے جن
کے درمیان دلدلی میدان بھی تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ میں نے دائیں
جانب نگاہ کی تو میری آنکھیں دیکھتی ہی رہ گئیں۔ دائیں جانب دور تاج محل کی حسین
تاریخی عمارت نظر آ رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تاج محل کے گنبد اور میناروں کے
اوپر کے حصے چمک رہے تھے۔

مگر اس وقت میں تاج محل کی سیر نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس علاقے
سے اتنی دور نکل جانا تھا کہ پولیس آسانی سے مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ دریا کے جس پل پر
سے میں نے چھلانگ لگائی تھی مجھے اتنا یاد ہے کہ اس کے نیچے سے ریل بھی گزرتی تھی۔
اس کا مطلب تھا کہ ریلوے سٹیشن آگے مشرق کی جانب تھا۔ لیکن میں اس وقت کسی بھی
سٹیشن پر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس نے ضرور دریا کے دونوں کناروں پر
آباد شہروں اور قصبوں کی پولیس کو خبردار کر دیا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ پولیس دریا کے

دونوں کناروں پر میری تلاش میں نکل بھی آئی ہو۔

میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی میں نے
سے پہلے تو جیکٹ اور قمیض اتار کر نچوڑی۔ انہیں دوبارا پہنا۔ پتلون کی جیبوں کو الٹ
نچوڑا۔ ڈبی کو کھول کر دیکھا۔ میری ڈبی میں پانچ چیونگ گم والے ٹائم بم رہ گئے تھے۔
ڈبی کے اندر چلا گیا تھا۔ میں نے ڈبی میں سے پانی نکال کر بموں کو جیب میں رکھ لیا۔
کے بعد اٹھا اور دریا کے کنارے کو چھوڑ کر شمال مشرق کی طرف گھاس کے میدان میں
چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پہلو میں
ایک چھوٹی ندی بہہ رہی تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ آسمان پر کہیں کہیں
بادل بھی تھے اور سورج بھی نکلا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی مگر چلتے رہنے سے مجھے سردی
نہیں لگ رہی تھی۔ ویسے بھی میں ایک سخت جان کمانڈو تھا اور مجھے سردی گرمی کا احساس
کم ہوتا تھا۔ ندی کے ساتھ میں ایک طرف گھوما تو درختوں اور اونچی اونچی جھاڑیوں
پیچھے مجھے ایک ریل گاڑی کھڑی دکھائی دی۔

جھاڑیوں کے قریب جا کر غور سے دیکھا تو یہ ایک مال گاڑی تھی۔ آگے ریل کی پٹڑی
پر مزدور کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے گاڑی کھڑی ہو گئی تھی۔ مال گاڑی کا رخ اح
آباد آگرہ کی بجائے دلی کی طرف تھا۔ کم از کم میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے
اگر میں اس مال گاڑی پر سوار ہو جاؤں تو کم از کم اس علاقے سے ضرور دور ہو جاؤں
جہاں چاروں طرف پولیس میری تلاش میں نکلی ہوئی تھی۔ مال گاڑی کھڑی تھی۔ مگر
کسی بھی وقت چل سکتی تھی۔ کافی آگے لگے ہوئے انجن میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں
نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ وہاں سوائے ریل کی پٹڑی پر کام کرتے مزدوروں
اور کوئی نہیں تھا اور یہ مزدور بھی مال گاری کے کافی ڈبے چھوڑ کر انجن کے قریب کام
لگے تھے۔ میں نے تیز تیز چلتے ہوئے پیچھے سے ریلوے لائن پار کی اور مال گاڑی
دوسری طرف آگیا۔ مال گاڑی کے ڈبوں کے لوہے کے دروازے بند تھے۔ میں ان ڈبوں
کے بالکل قریب ہو کر آگے جا رہا تھا۔ میں کسی ایسے ڈبے کی تلاش میں تھا جس کا دروا

کھلا ہو۔

آخر مجھے ایک ڈبہ مل گیا۔ اس ڈبے کا آدھا دروازہ کھلا تھا۔ آگے رسے بندھے
ہوئے تھے اور ان رسوں میں سے تین چار گائیوں کے منہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ یہ مویشی
لے جانے والا ڈبہ تھا۔ اچانک انجن نے سیٹی دی۔ مال گاڑی کے پہیوں میں سے عجیب سی
آوازیں نکلیں اور وہ چل پڑی۔ میں دوڑ کر مویشیوں والے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ یہ چار
گائیں تھیں جن کے پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ ڈبے میں ایسی ہی بو پھیلی تھی جیسی
مویشیوں کے باڑے میں پھیلی ہوتی ہے۔ میں کونے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ مال
گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ مال گاڑی
آگے جا کر کسی سٹیشن پر کھڑی بھی ہوئی تو کم از کم پولیس اس گاڑی میں مجھے تلاش کرنے
کی کوشش نہیں کرے گی۔ میں نے ایک طرح سے اپنے آپ کو کیموفلاج کر لیا تھا۔ ٹرین
آہستہ آہستہ سپیڈ پکڑ رہی تھی۔ مجھے گائیوں کی ٹانگوں میں سے باہر کے درخت پیچھے جاتے
کچھ کچھ نظر آ رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر یہ گاڑی دلی کی طرف جا رہی ہے تو میں اس
سے دو ایک سٹیشن پہلے ہی اتر جاؤں گا۔ کیونکہ دلی سٹیشن پر میرے پکڑے جانے کا خطرہ
تھا۔

مال گاڑی کے ڈبے میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔
یہاں سردی بہت کم تھی۔ اب میرے کپڑے بھی کافی سوکھ گئے تھے۔ مال گاڑی
ایک خاص رفتار ہوتی ہے مگر یہ مال گاڑی کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ اس
کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن مجھے خوشی ضرور ہو رہی تھی کہ میں آگرہ
سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے سٹیشن آئے۔ مال گاڑی کہیں
بھی کھڑی نہ ہوئی۔ مال گاڑیوں میں چونکہ بڑے بڑے شہروں کا مال لدا ہوتا ہے اس
عام طور پر وہ بڑے شہروں کے سٹیشنوں پر ہی رکتی ہیں اور ان کے پلیٹ فارم بھی ریلوے
یارڈ میں الگ بنے ہوتے ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ مال گاڑی آگرہ سے فیروز آباد
سے ہوتی ہوئی اوپر کان پور جانے کی بجائے نیچے انڈیا کے جنوب کی جانب باندہ نام کے
کی طرف جا رہی ہے۔ اس مال گاڑی نے شاید کہیں نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔
سے چلی تھی کہیں نہیں رکی تھی۔ یہاں تک کہ فیروز آباد اور اٹاوہ ایسے بڑے شہروں
بھی نہیں ٹھہری اور ریلوے یارڈ کی الگ لائن پر تیزی سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی
خدا جانے اس میں کس قسم کا سامان لدا ہوا تھا کہ جسے باندہ شہر میں پہنچانا ضروری تھا۔
دن مال گاڑی چلتی رہی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا کہ کہیں جا کر اس کی رفتار ہلکی ہو
گئی۔ سارا دن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو بار ایک گائے کا دودھ پی کر میں نے
پیاس بجھائی تھی۔ میں نے دروازے کے آگے لگے ہوئے رسے میں سے سر باہر نکا
سامنے کی جانب دیکھا۔ کوئی سٹیشن آگے تھا۔ وہاں مال گاڑی کھڑی ہو گئی۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ ریلوے ٹریک کے ساتھ کچھ دور تک آگے گیا۔
سٹیشن پر ایک دھندلا سا بلب جل رہا تھا۔ میں یہاں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خدا جانے کون
سا سٹیشن تھا۔ ابھی تک میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ ٹرین دلی کی طرف جا رہی ہے لیکن یہ
خیال ذہن میں ضرور آتا تھا کہ آگرہ سے دلی اتنی دور نہیں ہے۔ دوسرے راستہ اتنا
ویران نہیں ہے جن ویران راستوں سے یہ مال گاڑی سارا دن گزرتی رہی تھی۔ دوپہر
کے بعد دور دور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی نظر آنے لگی تھیں جب کہ آگرہ اور دلی کے
درمیان کا علاقہ میدانی ہے۔ وہاں کوئی پہاڑیاں نہیں ہیں۔ صرف ایک بات کی مجھے تسلی
ضرور ہو رہی تھی کہ میں آگرہ کی پولیس سے دور ہو گیا ہوں۔ اگر یہ ٹرین انڈیا کے مشرقی
شہروں کی طرف بھی جا رہی ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے دلی پہنچ سکتا تھا۔ میرے
پاس رضوانہ کے دیئے ہوئے کچھ روپے موجود تھے۔

مال گاڑی کا انجن شاید پانی لے رہا تھا۔ میں مویشیوں والے ڈبے میں بیٹھا بیٹھا تنگ
آ گیا تھا۔ میں نے سوچا مال گاڑی کا کوئی دوسرا خالی ڈبہ تلاش کرنا چاہیئے۔ چلتے چلتے میں
سٹیشن کے پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گیا۔ میں زیادہ آگے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ
پلیٹ فارم پر مجھے ٹرین کا گارڈ اور انجن ڈرائیور کے علاوہ دو تین آدمی نظر آ رہے تھے۔
میں واپس ہو گیا اور ایک ایک ڈبے کو شام کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے میں غور سے دیکھنے
لگا کہ کہیں کوئی ڈبہ تھوڑا سا کھلا ہوا مل جائے۔ ایک ڈبے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس
کی دونوں جانب دروازے کے باہر لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ میں ایک زنجیر کو پکڑ
کر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ اس ڈبے میں کونے کی طرف بڑے بڑے بورے اور لکڑی
کے کریٹ لگے ہوئے تھے۔ یہاں مویشیوں والی گندی فضا نہیں تھی۔ مجھے یہ جگہ اچھی
لگی۔ میں ایک کریٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دل میں یہی فیصلہ کیا کہ اب رات کو آگے
جو بھی سٹیشن آئے گا اور اگر ٹرین وہاں کھڑی ہوئی یا اس کی رفتار ذرا ہلکی بھی ہوئی تو میں
اتر جاؤں گا۔

گائے کا دودھ میں نے سیر ہو کر پیا تھا۔ مجھے بھوک پیاس بالکل نہیں تھی۔ ویسے بھی

میں سخت جان تھا اور مجھے بھوکے پیاسے رہنے کی ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ مجھے بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لوگ باتیں کر ایک دوسرے کو آوازیں دیتے میرے ڈبے کی طرف آرہے تھے۔ باہر نکلنے کا موقع نہ تھا۔ آوازیں میرے ڈبے کے باہر آگئیں۔ معلوم ہوا کہ میرے والے ڈبے میں سامان چڑھایا جا رہا ہے۔ میں اٹھا اور بڑے بڑے بوروں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ دو مزدور ڈبے میں چڑھ آئے۔ وہ باہر سے سامان پکڑ پکڑ کر اندر لگانے لگے۔ میں خاموش رہا۔ وہ لوگ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھے بھی وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ کچھ دیر بعد ج وہ سامان ڈبے میں رکھ چکے تو باہر نکل گئے۔ باہر نکلنے کے بعد انہوں نے یہ ظلم کیا کہ ڈ کالوہے کا دروازہ بند کر کے باہر سے اس میں سلاخ لگا دی جس سے میں ڈبے کو اندر سے کھول نہیں سکتا تھا۔ ڈبے میں ایک دم اندھیرا ہو گیا۔

میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ لوہے کا تھا۔ اس میں درازیں ضرور تھ مگر باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے باتیں کرتے پلیٹ فارم کی طرف جا رہے تھے۔ میں ایک طرح سے مال گاڑی کے ڈبے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اسی جگہ ڈبے سے باہر نکل سکتا تھا جہاں کوئی باہر سے درواز کھولے گا۔ اندھیرے میں مجھے تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا۔ جو سامان انہوں نے لگایا تھا لکڑی کے کھوکھے تھے جو بند تھے۔ کچھ فرنیچر تھا جس کو رسیوں سے باندھا گیا تھا اتنے ٹرین کو دھچکا لگا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا اور وہیں نئے سامان والے کھوکھوں کے بیٹھ گیا۔ یہ مال گاڑی پہلے بھی رن تھرو آرہی تھی۔ اب کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب اور کہا جا کر رکتی ہے۔

چونکہ میں سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لئے صبر کر کے بیٹھا ر ٹرین کافی دور تک آہستہ آہستہ چلتی رہی اس کے بعد اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ بند ڈ ایک ہی فائدہ تھا کہ باہر سردی تھی مگر ڈبے کے اندر سردی نہیں لگ رہی تھی۔ مال گا خدا جانے کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات کو سونے کے لئے کوئی

بنانی چاہئے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ ٹرین اتنی جلدی رکنے والی نہیں ہے۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر لکڑی کے کھوکھوں کو ایک دوسرے کے برابر کر کے وہاں اتنی جگہ بنالی کہ میں ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ سکتا تھا۔ میں اسی طرح لیٹ گیا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ میں ہوائی مخلوق چندریکا اور پھر میناکشی اور رضوانہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اپنے کمانڈو مشن کا خیال آرہا تھا۔ میں اس طرح دربدر پھرنے کے لئے انڈیا میں نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک زبردست مشن کامیابی کے ساتھ مکمل کیا تھا۔ اب مجھے کشمیر کے محاذ پر یا پاکستان دشمن بھارتی خفیہ تنظیم را کے ایجنٹوں کا سراغ لگا کر ان پر حملہ آور ہونا تھا تاکہ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں تخریبی کارروائیاں نہ کر سکیں۔

اس طرح سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا میں چلا جا رہا ہوں۔ میرے چاروں طرف ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے ہی ٹیلے ہیں۔ آسمان پر سے سورج آگ برسا رہا ہے۔ پیاس کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ جلتی ریت میرے ننگے پیروں کو جلا رہی ہے۔ میں بمشکل رینگ رینگ کر چل رہا ہوں۔ لگتا ہے موت کے قریب ہو رہا ہوں اور کسی لمحے مجھے موت آکر دبوچ لے گی۔ میں پیاس اور صحرا کی جھلستی ہوئی تپش سے نڈھال ہو کر ایک جگہ گرم ریت پر گر پڑتا ہوں۔ میرے خشک ہونٹ پتھر کی طرح ہو گئے ہیں۔ میری آنکھیں بند ہیں۔ میں موت کو گلے لگانے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ کیونکہ موت ہی مجھے اس اذیت سے نجات دلا سکتی تھی۔ اتنے میں مجھے اپنے ہونٹوں پر پانی کے ٹھنڈے قطروں کے گرنے کا احساس ہوتا ہے۔ میں بے ہوشی کے عالم میں سوچتا ہوں کہ میں مر چکا ہوں۔ خدا نے میرے گناہ بخش دیئے ہیں اور میں جنت میں آگیا ہوں۔

پانی کے ٹھنڈے قطرے میرے خشک ہونٹوں میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ میری آنکھیں بند ہیں۔ میں آنکھیں کھولنا چاہتا ہوں لیکن کھول نہیں سکتا۔ پھر میرے جھلسے ہوئے بدن کو اس قسم کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے اوپر بارش میں بھیگے ہوئے کیلے کے پتوں کا سایہ ڈال دیا ہو۔ میں آنکھیں کھولنے کی بڑی کوشش کرتا

ہوں مگر کوشش کے باوجود آنکھیں نہیں کھل رہیں پھر مجھے اچانک ایک خوشبو محسوس
ہوتی ہے۔ صحرا کی تپش بالکل نہیں رہی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میرے جسم کو چھو رہی ہے
اس ہوا میں ایسی خوشبو ہے کہ جو میں نے آج تک نہیں محسوس کی تھی۔ میرے ہونٹوں
پر کچھ اور قطرے گرتے ہیں۔ یہ قطرے ٹھنڈے اور میٹھے ہیں۔ ایسی ٹھنڈک اور مٹھاس
مجھے زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یہ گویا جنت کے باغات کا شہد ہے۔ یہ
میرے پیاسے بدن میں توانائی بن کر سرائیت کر رہا ہے۔ میری پیاس اور تھکن سب
ہو چکی ہے۔ میں اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں۔

میں آواز دیتا ہوں۔

"یا اللہ! تو غفور الرحیم ہے۔ تو بخشن ہار ہے۔ تو نے مجھے بخش دیا میں تیرا ناچیز
ہوں۔ میں تیرا کیسے شکر ادا کروں۔"

مجھے اپنی آنکھوں پر کسی کی انگلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے کسی نے میری آنکھوں
اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ یہ انگلیاں پھولوں کی ڈالیوں کی طرح ہیں۔ ان انگلیوں سے روح
وجد میں لانے والی خوشبوئیں پھوٹ رہی ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مجھ
پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں رونے لگتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں مال گاڑی کے ڈبے میں لکڑی کے کھوکھوں پر ٹانگیں سکیڑے ویسے ہی پڑا
ریل کی پٹڑیوں کی کھٹاک کھٹاک کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پہلے تو مجھے احساس تک
ہوا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ میں ابھی تک خواب کی دنیا میں ہی تھا۔ پھر آہ
آہستہ میں خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے لگا۔ کس قدر روح کو
دینے والا خواب تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں کہ شاید واپس خواب کی دنیا میں
جاؤں۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو آنسوؤں کے قطرے میری آنکھوں کے کناروں
سے بہہ گئے۔ میں خواب میں بھی رو رہا تھا۔ یہ آنسو حقیقت کی دنیا میں آنے کے بعد
میری آنکھوں میں اسی طرح قائم تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ آنکھوں کے ساتھ لگا

شریف پڑھ کر چوم لیا۔

میں اٹھ کر دو زانو ہو کر کھوکھوں پر بیٹھ گیا۔ پھر ایک دم سے خدا کے حضور سجدے
میں گر پڑا اور دیر تک رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ جب میرے دل
کو تھوڑا سکون ہوا اور میں حقیقت کی دنیا میں پورے حواس کے ساتھ واپس آگیا تو اٹھ کر
ڈبے کے دروازے کی درزوں میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا باہر سوائے
اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ خواب
کی روحانی کیفیت ابھی تک میرے دل اور دماغ پر طاری تھی۔ میں دوبارا سکڑ کر لیٹ گیا
اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر میں اس خواب کی دنیا میں دوبارہ داخل نہ ہو سکا۔ مجھے نیند
ضرور آگئی مگر پھر کوئی خواب نہ آیا۔

اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو ڈبے کے دروازے کی درزوں میں سے دن کی روشنی
اندر آرہی تھی۔ ٹرین اسی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ سے باہر دیکھا۔
ٹرین کھیتوں میں گزر رہی تھی اور درز میں سے سرد ہوا اندر آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ
دھوپ کہیں بھی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میدان بھی گزر
رہے تھے۔ کھیت بھی گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں آبادیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ دور دور
پہاڑیاں بھی تھیں۔ ٹرین کی رفتار بھی خدا خدا کر کے ہلکی ہو رہی تھی۔ کوئی شہر آرہا تھا۔
ٹرین کو یہاں رکنا تھا۔ میرے لئے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ٹرین کے رکنے کے بعد
سٹیشن کے عملے نے آکر باہر سے ڈبے کے دروازے کو کھولنا تھا اور اب میں ان سے
چھپ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ انہیں کہہ دوں گا میں پچھلے سٹیشن پر اتفاق سے
اس ڈبے پر چڑھ گیا تھا۔ اور سو گیا۔ اب آنکھ کھلی تو ٹرین یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ میں جانتا
تھا کہ وہ لوگ مجھے زیادہ پریشان نہیں کریں گے کیونکہ میں نے کوئی سامان وغیرہ چوری
نہیں کیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار کر لیا
ٹرین کی رفتار مزید ہلکی ہو گئی۔

میں دروازے کے ساتھ لگا برابر باہر دیکھ رہا تھا۔ ٹرین ایک پل پر سے گزر رہی تھی۔

نیچے مجھے بیل گاڑیوں کے علاوہ ایک دو موٹر کاریں اور رکشے بھی چلتے نظر آئے۔ لگتا تھا کوئی اچھا خاصہ شہر ہے۔ اتنا بڑا شہر میرے لئے مشکل بھی پیدا کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے ہر سٹیشنوں پر پولیس بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ اتنی دور تک اگر پولیس نے میرے بارے میں ریلوے پولیس کو خبردار کیا ہوگا۔ اس بات کا مجھے پورا یقین تھا کہ یہ دلی شہر نہیں ہے۔ کیونکہ دلی آگرہ سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت ہرگز نہیں تھا۔ مال گاڑی ریلوے یارڈ میں سے گزرتی رہی ایک خالی خالی پلیٹ فارم کر رک گئی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر دروازے کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے لگا۔ دو آدمی باتیں کرتے پچھلے ڈبوں سے چلے آرہے تھے۔ میں جلدی سے کھوکھوں کے آگیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر آدمی اندر آئے تو میں انہیں دیکھ کر کیا کہوں وہ کیا کہیں گے۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر ہتھوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ دروازے سلاخ دوسری طرف ہٹائی جا رہی تھی۔ سلاخ ہٹ گئی۔ کسی نے زور سے دروازے ایک طرف دھکیل دیا۔ کوئی اندر آنے ہی والا تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی۔

"ابے ادھر ابھی کہاں سے گھس رہے ہو پہلے اگلی بوگیوں کا سامان تو باہر نکالو"

اور میں نے محسوس کیا کہ جس آدمی نے دروازے کو کھولا تھا وہ کچھ بولتا ہوا آگے نکل گیا ہے۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ قفس کا دروازہ کھل چکا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی میں دبے پاؤں چلتا کھلے دروازے کے پاس آیا۔ ذرا سا سر باہر نکال کر دیکھا۔ تین مزدور قسم کے آدمی جنہوں نے ریلوے کی نیلی وردی پہنی ہوئی تھی آگے کو جا رہے تھے۔ نے دوسری طرف دیکھا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں جلدی سے نیچے اتر گیا۔

اترتے ہی خدا کا شکر ادا کیا۔ جیکٹ کے بٹن بند کرتا ہوا خالی پلیٹ فارم پر پیچھے جانب چلنے لگا۔ پلیٹ فارم سے اتر کر میں ریلوے لائن پر آیا۔ یہاں مال گاڑی کے ڈ ختم ہو جاتے تھے۔ بائیں جانب نگاہ ڈالی تو سامنے ریلوے یارڈ کی دیوار تھی۔ دیوار دوسری جانب کوئی سڑک تھی جہاں سے ٹریفک کے گزرنے کی آواز سنائی دے رہی

سڑک کی دوسری جانب دو چار مکان تھے۔ میں ریل کی پٹڑیوں پر سے گزر کر دیوار کے پاس آگیا۔ یہاں ایک جگہ بجلی کا کھمبا باہر سڑک کی جانب لگا تھا۔ میں نے کھمبے کو پکڑا اور سڑک پر آگیا۔

میرا جدھر منہ اٹھا میں ادھر ہی کو چل پڑا۔ ایک چوک میں پہنچ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی چائے کی دکان تھی۔ میں دکان کے اندر آکر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک لڑکے نے آکر پوچھا کہ میں کھانا کھاؤں گا یا چائے پیوں گا۔ میں نے کہا

"کھانے میں کیا کیا پکا ہے؟"

اس نے کچھ سبزی ترکاری بتائی۔ میں نے کہا لے آؤ۔ لڑکا چلا گیا۔ میں کسی سے یہ ابھی نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ میں نے دکان کی دیواروں کو دیکھا کہ شاید وہاں کسی کیلنڈر پر اس شہر کا نام لکھا ہو۔ مگر کسی کیلنڈر پر شہر کا نام نہیں تھا۔ میں نے بڑے سکون کے ساتھ کھانا کھایا۔ چائے منگوا کر پی۔ بل ادا کیا اور باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے دکان کے باہر لگے بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ وہاں لکھا تھا۔

شاہ جہاں ہوٹل۔ ریل بازار۔ باندہ

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ مال گاڑی نے مجھے دلی کی بجائے باندہ پہنچا دیا تھا جو وسطی انڈیا کے مشرق کی جانب ایک مشہور شہر تھا۔ اس طرف سے گاڑیاں صوبہ بہار بنگال اور نیچے مدراس وغیرہ شہروں کی طرف جاتی تھیں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ سٹیشن پر چل کر معلوم کرنا چاہئے کہ یہاں سے دلی کی طرف گاڑی کب جاتی ہے۔ میں ریلوے لائن والی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ آگے ریلوے سٹیشن کی عمارت آگئی۔ یہ سٹیشن نہ چھوٹا تھا نہ بس درمیانہ درجے کا تھا۔ سٹیشن کے باہر تانگے اور رکشے کھڑے تھے۔ میں نے سواری آفس کی کھڑکی پر جا کر پوچھا کہ دلی کو گاڑی کس وقت جائے گی۔ کھڑکی کے پیچھے ایک سانولا سا دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا۔ بڑی بے زاری سے بولا۔

"یہاں سے پہلے کانپور جاؤ۔ وہاں سے تمہیں الہ آباد سے آنے والی گاڑی دلی لے جائے گی"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کانپور کو گاڑی کب جائے گی"

اس نے اور زیادہ بے زاری سے جواب دیا۔

"رات کو اڑھائی بجے جائے گی"

میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مجھے رات کے اڑھائی بجے
اسی شہر میں رہ کر کانپور جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا ہو گا۔ سٹیشن پر ٹھہرنا ٹھیک نہیں
ویسے بھی ابھی رات کے اڑھائی بجنے میں کئی گھنٹے رہتے تھے۔ باندہ شہر میرے لئے
تھا۔ اس طرف میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میرے پاس رقم کافی تھی۔ میں نے سوچا کہ پہلے
کے کسی اونچے درجے کے ریستوران میں چل کر بیٹھتا ہوں۔ وہاں کسی کو مجھ پر شک
نہیں پڑے گا۔ شہر میں ادھر ادھر پھرنے سے کسی کو بھی مجھ پر شک پڑ سکتا تھا۔ ریلو
سٹیشن پر پولیس ہر وقت موجود رہتی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے باہر آ کر ایک تانگہ لیا اور کوچوان سے کہا۔

"کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلو جہاں اچھا کھانا وغیرہ ملتا ہو"

ہوٹل میں نے اس لئے کہا تھا کہ شاید ریستوران اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ
شہر کی مختلف سڑکوں پر گھماتا ہوا شہر کی ایک بڑی سڑک کے کنارے واقع ایک ہوٹل
گیٹ پر لے آیا جس کا نام الیگزانڈریہ ہوٹل تھا۔ یہ واقعی ہوٹل تھا۔ یعنی یہاں ر
کے لئے کمرے بھی مل جاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ایک کمرہ ہی کرا
لے لوں۔ بڑی تنہائی میں وقت گزر جائے گا۔ آدھی رات کو نکل جاؤں گا۔ کاؤنٹر
ساڑھی پوش کٹے بالوں والی قبول صورت لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"مجھے ایک کمرہ چاہئے"

وہ مسکرائی کہنے لگی۔

"آپ اکیلے ہی کمرے میں رہیں گے؟"

میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

"اکیلا ہوں اس لئے اکیلا ہی رہوں گا۔ اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا تو وہ بھی ضرور
میرے ساتھ ہی رہتا۔"

وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"ایک سنگل بیڈ کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ پچاس روپے ہو گا۔"

اس زمانے میں یہ کرایہ بہت زیادہ تھا۔ مگر میری مجبوری تھی۔ میں نے کمرہ لے لیا۔
میں نے وہاں اپنا ہندوانہ نام کمل کمار لکھوایا اور ایڈریس بھی دلی کا غلط سلط لکھوا دیا۔
پچاس روپے ادا کئے۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے گھنٹی بجا کر نوکر کو طلب کیا۔ اس کو میرے
کمرے کی چابی دی اور کہا۔

"صاحب کو سولہ نمبر کمرے میں لے جاؤ"

یہ ہوٹل پرانی وضع کا انگریزی ٹائپ کا تھا جس طرح کبھی ہمارے شہر لاہور میں
یڈرروز اور بار گنزا ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ اس کی دوسری منزل نہیں تھی۔ لگتا تھا دو
تین پرانی کوٹھیوں کو ملا کر ایک ہوٹل بنا دیا گیا ہے۔ آگے وسیع باغیچہ تھا۔ کمروں کے آگے
آمدے بھی تھے۔ لڑکا مجھے سولہ نمبر کمرے میں چھوڑ کر سلام کر کے چلا گیا۔ کمرے میں
وکٹورین طرز کا پرانا صوفہ اور پلنگ بچھا تھا۔ دروازے اور کھڑکی پر بھاری پردے گرے
ہوئے تھے۔ عجیب بات ہے کہ وہاں ٹیلی فون بھی لگا ہوا تھا۔ ساتھ باتھ روم بھی تھا۔
سردی کی وجہ سے لڑکے نے جاتے ہوئے بجلی کا ہیٹر بھی آن کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ
اب نہا دھو بھی لینا چاہئے شاید پھر یہ موقع نہ ملے۔ میں غسل خانے میں گھس گیا۔ اچھی
طرح سے نہایا۔ وہی کپڑے دوبارہ پہن لئے۔ دوسرے کوئی کپڑے میرے پاس نہیں تھے۔

تھوڑی دیر میں وہی لڑکا آ گیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب کھانا لاؤں یا کچھ اور"

میں نے کہا۔

"کچھ اور کیا؟"

وہ ذرا ہنس کر بولا۔

"صاحب وسکی وغیرہ؟"

میں نے کہا۔

"نہیں بھائی میں شراب وغیرہ نہیں پیتا تم ایسا کرو۔ یہ پیسے لو۔ میرے لئے فلیک کا ایک پیکٹ اور ایک ماچس لے آؤ اور چائے پہلے بھجوا دو۔"

میں نے اسے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میرے پاس ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں تھے۔ یہ …پے کا ایک نوٹ تھا جو میں نے کاؤنٹر پر لڑکی کو دے دیا تھا۔ لڑکا چلا گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک لڑکی کی آ… آئی۔

"سر! رات کے کھانے پر آپ کوئی خاص چیز کھانا پسند کریں گے؟"

میں نے کہا۔

"آپ کے ہاں جو کچھ تیار ہوتا ہے وہی کھالوں گا۔ شکریہ!"

یہ کاؤنٹر والی لڑکی ہی تھی۔ اس نے اوکے سر کہہ کر فون بند کر دیا۔ ملازم لڑکا میر… لئے چائے لے کر آگیا۔ وہ سگریٹ بھی لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ روپے ٹپ دیئے تو وہ خوش ہوا۔ اس کے دل میں میرے لئے شاید ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگ…

"صاحب آپ کس شہر سے آئے ہیں؟"

میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو بھائی؟"

وہ میرے قریب آگیا۔ بڑی رازداری کے انداز میں بولا۔

"صاحب! ہمارے ہوٹل میں ایک خفیہ پولیس کا آدمی ہر وقت موجود رہتا ہے… مس شیلا سے آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ یہ آدمی کون ہے اس کا نام کیا ہے… کہاں سے آیا ہے"

خفیہ پولیس کا نام سن کر میں خبردار ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"بھائی یہ تو ان کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ جو کوئی ہوٹل میں نیا مسافر آئے اس کے…

…یں پوچھ گچھ کریں۔"

لڑکا مزید رازداری کے انداز میں بولا۔

"نہیں صاحب وہ تو ٹھیک ہے لیکن خفیہ پولیس والا آپ کے بارے میں مس شیلا …ے کہہ رہا تھا کہ یہ آدمی مجھے کوئی جاسوس لگتا ہے سر کیا واقعی آپ جاسوس ہیں؟ مجھے …یہاں سے اپنے ساتھ لے جائیں صاحب۔ مجھے جاسوس بننے کا بڑا شوق ہے۔"

میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی۔ اس خفیہ پولیس والے کو کیسے شک پڑ گیا کہ میں جاسوس ہوں۔ اگر اس نے مجھے جاسوس سمجھا ہے تو یقیناً پاکستانی جاسوس ہی سمجھا ہو گا۔ کیونکہ انڈیا میں جو کسی بھی ملک کا جاسوس پکڑا جائے پولیس یہی سمجھتی ہے کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے بلکہ اب تو انڈیا میں وہاں کے مسلمان ہیں پولیس ان میں سے ہر تیسرے آدمی کو پاکستان کا جاسوس سمجھتی ہے۔ میں نے لڑکے کو جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا …ور کہا۔

"دیکھو! کسی کو بتانا مت۔ خفیہ پولیس والے کی نگرانی کرو۔ دیکھتے رہو کہ وہ کیا کرتا …اور مس شیلا سے کیا باتیں کرتا ہے۔ یہ مس شیلا کون ہے؟"

لڑکا دس روپے کا نوٹ لے کر بڑا خوش ہوا۔ زیادہ خوشی اسے اس بات کی ہوئی کہ …نے اسے جاسوسی کی ڈیوٹی پر لگایا تھا۔ اس نے نوٹ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھا اور …کر بولا۔

"صاحب! یہ مس شیلا کاؤنٹر والی لڑکی ہے بڑی بدمعاش ہے۔ رات کو اس کے …رے میں شہر کے بدمعاش آتے ہیں۔ صاحب! یہ رات کو شراب بھی پیتی ہے۔ میں اس …ساری خبر رکھتا ہوں۔ مجھے جاسوسی کا شوق جو ہے۔"

میں نے اسے مزید اعتماد میں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میاں میرا نام ہے صاحب۔ یہاں ہوٹل میں سب لوگ مجھے بلے میاں کہتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

"اگر تم نے خفیہ پولیس والے کی اچھی طرح سے جاسوسی کی اور اس کی ساری با
آ کر مجھے بتا دیں تو میں تمہیں اور بھی انعام دوں گا اور سنو۔ کسی کو ہرگز پتہ نہ چلے
میں نے تمہاری یہ ڈیوٹی لگائی ہے۔"

محمود میاں نے تجربہ کار جاسوس کی طرح آنکھیں ذرا سی سکیٹر کر کہا۔

"صاحب جی! میں نے بڑے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ کیا مجال کہ کوئی میرے د
حال معلوم کر سکے۔ اچھا سر۔ میں جاتا ہوں۔"

لڑکے کی ڈیوٹی میں نے ضرور لگا دی تھی لیکن میں خود بھی محتاط ہو گیا۔ مجھے ز
تشویش اس وجہ سے بھی نہیں تھی اس قسم کے ہوٹلوں میں پولیس کا اور خاص طور پر خ
پولیس کا ایک آدھ آدمی ضرور بیٹھتا ہے جو اس بات کی خبر رکھتا ہے کہ کون باہر سے
ہے اور کہیں کوئی سمگلنگ تو نہیں ہو رہی یا کسی واردات کے ہونے کا اندیشہ تو نہیں ہ
عام طور پر اس قسم کے آدمی کو انگریزی ہوٹلوں والے خود بلا کر رکھوا لیتے ہیں۔ مجھے لڑ
سے بھی توقع تھی کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہونے لگی تو لڑکا مجھے آ کر اطلاع کر دے
اس کے باوجود مجھے بے چینی سی لگ گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس ہوٹل میں
میں نے غلطی ہی کی ہے۔ بہرحال اب جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ مجھے آگے کی بابت سوچنا
محتاط رہنا تھا۔

دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔

اس دوران دو بار ہوٹل کا لڑکا میرے پاس آیا اور اس نے یہی کہا کہ صاحب
پولیس والے نے اس کے بعد مس شیلا سے کوئی بات نہیں کی اور وہ ہوٹل سے باہر
گیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اس آدمی نے کہیں ٹیلی فون بھی نہیں کیا؟"

لڑکا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"صاحب۔ میرے سامنے تو اس نے کوئی فون نہیں کیا۔ اگر کہیں فون کرے گا
آپ کو اسی وقت آ کر بتا دوں گا۔ آپ یہاں سے فون پر سات نمبر گھما کر اس کی گف

لیں گے۔"

لڑکے نے مجھے یہ بڑے پتے کی بات بتا دی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے ٹیلی فون
کے ڈائل کا سات نمبر گھما کر ریسیور کان سے لگایا۔ نیچے کاؤنٹر والی لڑکی مس شیلا کسی مرد
سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"بالکل نہیں۔ ایسی بات کرو گے تو میں تمہیں اپنے قریب بھی نہیں آنے دوں گی"

دوسری طرف مرد نے ایک بڑی فحش بات اسے کہہ دی جس کے جواب میں شیلا نے
کہا۔

"یہ بھی تب ہو گا جب تم وعدہ کرو گے کہ جو بات تم نے کملا کو کہی ہے آئندہ ایسی
بات کبھی نہیں کہو گے"

مرد نے کہا۔

"شیلا جی شما کرو۔ بھگوان کو ساکشش جان کر کہتا ہوں کملا کو اب میں کبھی منہ نہیں
لگاؤں گا۔ اچھا آج رات کتنے بجے آؤں؟"

شیلا نے جواب دیا۔

"نا نا۔ بالکل نہ آنا۔ آج رات میں اپنے انکل کے گھر جا رہی ہوں۔ او کے۔ کل فون
کرنا"

اور فون بند ہو گیا۔ میں نے فون رکھ دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میں نے ایک بار پھر
سات نمبر گھما کر ریسیور اٹھایا کہ شاید خفیہ پولیس والا تھانے وغیرہ میں میری بابت کوئی فون
نہ کر رہا ہو۔ مگر فون پر کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔ فون بند تھا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔
اس خیال سے میں نیچے بھی نہیں گیا تھا کہ خواہ مخواہ خفیہ پولیس والے کی نظروں میں
آ جاؤں گا۔ میں کمرے میں ہی بیٹھا سگریٹ پھونکتا اور اخبار رسالے پڑھتا رہا۔ مجھے احمد
آباد والے اپنے ماسٹر سپائی کریم کا خیال بھی آیا کہ اسے میری فکر ہو گی۔ یہ تو اسے معلوم
ہو گیا تھا کہ میں احمد آباد میں را کے چیف گوکل داس پانڈے کے بنگلے سے فرار ہو چکا
ہوں۔ اب وہ میرے کسی وائرلیس پیغام کا انتظار کر رہا ہو گا۔ یہ وائرلیس سگنل میں اسے

دلی کے ماسٹر سپائی گل خان کے پاس جا کر ہی دے سکتا تھا۔ کیونکہ میرے پاس کوئی ر
ٹرانسمیٹر وغیرہ نہیں تھا اور اس کے فون نمبر پر میں کسی دوسرے شہر سے فون کر کے ا
کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی کریم نے مجھے اس نمبر پر فون کرنے سے
کر رکھا تھا۔ میں نے کھانا منگوا لیا۔ وہی لڑکا کھانا لے کر آیا۔ کہنے لگا۔

"صاحب! خفیہ پولیس والا تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر گیا تھا۔ میں نے اس کا
کیا۔ وہ ساتھ والے سینما ہاؤس میں گیا تھا۔ وہاں کا گیٹ کیپر اس کا دوست تھا۔
تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ پھر ہوٹل میں واپس آ گیا تھا"

میں اس خفیہ پولیس والے سے اب مطمئن اور بے فکر ہو گیا تھا۔ بالکل ایسے
جیسے کوئی سپیرا اس سانپ کو گلے میں ڈال کر اس سے بے فکر ہو جاتا ہے جس کا زہر
دیا گیا ہو۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کافی منگوا کی پی جائے میں نے
شیلا کو فون پر کافی کا کہنے کے لئے ریسیور اٹھایا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا

"آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"

دروازہ کھلا اور سامنے مس شیلا کھڑی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"سر! میں نے آپ کو انٹرفیئر کیا۔ سوری سر! کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"آجاؤ۔ میں تمہیں فون کر کے کافی منگوانے لگا تھا۔"

وہ بولی۔

"میں نے آپ کے لئے کسی دوسری چیز کا انتظام کیا تھا سر۔ آپ برا تو نہیں
گے؟"

"کس چیز کا انتظام؟"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پرس میں سے سکاچ وسکی کا ہاف نکال کر میز
دیا۔

"سر! یہ خاص تحفہ ہے جو میری ایک آنٹی نے مجھے لندن سے بھیجا تھا۔ میں اس
خیال سے لے آئی ہوں کہ آپ اسے دیکھ کر انکار نہیں کریں گے۔"

میں نے شیلا کو اس لئے بھی واپس نہ بھیجا کہ میں اس سے کسی طریقے سے خفیہ
پولیس والے کی سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شراب کو
میں نے ہاتھ نہیں لگانا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"میں نے آپ کو کاؤنٹر پر ہی بتا دیا تھا کہ میں شراب وغیرہ نہیں پیتا"

شیلا نے اپنے بلاؤز کو دونوں ہاتھوں سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ شراب نہیں ہے۔ یہ تو وسکی ہے آپ پی کر تو دیکھیں"

"مگر تم مجھ پر یہ مہربانی کس لئے کر رہی ہو؟"

میرے اس سوال پر اس لڑکی نے نیم طوائفانہ مسکراہٹ کے ساتھ گردن کو ایک
جھٹکا دے کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اس لئے کہ آئی لائیک یو سر مجھے تم بڑے اچھے لگے ہو۔"

یہ اس کا کاروباری جملہ تھا۔ ہوٹل کا لڑکا مجھے اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا
اور میں نے ٹیلی فون پر کسی مرد کے ساتھ اس کی گفتگو بھی سن لی تھی۔ مگر میں اس
پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا۔ میں نے آہستہ سے اس کی
بانہیں اپنے گلے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا۔ اب میں تمہیں اپنے دل کی بات بتائے دیتا
ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں کبھی کبھی وسکی ضرور پیتا ہوں۔ مگر میں ہمیشہ رات کو ایک بجے
کے بعد وسکی پیتا ہوں۔ اگر تم رات ایک بجے کے بعد میرے پاس آجاؤ تو میں تمہارے
ساتھ وسکی ضرور پی لوں گا۔"

شیلا صوفے پر بیٹھ گئی۔ بلاؤز کو ایک بار پھر اوپر چڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں جاؤں گی ہی نہیں۔ ایک بجے تک بلکہ اس کے بعد بھی تمہارے پاس ہی
رہوں گی"

میں نے دل میں اسے گالی دی اور سوچا کہ یہ بلا کہاں سے میرے پیچھے پڑ گئی ہے
میں نے سوچا کہ اس سے کم از کم خفیہ پولیس والے کے بارے میں تو کچھ معلومات حاصل کر لینی چاہیئے۔ میں نے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

اس کا نام مجھے معلوم تھا مگر میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میرا نام شیلا جونسن ہے۔"

میں نے کہا۔

"شیلا! مجھے یہ بتاؤ کہ جب میں کاؤنٹر پر کھڑا تھا تو تمہاری دائیں جانب کرسی پر اک آدمی بیٹھا تھا کیا وہ تمہارا فادر جونسن تھا؟"

شیلا نے اسے گالی دے کر کہا۔

"وہ حرامی میرا فادر کہاں سے ہو گیا۔ ارے وہ تو پولیس کا ٹاؤٹ ہے۔ بس شام رات کے ایک بجے تک پولیس کی ڈیوٹی دیتا ہے کہ ہوٹل میں کون کون آتا ہے۔ کون ہے۔ وہ تو تمہارے بارے میں بھی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کمل کمار جی بڑے کاروباری آدمی ہیں دلی میں رہتے ہیں۔ میرے جا والے ہیں"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا۔ تم تو مجھے جانتی بھی نہیں تھیں"

مس شیلا جونسن نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"اس لئے ڈارلنگ کہ تم مجھے پہلی نظر میں ہی اچھے لگنے لگے تھے۔"

وہ اپنا چہرہ میرے قریب لا رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔

"مجھے یاد آ گیا۔ مجھے اپنی پتنی کو فون کرنا ہے۔ اس نے کہا تھا بانڈہ پہنچ کر مجھے خیریت فون پر ضرور بتا دینا"

مس شیلا پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی۔

"اچھا میں پھر آؤں گی۔ تم فون کر لو"

وہ چلی گئی تو میں نے شکر ادا کیا۔ میں نے سٹیشن پر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اپنی جیب میں ڈبی کے اندر رکھے ہوئے چیونگ گم بم ٹیبلٹ کو چیک کیا۔ بٹوے میں جتنے روپے باقی رہ گئے تھے انہیں گن کر دوبارہ بٹوے میں رکھا۔ سامان تو میرے پاس تھا نہیں۔ بس ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی رکشا پکڑنا تھا اور سٹیشن پہنچ جانا تھا۔ انکوائری کلرک کے مطابق دلی جانے والی ٹرین میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ اس خیال سے کہ مس شیلا دوبارہ وارد نہ ہو جائے میں نے سوچ لیا تھا کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہی نکل جاؤں گا۔

انڈیا میں ٹیلی ویژن ابھی نیا نیا شروع ہوا تھا۔ کمرے میں ایک ٹیلی ویژن بھی رکھا ہوا تھا جس کو میں نے ابھی تک نہیں چلایا تھا۔ اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے اس کا بٹن دبایا کہ تھوڑی دیر کوئی پروگرام ہی دیکھا جائے۔ ابھی ٹی وی بلیک اینڈ وائیٹ تھا۔ انڈیا کے کسی شہر کی ڈاکومینٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک پروگرام بند ہو گیا اور ایک لیڈی اناؤنسر نے سامنے آ کر اعلان کیا کہ دریاؤں میں اچانک زبردست سیلاب کا پانی آ جانے سے الہ آباد جھانسی اور ضلع بانڈہ کے اتری (شمالی) علاقوں میں ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بند کر دی گئی ہے۔ بانڈہ سے دلی کانپور الہ آباد جانے والی ساری ریل گاڑیاں کینسل کر دی گئی ہیں اور محکمہ ریلوے کی جانب سے ریلوں کے نئے شیڈول کا جلد اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ خبر میرے لئے کافی پریشان کن تھی کیونکہ مجھے بانڈہ سے رات کی گاڑی سے دلی روانہ ہونا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر فون کیا کہ مجھے ریلوے انکوائری کا نمبر ملایا جائے۔ کاؤنٹر پر کوئی دوسرا کلرک رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے نمبر ملا دیا۔ بانڈہ ریلوے سٹیشن کی انکوائری بے حد مصروف تھی۔ کئی بار فون کرنے کے بعد نمبر ملا۔ وہاں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ بانڈہ سے کوئی گاڑی دلی کانپور الہ آباد کی طرف نہیں جا رہی۔ اس طرف سیلاب کی وجہ سے ساری ریلوے لائنیں پانی میں ڈوب چکی ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ خیال آیا کہ نیچے ناگ پور حیدر آباد کی طرف نکل جاتا ہوں۔ بانڈہ سے نیچے جنوبی ہندوستان کی جانب پہلا بڑا شہر جبل پور تھا۔ لیکن

یونہی دربدر ہونے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ اگر میں بانڈہ میں پولیس والوں سے محفوظ ہوں
پھر مجھے اسی جگہ رہ کر اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب دلی جانے والا ریلوے ٹریک
کھل جائے اور اگر بانڈہ میں میں محفوظ نہیں ہوں تو جبل پور اور ناگ پور میں بھی محفو
نہیں ہوں گا۔ جہاں تک بانڈہ کا تعلق تھا یہاں مجھے بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جس خ
پولیس والے کی ڈیوٹی اس انگریزی ہوٹل میں لگی ہوئی تھی تحقیق کے بعد وہ بے ض
ثابت ہو چکا تھا۔ دو ایک بار اس نے شیلا سے میرا رسمی طور پر پوچھا تھا اس کے بعد وہ
سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سیلاب اتر جائے گا اور دلی کا ریلوے ٹریک
بحال ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ دو ایک روز کی بات ہے مجھے اسی ہوٹل
ٹھہرے رہنا چاہئے۔ ایک تو یہ ہوٹل شہر سے باہر غیر آباد جگہ پر تھا۔ دوسرے یہ انگ
ٹائپ کا ہوٹل تھا یہاں بڑے امن سکون کی فضا تھی۔ میں سونے کی تیاریاں کرنے لگا۔
خیریت رہی کہ کاؤنٹر گرل مس شیلا پھر نہیں آئی تھی۔ میں نے بجلی کا ہیٹر بند کر دیا۔ کیو
میں نے محسوس کیا تھا کہ کمرے میں گرمی زیادہ ہو گئی ہے ویسے بھی اس علاقے میں
ہندوستان کی نسبت سردی شدید نہیں تھی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

صبح میرا ہوٹل بوائے جاسوس میرے لئے بیڈ ٹی لے کر آیا تو اس نے مجھے جگایا
بڑا پر جوش سا لگ رہا تھا۔ جیسے مجھے کوئی نئی خبر بتانے کو بے تاب ہو۔ ابھی میں نے
سے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا کہ میرے پلنگ کے پاس آ کر قالین پر بیٹھ گیا اور پر اسرار
میں بولا۔

"صاحب! ہوٹل میں ایک انگریز جاسوس آیا ہے"

میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد ہنس کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ جاسوس ہے؟"

ہوٹل بوائے بولا۔

"صاحب! میں دو باتیں اس کی آپ کو بتاتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اس انگریز
ایک چھوٹا اٹیچی کیس ہے جس کو وہ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔ میں اسے کمرے

رگیا اور کہا صاحب لاؤ یہ اٹیچی میں الماری میں رکھ دوں تو اس نے کہا۔ نہیں نہیں۔
ں خود رکھ لوں گا"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور دوسری بات کونسی ہے؟"

ہوٹل بوائے کہنے لگا۔

"صاحب دوسری بات آپ سنیں گے تو آپ کو بھی یقین آجائے گا کہ وہ کوئی جاسوس
ہے۔"

اچھا بتاؤ دوسری بات کیا ہے؟"

ہوٹل کا لڑکا ذرا میرے قریب آ کر بولا۔

"صاحب! یہ انگریز وائرلیس پر کسی سے خفیہ باتیں کر رہا تھا"

میرے ذرا سے کان کھڑے ہوئے مگر اس کے باوجود میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

"اس کے پاس وائرلیس کہاں سے آگیا۔ اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ وائرلیس سیٹ
تھا؟"

ہوٹل بوائے بولا۔

"صاحب! میں نے بڑے جاسوسی ناول پڑھے ہیں۔ مجھے جاسوس بننے کا شوق جو ہے۔
یں نے ناولوں میں پڑھا ہے کہ وائرلیس سیٹ بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی اور بعض
جاسوسوں کے پاس ایسے وائرلیس سیٹ بھی ہوتے ہیں جو انہوں نے سگریٹ کی ڈبیوں یا
ن کے اندر فٹ کر رکھے ہوتے ہیں۔"

میں تھوڑا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں نے پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اور اس انگریز کے پاس کس قسم کا وائرلیس سیٹ تھا؟"

ہوٹل بوائے نے کہا۔

"صاحب اس کے پاس چھوٹی سی ٹارچ تھی اس نے ٹارچ کے اندر وائرلیس سیٹ
لگا ہوا تھا۔"

اب میں نے اس سے بڑا اہم سوال پوچھا۔

"تم اسے کہاں سے دیکھ رہے تھے؟"

وہ رازداری سے کہنے لگا۔

"صاحب ہوٹل کے نوکروں نے ہر کمرے کے دروازے کھڑکیوں میں خفیہ سوراخ رکھے ہیں ان سوراخوں سے وہ کمرے کے اندر لیٹے ہوئے عورت مرد کی ساری حرکتیں دیکھا کرتے ہیں۔ اس انگریز کے کمرے کے دروازے میں بھی ایک سوراخ ہے۔ میں نے سوراخ میں سے دیکھا ہے۔"

پھر اس نے مجھے ساری بات بیان کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب یہ انگریز رات کو کوئی دس بجے کے قریب ہوٹل میں ایک ٹیکسی پر آیا تھا اس نے بتایا تھا کہ وہ حیدر آباد دکن سے بمبئی جا رہا تھا مگر سیلاب کی وجہ سے آگے ٹرینیں بند ہیں اس لئے ہوٹل میں ٹھہر گیا ہے۔ صاحب یہ انگریز اردو بھی اچھی طرح بول لیتا ہے۔ میں اسے کمرے میں لے کر گیا تو اس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا جس کو اس نے سنبھال کر پکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں جا کر میں نے اٹیچی کیس لے کر الماری میں رکھنا چاہا اس نے مجھے اٹیچی کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ چونکہ مجھے جاسوسی کا شوق ہے اس لئے مجھے فوراً شک پڑ گیا کہ اس اٹیچی کیس میں کوئی خاص نقشہ ہے اور یہ انگریز کوئی جاسوس ہے۔ رات کو کھانا لے کر بھی میں ہی اس کے کمرے میں گیا۔ ابھی میں کمرے باہر ہی تھا کہ مجھے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ انگریز کمرے میں اکیلا تھا۔ اب یہ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے خفیہ سوراخ میں دیکھا تو صاحب اس انگریز کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کا پچھلا حصہ اس نے کھول رکھا اور اپنے منہ کے ساتھ لگا کر انگریزی میں کسی سے باتیں کر رہا تھا میں فوراً سمجھ گیا کہ وائرلیس پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ اب آپ ہی بتاؤ صاحب کہ کیا یہ انگریز جاسوس نہیں ہے؟"

میرے دل میں ایک شک یقین کی صورت اختیار کرنے لگا۔ میں احمد آباد میں را

چیف گوکل داس پانڈے کے بنگلے پر بعض اسرائیلی فوجی ماہرین کو آتے جاتے دیکھ چکا تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں آچکی تھی کہ بھارتی وزارت دفاع نے اسرائیل کی حکومت کے ساتھ نیوکلر توانائی حاصل کرنے اور انڈیا میں نزدیکی اور دورمار میزائل تیار کرنے اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کا ایک خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے جس کے تحت اسرائیلی فوجی اور نیوکلر سائنس کے ماہرین انڈیا میں آچکے ہیں۔ اور یہ ساری ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی تیاریاں ایٹم بم اور جوہری راکٹ بنانے اور انہیں پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے سلسلے میں کی جاری ہیں۔ جب ان ساری کڑیوں کو میں نے اپنے ذہن میں جوڑا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی اسرائیلی فوجی ماہر ہے جو حیدر آباد سے بمبئی جا رہا ہے اور اس کے بریف کیس میں یقیناً بعض کارآمد خفیہ راز ہوں گے جنہیں معلوم کرنا پاکستان کے قومی تحفظ کی خاطر ضروری ہے۔ یہ بات بھی تھی کہ بھارت نے اس زمانے میں بھابھا نیوکلیر ریسرچ سنٹر کے علاوہ حیدر آباد دکن میں بھی ایک نیوکلر ری ایکٹر قائم کیا ہوا تھا اور میری اطلاع کے مطابق بمبئی میں ایک نیا ایٹمی ری ایکٹر لگایا جا رہا تھا۔ میں نے ہوٹل بوائے کے سامنے کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار کئے بغیر کہا۔

"اچھا اگر تم اس انگریز کو جاسوس سمجھتے ہو تو کیا تم ایک کام کر سکتے ہو؟"

ہوٹل بوائے نے جو مسلمان لڑکا تھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"صاحب آپ بتائیں۔ میں ضرور کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"کسی طرح اس انگریز کے بریف کیس میں جو کاغذات وغیرہ رکھے ہیں وہ نکال کر میرے پاس لاؤ۔ اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا کہ یہ انگریز جاسوس ہے کہ نہیں"

ہوٹل بوائے بولا۔

"یہ کونسا مشکل کام ہے صاحب۔ جب انگریز جاسوس کمرے سے باہر جائے گا تو میں اس کے اٹیچی کیس کو کھول کر سارے کاغذ نکال کر آپ کے پاس لے آؤں گا"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تم اس کا تالا کیسے کھولو گے۔ جاسوس ایسا تالہ لگاتے ہیں جس کی چابی اور کی
پاس نہیں ہوتی"

ہوٹل بوائے نے کہا۔

"صاحب! مجھے جاسوسی کا بڑا شوق ہے۔ میں نے بڑی محنت لگا کر لوہے کی ایک
تار بنا رکھی ہے جس سے ہر قسم کا تالا میں کھول لیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس
انگریز کو باہر جانے دیں ہاں اگر وہ اٹیچی کیس ساتھ لے گیا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا"

میرا خیال تھا کہ وہ بریف کیس کو اٹیچی کیس کہہ رہا ہے۔ میں نے اس کی وضا
کے واسطے ہوٹل بوائے سے پوچھا کہ اس انگریز کے پاس چمڑے کا تھیلا ہے یا چھوٹا
کیس ہے۔ ہوٹل بوائے نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"صاحب جی! میں نے چمڑے کے تھیلے دیکھے ہوئے ہیں۔ اس کے پاس تھیلا
ہے۔ اٹیچی کیس ہے۔ چھوٹا اٹیچی کیس۔ میرا خیال ہے اس میں اس کے کپڑے بھی ہ

تب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ انگریز جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ انگریز
بلکہ اسرائیلی ہے اگر باہر گیا تو اٹیچی کیس کمرے میں ہی رکھ کر جائے گا۔ اتنا ضرور کر
کہ باہر جاتے وقت ہوٹلوں میں جیسا ہوتا ہے کمرے کی چابی کاؤنٹر کلرک کو نہیں د
بلکہ اپنے ساتھ ہی لیتا جائے گا۔

میں نے ہوٹل بوائے جس نے اپنا نام محمود بتایا تھا مزید اعتماد میں لیتے ہوئے
بیس روپے دیئے اور کہا۔

"محمود! اب تمہاری ڈیوٹی ہے کہ جب یہ انگریز جاسوس باہر جائے تو فوراً اس
اٹیچی کیس میں سے جتنے کاغذ ہیں نکال کر میرے پاس لے آؤ۔ میں تھوڑی دیر انہیں
کر واپس کر دوں گا"

ہوٹل بوائے روپے لے کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"صاحب آپ بے فکر رہیں۔ میرا خیال ہے وہ کسی نہ کسی وقت ہوٹل سے
ضرور جائے گا"

میں نے ہوٹل بوائے کو یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ اس بارے میں ہوٹل کے کسی
ملازم سے بات نہ کرے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"صاحب! کامیاب جاسوس تو وہی ہوتا ہے جو اپنا راز کبھی کسی کو نہ بتائے۔ میں جانتا
ہوں صاحب"

جب وہ چلا گیا تو میں نے سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ممکن
، اس شوقیہ جاسوس لڑکے کی وجہ سے بھارت کے کسی خفیہ ایٹمی پروگرام کا راز میرے
لگ جائے۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور ٹی وی آن کر دیا۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن پر
اب کی صورت حال کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ ان اطلاعات کے مطابق ابھی تک
ں کی جانب یعنی دلی کی طرف ریلوے ٹرینوں کی آمد و رفت بالکل بند تھی۔ مجھے اب کوئی
دی نہیں تھی۔ میں جب تک اس اسرائیلی کے اٹیچی کیس کے کاغذات کو نہیں دیکھ لیتا
ل سے نہیں جا سکتا تھا۔

کاؤنٹر پر سے مس شیلا کا فون آ گیا۔ کہنے لگی۔

"سوری سر! آپ کی ٹرم ختم ہو گئی ہے۔ اگر آپ ہوٹل میں مزید ٹھہرنا چاہتے ہیں تو
ہمیں آ کر بتا دیں"

یہ بہت ضروری تھا۔ میں فوراً ہوٹل کی پرانی قسم کی چھوٹی سی لابی میں آ گیا۔ مس
لا میری طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے دلی جانا تھا مگر دلی کوئی
نہیں جا رہی۔ اس لئے مجبوراً مجھے ہوٹل میں مزید رکنا پڑے گا۔ مس شیلا رجسٹر
ل کر کہنے لگی۔

"سر! آپ کتنی دیر اور رکنا چاہتے ہیں"

میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور کہا۔

"دو دن تو ضرور ٹھہروں گا"

س شیلا نے میرے حساب میں رقم جمع کر دی۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ خفیہ
یس والا آدمی وہاں نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہاں جو آدمی تمہارا پہرہ دیتا تھا وہ نظر نہیں آرہا"

مس شیلا نے ہنس کر کہا۔

"وہ تو سارے ہوٹل کا گارڈ ہے۔ دوپہر کو کہیں آئے گا۔"

ایک اور آدمی کاؤنٹر پر آگیا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ بر
برآمدے میں اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ کہ برآمدے کے آخری کمرے میں سے
نے ایک گورے آدمی کو باہر نکل کر کمرے کے دروازے کو تالا لگاتے دیکھا۔ یقیناً
اسرائیلی فوجی مشیر تھا جس کو ہوٹل والا لڑکا انگریز سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور
نوٹ کی کہ اس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس نہیں تھا۔ وہ بڑے اعلیٰ قسم کے ہلکے بلیو رنگ
سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں اپنے دھیان میں چلتا گیا۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں
آنکھوں کے کناروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا رنگ اتنا گورا نہیں تھا۔ یہ اسرائیلی
یروشلم ہی کا رہنے والا تھا۔ یعنی اس کو یروشلم میں رہتے ہوئے کافی مدت ہو چکی ہو
جس کی وجہ سے اس کا رنگ تھوڑا ہلکا پڑ گیا تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی چھوٹی چھو
مونچھیں بھی تھیں۔ عمر چالیس سال سے کچھ اوپر لگ رہی تھی۔

میرا کمرہ اس کے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا
دروازہ بند کر کے بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ دل میں یہی دعا کر رہا تھا کہ ہوٹل بوائے محمو
اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے خدا کرے کہ اسے معلوم ہو گیا ہو کہ "انگریز جاسو
اپنے کمرے سے جا چکا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں محمود کو تلاش کر کے اسے یہ خوش
سنا دوں۔ مگر مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیئے تھا اور میں نے ایسا کیا بھی نہیں۔ بس صبر کر
اپنے کمرے میں ہی رہا۔ میرے لئے یہ وقت گزارنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک بار میں
دروازہ کھول کر برآمدے میں جھانک کر دیکھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ میں واپس پلنگ پر آ
دراز ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر کسی
دستک دی۔ میں نے کہا۔

"آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے"

میرا خیال تھا کہ کمرے کی صفائی کرنے والا کوئی آدمی ہو گا۔ دروازہ کھلا تو ہوٹل
بوائے محمود اندر داخل ہوا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے
پاس آگیا۔ اس نے ایک تربیت یافتہ جاسوس کی طرح فوراً دروازہ بند کر دیا اور قمیض کے
اندر ہاتھ ڈال کر کاغذوں کا ایک رول نکال کر میرے حوالے کر دیا۔
سانس ٹھیک کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"صاحب! انگریز جاسوس اٹیچی کیس ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ بڑا اچھا ہوا۔ میں نے
اپنی خاص تار سے اٹیچی کیس فوراً کھول لیا تھا۔ اندر جتنے کاغذ تھے میں لے آیا ہوں
صاحب آپ اسے دیکھ لیں۔ انگریز جاسوس سٹیشن پر گیا ہے۔ میں نے پتہ کر لیا تھا۔ میں
تھوڑی دیر میں آؤں گا"

وہ چلا گیا۔ میں نے دروازے کی چٹخنی لگا لی اور صوفہ سیٹ کے درمیان جو کافی ٹیبل
ہوئی تھی اس پر کاغذوں کے رول کھول دیئے۔ یہ سات آٹھ کاغذ تھے۔ ان میں کچھ
نیلے رنگ کے تھے۔ جو کسی پراجیکٹ کے بلیو پرنٹ لگتے تھے۔ باقی کاغذ موٹے اور
ید تھے میں نے انہیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ سفید کاغذوں پر نیلی سرخ اور سیاہ
وں سے انگریزی اور کسی دوسری زبان میں (جو بعد میں پتہ چلا کہ عبرانی زبان تھی) کچھ
مولے سے لکھے ہوئے تھے۔ درمیان میں چھوٹے اور بڑے راکٹوں کے خاکے بنے
ئے تھے۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا جلدی سے ہوٹل کے کمرے میں ہوٹل والوں کی
ف سے رکھی ہوئی پنسل اور سلپوں والی کاپی اٹھائی اور ان کاغذوں کی جلدی جلدی
یں تیار کرنا شروع کر دیں۔ میں نے سات آٹھ منٹ کے اندر اندر سفید کاغذوں پر لکھے
سارے فارمولے اور راکٹوں کے خاکے اور اس کے دائیں بائیں لکھے ہوئے الفاظ
نمبر اور ڈگریوں کے حروف سب کچھ سلپوں پر اتار لیا۔ اس کے بعد بلیو پرنٹ کا جائزہ
نیلے کاغذ پر آڑھی ترچھی سفید لکیروں میں مربعے مکعب اور مستطیل بنے ہوئے تھے۔
کسی پراجیکٹ کا نقشہ تھا۔ میں نے ان میں سے تین چار خاکوں کی نقل اتار لی اور نیچے

جو زاویے لکھے ہوئے تھے وہ بھی نقل کر لئے۔ اس کام میں مجھے پندرہ بیس منٹ
گئے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سارے کاغذوں کو سمیٹ کران کا ایک رول
میز کے نیچے چھپا دیا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل بوائے محمود اندر آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا
میں سمجھا کہ اسرائیلی واپس اپنے کمرے میں آچکا ہو گا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا وہ واپس آگیا ہے محمود؟"

"نہیں صاحب۔ واپس تو نہیں آیا۔ مگر کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔ آپ نے کا
کو دیکھ لیا ہے کیا؟"

میں نے میز کے نیچے سے کاغذوں کا رول نکال کر اس کے حوالے کرتے ہو
نیازی سے کہا۔

"یار ان کاغذوں میں تو خدا جانے کیا بک بک لکھی ہوئی ہے۔ میری تو سمجھ میں
آیا ہے کہ یہ انگریز جاسوس نہیں کوئی انجینئر ہے۔ ان میں کسی جگہ کا خاکہ بھی ہے"

اس نے جلدی جلدی کاغذوں کا رول قمیض کے اندر چھپا لیا اور بولا۔

"صاحب! میں جاتا ہوں۔ انگریز جاسوس کو پتہ چل گیا کہ اس کے کاغذ چوری
ہیں تو ہوٹل والے مجھے پکڑ لیں گے کیونکہ میں ہی اس کمرے میں سروس کرتا ہوں"

محمود فوراً چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں ان کاغذات کب نکال کر ایک بار پھر غور سے
جن پر میں نے اسرائیلی کے کاغذات کی نقل اتاری تھی۔ یہ چار پانچ سلپس بن گ
جن کی دونوں جانب لکھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پلنگ کے گدیلے کے نیچے چھپا کر
اور خود بازار چلا گیا۔ میرے پاس ابھی رضوانہ کے دیئے روپوں میں سے کچھ رو
تھے۔ میں اپنے لئے کپڑوں کا نیا جوڑا بھی خریدنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر اس ار
ملتوی کر دیا کہ دلی جا کر نئے کپڑے بنواؤں گا۔ اس زمانے میں ابھی پولی تھین یعنی
کے تھیلے وغیرہ نہیں چلے تھے لیکن موم جامہ بازار سے مل جاتا تھا۔ میں نے پتلے

موم جامے کا ایک رومال سائز کا ٹکڑا خریدا۔ پھر ایک موٹا کاغذ اور پکی نیلی پنسل خریدی
جس کی لکیریں پکی ہوتی ہیں۔

ہوٹل میں واپس آکر میں نے دروازہ لاک کر لیا اور میز پر کاغذ رکھ کر نیلی پنسل سے
اس پر راکٹوں کی ہو بہو تصویریں، فارمولے ان کے زاویئے اور کسی عمارت کا جو خاکہ بنا
ہوا تھا سارے کا سارا باریک باریک کر کے اس طرح اتار لیا کہ سب کچھ ایک بالشت بھر
کے کاغذ پر آگیا۔ اس کے بعد میں نے اسے تہہ کر کے بالکل تعویذ کی طرح کا بنایا اور اس
کے اوپر موم جامے کے ٹکڑے کو کاٹ کر اچھی طرح سے چڑھا دیا۔ وہ بالکل تعویذ لگ رہا
تھا۔ میرے بوٹوں کے تسمے لمبے لمبے تھے۔ میں نے ایک تسمے کو نکال کر اس تعویذ نما
دستاویز کو اس میں پرو دیا اور اسے اپنے ایک بازو پر باندھ لیا۔ یہ سارا انتظام میں نے صرف
اس خیال کے پیش نظر کیا تا کہ ابھی میرے سامنے خطرات سے پر ایک لمبا سفر تھا اور کچھ
نہیں تھا کہ اس دوران کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ میں نے دوسرے
ٹ کا تسمہ نکال کر اس کے دو حصے کئے اور دونوں جوتوں میں ڈال لئے۔ ہوٹل کے کاغذ
جن سلپوں سے میں نے نقل کی تھی ان کو پھاڑ کر میں نے باتھ روم میں لے جا کر جلا
۔ اب یہ دستاویز میرے پاس محفوظ ہو گئی تھی۔

دوپہر تک میں اپنے کمرے میں ہی رہا۔ دوپہر کو ہوٹل بوائے آگیا۔ بہت خوش تھا۔
نے لگا۔

"صاحب! میں نے ایسی ہوشیاری سے سارے کاغذ اٹیچی کیس میں رکھ کر اٹیچی کیس
تالا لگایا ہے کہ انگریز جاسوس کا استاد جاسوس بھی اگر آجائے تو اسے پتہ ہی نہیں چلے گا
کسی نے تالا کھولا تھا۔"

میں نے ہوٹل بوائے کو شاباش دی۔

"محمود تم واقعی بڑے عقل مند ہو۔ تم بڑے ہو کر بہت مشہور جاسوس بنو گے۔"
وہ بولا۔

"صاحب! میں ہوٹل کی نوکری نہیں کرنا چاہتا مجھے اپنے ساتھ دلی لے جا کر جاسوس

بنا دیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا"

میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"محمود میں ابھی تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا لیکن دلی پہنچ کر تمہیں ضرور بلالو
تم مجھے اپنا پتہ دے دینا"

وہ ہاتھوں کو نچاتا ہوا بولا۔

"صاحب اپنا پتہ کیا ہو گا۔ بس الیگزانڈریہ ہوٹل پہنچ کر بلے میاں کو ملے لکھ
یہاں مجھے سبھی جانتے ہیں۔ صاحب! کھانے میں کیا لاؤں؟"

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ایک گھنٹہ آرام کیا۔ اٹھا تو ریلوے سٹیشن وا
کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک دلی کی جانب ریل گاڑیوں کی آمدورفت بحال نہی
سکی۔ میں اب جلدی دلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میں نے اسرائیلی فوجی ماہر کے جن کاغذا
نقل اتاری ہے وہ دلی میں اپنے ماسٹر سپائی گل خان کو جا کر دکھاؤں اور معلوم کروں
کس قسم کے راکٹوں کے نقشے ہیں اور ان کی تیاری کے سلسلے میں انڈیا کی حکو
کوششیں کر رہی ہے اور پیشتر اس کے کہ یہ تیار ہوں ان کو کس طرح تباہ کیا جا سکتا
مگر دریاؤں کے سیلاب نے مجھے روک رکھا تھا۔ باندہ سے دلی کی جانب کوئی لار
نہیں چل رہی تھی کہ میں اسی طرح تھوڑا تھوڑا سفر طے کر کے دلی پہنچ سکتا۔

میں نے سوچا کہ باندہ سے نیچے جبل پور یا ناگ پور چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے
طرف نکل جاؤں گا اور کلکتے سے دلی والی کوئی ٹرین پکڑ لوں گا۔ مگر یہ بڑا لمبا سفر تھا
خبر نہیں تھی کہ اس طرف بھی دریا چڑھے ہوئے ہوں اور ٹرینوں کی آمدورفت
چکی ہو۔ آخر یہی فیصلہ کیا کہ ایک دو روز یہیں باندہ کے ہوٹل میں ہی پڑا رہتا
کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ مس شیلا کی ڈیوٹی دن کے وقت کاؤنٹر پر ہی تھی مگر ا
کوئی فون نہیں آیا تھا۔ ڈیوٹی کے وقت وہ بڑی محتاط رہتی تھی۔ میں اس سے اس
باشندے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں
ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو گا۔

ـہ پہر کو مس شیلا نے فون کیا۔
کہنے لگی۔

"سر! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں"

میں نے کہا۔

"شکریہ! صرف تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم وقت نکال کر میرے پاس تھوڑی دیر
لئے آ سکتی ہو؟"

اس نے طنزاً کہا۔

"کیا آپ کی بیوی نے آپ کو فون نہیں کیا؟"

معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ کاؤنٹر پر بالکل اکیلی ہے۔ میں نے کہا۔

"شیلا جی! آپ کی جگہ اور کوئی عورت نہیں لے سکتی"

میں جان بوجھ کر اس کی خوشامد کر رہا تھا۔ کیونکہ اب مجھے اس سے مطلب تھا اور
رتوں سے مطلب نکالنے کا میں شروع ہی سے بڑا ماہر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جہاد
ٹیم میں شرکت کو اپنا مقصد بنانے اور کمانڈو کی سخت ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد میں
نے اس قسم کی حرکتوں سے توبہ کر لی تھی۔ مس شیلا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی۔

"مہاشے جی آپ تو دلیپ کمار ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔"

میں نے اس کی مزید خوشامد کرتے ہوئے اور مزید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں شیلا جی! یہ میرے دل کی آواز تھی۔ تم سچ مچ مجھے بڑی اچھی لگنے لگی

ہو"

شیلا نے کہا۔

"اس وقت تو میں ڈیوٹی پر ہوں۔ رات کو آؤں گی۔ او کے۔ بائی"

اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ میں اس خیال سے کمرہ لاک کر کے نکل آیا
سٹیشن پر جا کر خود صورت حال معلوم کرتا ہوں۔ چابی دینے میں مس شیلا کے پاس کاؤنٹر
آیا تو اس نے کچھ شرما کر کچھ لجا کر بڑے دل ربا انداز میں میری طرف گردن ایک طر
کر کے دیکھا اور کمرشل انداز میں پوچھا۔

"سر! کتنی دیر تک آجائیں گے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"رات ہونے سے پہلے آجاؤں گا"

اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ چابی لے کر پیچھے لکڑی کے بنے ہوئے بورڈ
لٹکا دی۔ میں نے رکشا پکڑا اور سٹیشن پر آگیا۔ سٹیشن پر مسافر اپنے ساز و سامان کے سا
ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ صرف جنوب کی طرف گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ سٹیشن سے
کر میں کچھ دیر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بانڈہ شہر زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ یہاں مسلمان بھی ر
تھے اور ہندو بھی۔ ایک جگہ گردوارے کی عمارت بھی نظر آئی۔ میں ایک چوک میں آ
سامنے سینما ہاؤس میں کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ چلو فلم ہی دیکھتے ہیں۔ کچھ وقت اس طرح کٹ جائے گا۔ ٹکٹ
کر میں گیلری میں آکر بیٹھ گیا۔ فلم پہلے سے چل رہی تھی۔ یہ کوئی کاؤ بوائز کی ویسٹرن
تھی۔ بس بیٹھا دیکھتا اور سوچتا رہا کہ میرا آئندہ کمانڈو مشن کیا ہونا چاہئے۔ اسرا
باشندے کے خفیہ ایٹمی راکٹوں والے کاغذات نے نہ صرف میرے جذبات کو مشتعل
ریا تھا بلکہ مجھے میرے کمانڈو مشن کی ایک اور سمت دکھا دی تھی۔ اس کا مطلب تھ
انڈیا کی حکومت پاکستان کے خلاف ایٹمی سطح پر جنگی تیاریاں شروع کر رہی تھی۔ اگر
قسم کے دور مار راکٹ اور میزائل بھارت کی حکومت تیار کر سکتی تھی تو اس کے آ

نیوکلر ڈیوائس لگا کر اسے ایٹمی راکٹ اور ایٹمی میزائل میں بھی تبدیل کر سکتی تھی اور ظاہر
ہے کہ یہ ساری جنگی تیاریاں اور ہلاکت خیز اسلحہ پاکستان کے خلاف ہی استعمال ہونے والا
تھا۔ انڈیا اس قسم کا اسلحہ اپنے دوسرے ہمسائے چین کے خلاف استعمال کرنے کی جرات
نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ میں اپنے وطن پاکستان کی سلامتی اور
تحفظ کی خاطر اپنی زندگی کی بازی لگا کر بھارت کے ان جارحانہ عزائم کو تباہ و برباد کر دوں گا۔
ابھی یہ راکٹ وغیرہ کاغذی تیاریوں کے ابتدائی مرحلوں میں تھے اور اس کے لئے انڈیا
گورنمنٹ نے امریکہ کی مدد سے اسرائیلی سائنس دانوں کا تعاون حاصل کیا ہوا تھا۔ اس کا
مطلب تھا کہ اب اسرائیل انڈیا کو پاکستان اور کشمیر کے مجاہدین کے خلاف نہ صرف اسلحہ
گولہ بارود دے رہا تھا بلکہ انڈیا کو ایٹمی طاقت اور ایٹمی صلاحیتیں بھی مہیا کر رہا تھا۔

میرا ذہن ایسے ہی خیالوں میں الجھا رہا اور فلم ختم ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ جب میں
ٹکٹ لے کر سینما ہال میں داخل ہوا تھا تو انٹرول ہو چکا تھا۔ بھارت کے کئی شہروں میں میں
نے دیکھا تھا کہ وہاں انٹرول تک ٹکٹ فروخت ہوتے رہتے تھے۔ میں ہوٹل میں واپس
آیا۔ اس وقت رات کے نو سوا نو بج چکے تھے۔ لابی کے کاؤنٹر پر مس شیلا کی جگہ کوئی
دوسری عورت موجود تھی۔ میں نے چابی لی اور اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے ہوٹل بوائے
نے آتا دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا وقفہ ڈال کر وہ میرے کمرے میں آیا اور سراغرسانوں کی طرح
میرے قریب آکر آہستہ سے کہنے لگا۔

"صاحب آج اس انگریز سے ملنے ایک میم بھی آئی تھی۔ دونوں بڑی دیر تک کمرے
میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے وسکی بھی منگوائی تھی۔ سر! مجھے تو یہ کوئی بڑا
خطرناک جاسوس لگتا ہے۔"

میں نے اسے ہنس کر ٹالتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں محمود! میں نے اس کے سارے کاغذ اچھی طرح سے دیکھے ہیں وہ کوئی
[illegible] ہے سول انجینئر جو سڑکیں یا پل وغیرہ بناتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ آج کھانے میں کیا
ہے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

محمود سراغ رساں سے ایک دم ہوٹل بوائے بن گیا اور اس نے کھڑے کھڑے ہوٹل میں جتنے کھانے پکے تھے سارے کے سارے دہرا دیئے۔ میں نے کہا۔

"تم ایسا کرو میرے لئے چکن کری اور خشکہ لے آؤ۔"

"اور میٹھے میں کیا لاؤں سر؟"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم کافی لے آنا بعد میں"

"یس سر!"

اور ہوٹل بوائے سلام کر کے چلا گیا۔

کھانا میں نے اکیلے ہی کھایا اور کافی بھی اکیلے ہی بیٹھ کر پی۔ مجھے مس شیلا کا انتظار تھا۔ میں اس سے اسرائیلی باشندے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ ذات شریف کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میں کچھ دیر صوفے پر بیٹھا سگریٹ پیتا اور ٹیلی ویژن پر لوکل خبریں سنتا رہا۔ بعد میں ٹیلی ویژن پر دریاؤں اور ٹرینوں کی صورت حال بتائی گئی جس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے ٹیلی ویژن بند کیا اور پلنگ پر لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

کوئی پونے گیارہ بجے کے قریب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ مس شیلا کی دستک تھی۔ لڑکیوں کی دستکوں کا بھی مجھے بڑا تجربہ ہو چکا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شیلا ہے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مس شیلا کی ریشمی ساڑھی میں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ میں آگے سے ہٹ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"میں نے سوچا کہیں کمار جی سو نہ گئے ہوں"

میں نے دروازے کو چٹخنی لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں آنا ہو اور میں سو جاؤں"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور پرس ایک طرف رکھ کر اپنے بلاؤز کو ہاتھوں سے ٹھیک کر رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"شیلا جی! کیا یہ بلاؤز بھی تمہیں تنگ ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے کمار جی۔ بس مجھے اس کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اونچا کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اصل میں میں نہیں چاہتی کہ میری باڈی کی شیپ خراب ہو"

اس دوران اس نے اپنے پرس میں سے سکاچ وسکی کا ایک کوارٹر نکال لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"آج میں اسی لئے تھوڑی وسکی لائی ہوں کہ میرے ساتھ تھوڑی سی تم بھی پیو گے۔ میں دن بھر کاؤنٹر پر احمق لوگوں سے باتیں کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ رات کو تھوڑی سی وسکی نہ پیوں تو مر جاؤں"

میں نے کہا۔

"نہیں شیلا جی میں نہیں پیئوں گا۔ میں نے کبھی پی ہی نہیں کہیں میری طبیعت نہ خراب ہو جائے۔"

مس شیلا نے وسکی کی چھوٹی بوتل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں طبیعت خراب نہیں ہونے دوں گی۔"

وہ اٹھ کر ڈائینٹ ٹیبل کی طرف گئی۔ وہاں سے شیشے کے دو گلاس اٹھا کر میز پر رکھے۔ پھر باتھ روم میں جا کر شیشے کے جگ میں پانی ڈال کر لے آئی۔

"بس تھوڑا سا سنگل پیگ بناؤں گی تمہارے لئے۔ ذرا میرا ساتھ رہے گا۔ تم کوئی ویشنو تھوڑے ہو اور آج کل تو ویشنو بھی خوب پیتے ہیں۔"

میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انکار کیسے کروں۔ میں کسی زمانے میں پیا کرتا تھا لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد اور ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے جب میں اپنی شہید بہن کلثوم کی جائے شہادت پر فاتحہ خوانی کرنے اور جہاد کشمیر میں شریک ہونے کے لئے پاکستان سے بارڈر کراس کر کے چلا تھا تو میں نے اس قسم کی تمام خرافات سے توبہ کر لی تھی۔ لیکن یہاں یہ مشکل آن پڑی تھی کہ مجھے مس شیلا سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو ہو سکتا ہے اس کا موڈ آف ہو جائے اور وہ ایک گلاس چڑھانے کے بعد چلی جائے۔ اور مجھ سے کسی

بارے میں بھی کوئی بات نہ کرے۔

اس اثنا میں وہ میرے گلاس میں تھوڑی سی سکاچ وسکی ڈال چکی تھی۔ اس نے پا
سے میرا آدھا گلاس بھر دیا۔ پھر اپنا ڈبل پیگ بنایا اور میرا گلاس میری طرف بڑھا کر ا
گلاس اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بولی۔

"چیئرز۔۔۔۔"

میں نے بھی اپنا گلاس اٹھالیا۔

"چیئرز۔۔۔"

میں نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔ ایک گھونٹ پیا اور میرے حلق میں آگ کی ایک
لکیر سی نیچے اتر گئی۔ مس شیلا غٹا غٹ تین چار گھونٹ پی گئی۔ اس نے پرس میں سے
اپنے سگریٹوں کی ڈبی نکالی ایک سگریٹ سلگا کر مجھے دیا۔ ایک سگریٹ لگا کر خود لیا
بولی۔

"اب ہوئی ناں بات۔ کمار جی! تم کو سوشل ہونا چاہئے۔ ہماری دوستی کو ایک دو
ہی گزرے ہیں۔ پر سچ کہتی ہوں کہ مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے"

میں نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگا
ہوئے کہا۔

"شیلا جی! یہ تو میرے سوبھاگ ہیں کہ تم ایسی سوشیل لڑکی مجھ سے پریم کرتی ہے۔"

مس شیلا نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"مگر تم کو تو اپنی پتنی سے پریم ہے۔ تم مجھ سے پریم بالکل نہیں کرتے۔ میں جانتی
ہوں"

میں نے دل میں کہا جانتی ہو تو جانتی رہو۔ جلدی سے شراب کا گلاس خالی کرو تا
تمہاری مت ماری جائے اور اسرائیلی باشندے کے بارے میں جو باتیں تم نے نہیں
بتائی وہ بھی مجھے بتا دو۔ یہاں میں آپ کو اور خاص طور پر اپنے نوجوان پڑھنے والوں
ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ وہ شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگائیں۔ میں کوئی نیک پاک آدمی نہیں

ہوں نہ ہی میں کوئی مولوی صاحب ہوں کہ جس نے کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔ میں
نے بہت شراب پی ہے اور اس شراب کے ہاتھوں مجھے جس قدر ذلت اور رسوائی اٹھانی
پڑی ہے وہ بھی میرے ضمیر کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ یاد رکھیں شراب سب سے پہلے
انسان سے اچھے برے کی تمیز چھین لیتی ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ کہاں بیٹھے
ہیں اور جس محفل میں آپ بیٹھے ہیں وہاں کس قسم کی بات کرنی ہے کس قسم کی بات
نہیں کرنی۔ شرابی کی آنکھوں میں ماں باپ بہن بھائی کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے۔ اور وہ
ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے نشے بھی آدمی کی ذلت و رسوائی کا باعث بنتے ہیں
اور آدمی کا کردار اس قدر گر جاتا ہے کہ وہ اپنا نشہ پورا کرنے کے لئے ہر ایک سے بھکاری
بن کر پیسے مانگنے لگ جاتا ہے۔ یہ انسانیت کی توہین کا مقام ہے۔ یہ ذلت کا وہ گڑھا ہے کہ
ایک بار نشہ کرنے والا اس میں گر جائے تو پھر کبھی باہر نہیں نکلتا۔ آپ اپنے آپ کو اس
گڑھے میں گرنے سے بچائیں اور سگریٹ شراب اور دوسری نشے والی چیزوں کو ہاتھ بھی
نہ لگائیں۔ دوسرا لاکھ کہے کہ یہ بڑی اعلیٰ شراب ہے اور یورپ کے لوگ بھی پیتے ہیں
اور انہوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ آپ دوسروں کی اس قسم کی باتوں پر یقین نہ کریں۔
ایک بات یہاں اور بھی یاد رکھیں۔ میں سارے یورپ امریکہ میں پھرا ہوا اور صرف پھرا
ہی نہیں وہاں مدت تک رہا بھی ہوں۔ یورپ امریکہ کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے کو
شراب اور جنسی بے راہ روی نے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ وہاں جس قسم کے
جرائم ہوتے ہیں ان کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے اور وہ لوگ اندر سے کس قسم کے
عذابوں میں مبتلا ہیں ان کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ مشرق
میں پیدا ہوئے ہیں اور مسلمان کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور آپ کے دین اسلام
نے آپ کو ایک مکمل ضابطہ اخلاق دیا ہے۔ میں نے شروع میں ہی آپ سے وعدہ کیا تھا
کہ اپنی داستان سناتے وقت میں جھوٹ بالکل نہیں بولوں گا۔ لہٰذا میں اس وعدے پر قائم
ہوں اور آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے بڑے گناہ کئے ہیں۔ بڑی شرابیں پی ہیں۔ بڑی
ذلتیں اٹھائی ہیں لیکن اپنے خداوند کریم کا شکر ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں

ہیں کہ اس نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی۔ بلکہ وہ مجھے سیدھی راہ پر لے آیا اور
کریں اب یہ حالت ہے کہ کوئی شراب کا نام لے تو میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو
ہے اور میں اس محفل سے اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔ آپ اپنے آپ کو شراب سگریٹ ا
قسم کے نشے سے بچا کر رکھیں۔ آپ پاکستان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ آپ نے پاکستان کا
اپنے ماں باپ کا نام روشن کرنا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا کریکٹر بلند
آپ باوقار ہوں۔ آپ کو اپنے اوپر پورا کنٹرول حاصل ہو اور آپ ہر قسم کی
ترغیبات سے بلند ہو کر دیانت داری سے اور محنت سے کام کریں تاکہ آپ دنیا میں
اور آخرت میں بھی سرخ رو ہو سکیں۔ یہ میں آپ کو نصیحتیں نہیں کر رہا بلکہ
ورسوائی کے گندے نالے دکھا رہا ہوں جن سے آپ کو بچنا ہے تاکہ آپ پاک
حیثیت سے ایک پاک صاف خوبصورت اور بلند کردار والی زندگی بسر کر سکیں۔

مس شیلا نے اپنا گلاس ختم کر لیا تھا۔ میں نے اپنے گلاس میں سے صرف
گھونٹ صرف اس لئے لے لیا تھا کہ یہ میرے وطن کی سیکورٹی کا مسئلہ تھا۔ یقی
تھوڑی سی شراب جو میرے حلق میں آگ بن کر اتر گئی تھی وہ میرے ضمیر کو جلا
اور میں دل ہی دل میں توبہ استغفار پڑھ رہا تھا۔ میرے گلاس میں باقی کی شراب ا
پڑی تھی پہلا ڈبل پیگ چڑھانے کے ساتھ ہی مس شیلا کی عقل اور اس کے شع
دفاعی مورچہ تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے اسرائیلی باشن
بارے میں پوچھا کہ یہ انگریز کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ مس شیلا نے اپنے
پیگ بناتے ہوئے کہا۔

"یہ انگریز کہاں ہے یہ تو یہودی ہے۔ jew ہے۔"

"اچھا اچھا۔ میرا خیال ہے یہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں بانڈہ آیا ہو گا۔ یہ
کاروباری لوگ ہوتے ہیں"

مس شیلا نے دوسرے پیگ کا ایک بڑا گھونٹ نگلنے کے بعد سگریٹ کا
بولی۔

"بانڈہ میں اس کا کوئی کاروبار وغیرہ نہیں ہے"

"تو پھر یہ ٹورسٹ ہو گا۔ انڈیا کی سیاحت کرنے آیا ہو گا"
میں نے جان بوجھ کر کہا۔

میں شیلا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان چھوٹی کافی ٹیبل تھا۔
وہ ٹیبل پر میری طرف جھک کر رازداری کے انداز میں کہنے لگی۔

"کمار جی! تم کچھ نہیں جانتے۔ تم انڈین ہو کر بھی نہیں جانتے کہ ہماری انڈین
گورنمنٹ ہماری ڈیفنس کے لئے کیا کچھ کر رہی ہے"
میں نے بھولپن سے کہا۔

"ہاں شیلا جی۔ سچ مچ میں اتنا نہیں جانتا جتنا آپ جانتی ہیں۔"
مس شیلا نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے کی بجائے میز پر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہماری گورنمنٹ نے نیوکلر پاور بننے کے لئے کام شروع کر رکھا ہے۔ ہم ایٹم بم
اور ایٹمی راکٹ ایٹمی میزائل بنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اس ٹارگٹ کو حاصل کرنے کے لئے
اپنے دوست ملک اسرائیل کی مدد حاصل کی ہوئی ہے۔ اسرائیل کوئی اتنا بڑا ملک نہیں
ہے لیکن اسے امریکہ کا نیوکلر تعاون حاصل ہے امریکہ کی مدد سے اسرائیل بہت جلد ایٹمی
طاقت حاصل کرنے والا ہے۔"

میں بیچ میں ہوں ہاں اور گڈ ویری گڈ کہہ کر شیلا کو شہہ دیتا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہی
تھی۔

"ہمارا اسرائیلی گورنمنٹ کے ساتھ پیکٹ ہوا ہے۔ اس لئے اسرائیلی فوجی مشیر
ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ فوجی ماہرین بھی آتے رہتے ہیں یہ جو اسرائیلی ہمارے ہوٹل
میں آکر ٹھہرا ہے یہ بھی اسرائیل انڈیا پیکٹ کے تحت ہی انڈیا میں مقیم ہے۔"
میں نے انجان بن کر کہا۔

"مگر مس شیلا ایٹم بم اور ایٹمی راکٹ بنانے پر تو اربوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔
اتنے روپے ہماری بھارتی حکومت کے پاس کہاں سے آئیں گے؟"

مس شیلا نے بازو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بھگوان دے گا۔ لکشمی دیوی ہم پر مہربان ہے ہمیں امریکہ سے بھی مدد مل رہ
ہے۔ کمار جی ہم اپنے دشمن کو شکست دینے کی خاطر ایک وقت کا بھوجن چھوڑ سکتے ہیں"

میں نے ایک بار پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا دشمن چین ہی ہے ناں؟"

وہ بولی۔

"چین بھی ہے مگر ہمارا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے۔ ہمیں پاکستان کو ختم
ہے۔ ہم اس لئے ایٹم بم اور ایٹمی راکٹ میزائل بنانے کے پروگرام پر عمل کر ر
ہیں۔"

میں نے کہا۔

"مگر شیلا جی پاکستان تو ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے۔ ہمیں اس سے ڈرنا نہیں چا
ہمارے انڈیا کے پاس تو بہت بڑی فوج ہے۔ پاکستان کے پاس تو اس کا تیسرا حصہ بھی
ہے۔"

شیلا نے کہا۔

"لیکن پاکستان ایک لڑنے مارنے والی بہادر قوم ہے۔ اس کا ایک سپاہی ہمارے
پچاس فوجیوں کا اکیلا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ پاکستان
فوجی مسلمان ہے۔ وہ اپنے مذہب کی خاطر اپنی جان قربان کرنی جانتا ہے۔ یہ بات ہمار
قوم میں اور ہماری فوج میں نہیں ہے۔ ہم ہندو لوگ بنیادی طور پر بزدل اور کاروبار
لوگ ہیں۔ ہم صرف دولت اکٹھی کرنا جانتے ہیں۔"

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ شراب کے دوسرے پیگ نے اس کے شعور کی دوسر
دفاعی لائن بھی اڑا دی تھی۔ اب وہ بات کرتے کرتے موضوع سے ہٹنے لگی تھی۔ میں
اس کو مزید کریدتے ہوئے کہا۔

"یہ اسرائیلی فوجی ایکسپرٹ کہاں جا رہا ہے؟"

مس شیلا نے دوسرا بلکہ تیسرا چوتھا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بڑا بدمعاش ہے یہ jew اس کی ایک گرل فرینڈ بھی اس کے ساتھ ہے۔ بھدی سی
ت ہے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ہم لوگ پہلے دلی جائیں گے۔ وہاں انڈین آرمی کے
ے ملاقات کرنی ہے۔ اس کے بعد بمبئی جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"بمبئی میں وہ فلم سٹوڈیو دیکھنے جا رہے ہوں گے"

مس شیلا کے دماغ اور شعور کی تیسری دفاعی لائن پر شراب نے اٹیک کر دیا تھا۔ اس
نہ سے پہلی بار میں نے بڑی فحش گالی سنی۔ گالی خدا جانے اس نے کس کو دی تھی۔
ی گی۔

"تم بھی کاروباری بزدل ہندو ہو۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ ارے بمبئی کے پاس
ایٹمی ری ایکٹر ہے۔ اسرائیلی وہاں جا رہا ہے۔ کیا سمجھے؟ تمہارا گلاس ابھی تک بھرا
کیوں ہے۔؟ یہ فیئر نہیں ہے۔"

میں نے اپنا گلاس نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"شیلا جی! میں نے اور پی تو میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ پھر میں تم سے پریم
کر سکوں گا"

پریم کے نام پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کمار جی! میں پہلی نظر میں تم کو اپنا دل یعنی ہارٹ دے بیٹھی تھی۔ ورنہ میں کسی کو
ھتی ہوں۔ یہاں ہزاروں آدمی آتے رہتے ہیں۔ میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی
یکھتی۔ مگر تمہیں دیکھتے ہی میں تم سے محبت کرنے لگی تھی۔ کمار جی! یہ تو ایٹ منٹ
ہوتی ہے۔ مائی گاڈ کیا سچ مچ تم مجھ سے پریم کرتے ہو کمار جی؟"

میں نے اس عورت سے اسرائیلی باشندے کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کرنی
تھیں کر چکا تھا اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہ کسی
میرے کمرے سے نکل جائے۔ وہ ایک بار باتھ روم گئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے

قدم ذرا سے لڑکھڑا گئے تھے۔

وہ اٹھ کر میرے صوفے پر آ گئی۔ میں نے دل میں کہا۔

"جل تو جلال تو آئی بلا ٹال تو"

وہ مجھ سے محبت کی باتیں کرنے لگی۔ میرے لئے اس وقت یہ محض وقت ضائع کرنے والی باتیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آدمی کے سامنے کوئی بڑا مشن ہو اور خاص کر دینی یا ملکی سیکورٹی کا مقصد ہو تو محبت وغیرہ کی باتیں بڑی جھوٹی باتیں لگتی ہیں۔

بس اب مجھ سے یہ نہ پوچھیں کہ میں نے اس عورت مس شیلا سے کس طرح نجات حاصل کی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ جب وہ میرے کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو مجھ سے ناراض تھی۔ مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ بلکہ جاتے ہوئے اس نے مجھے گالی بھی دی۔ اس کے جاتے ہی میں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے اوپر سے چٹخنی لگا لی اور ہاتھ منہ دو دو تین تین بار دھویا۔ شراب کی بوتل وہ اپنے پرس میں ڈال کر لے گئی تھی۔ جس میں ابھی کچھ شراب باقی تھی۔ میں نے ہیٹر بند کر دیا۔ اور کمرے کی دوسری کھڑکی کھول دی۔ دروازہ اس ڈر سے نہیں کھولا تھا کہ کہیں مس شیلا پھر اندر نہ آ جائے۔ کھڑکی میں سے صاف تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب کمرے کی فضا صاف ہو گئی تو میں نے بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

شمالی انڈیا میں سیلاب کی صورت حال کافی بہتر ہو گئی تھی دریا بھی معمول پر آ گئے تھے مگر ابھی تک ٹرینوں کی آمد و رفت بحال نہیں ہوئی تھی۔ ریلوے والوں کے مطابق ریلوے لائنوں میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے۔ مجھے بانڈہ کے ہوٹل میں جب چار روز گزر گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس پیسے ختم ہو رہے ہیں اور وقت بھی ضائع ہو رہا ہے۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ مجھے یہاں سے جبل پور کی طرف نکل جانا چاہئے۔ جبل پور سے مجھے کان پور اور دلی جانے والی ٹرین مل سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرف حالات اتنے خراب نہیں تھے۔

میں نے ریلوے سٹیشن جا کر پتہ کیا تو انہوں نے کہا کہ جبل پور سے اگر میں بلاس پور پہنچ جاؤں تو وہاں سے مجھے دلی جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ یہ بڑا الٹا سفر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ جبل پور کو گاڑی دوپہر کے بعد جاتی ہے۔ اس وقت دن کے دس گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ میں ہوٹل واپس آ گیا۔ سب سے پہلے میں نے ہوٹل بوائے محمود کو اپنی قمیض اتار کر دی اور کہا کہ اسے ایک گھنٹے کے اندر ڈرائی کلین کروا لائے۔ وہ میرا بڑا برخوردار بن گیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈرائی کلین کروا کر لے آیا۔ میں نے نہا کر قمیض پہن لی۔ اسرائیلی راکٹوں کا بلیو پرنٹ تعویذ کی شکل میں میرے بازو کے ساتھ باقاعدہ بندھا ہوا تھا۔ چیونگ گم ٹائم بم بھی ... بند میری جیب میں تھے۔ یہ ٹائم بم صرف چھ عدد ہی میرے پاس باقی رہ گئے تھے۔ ... ان کی بظاہر کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے ہوٹل میں کسی کو اپنے جانے کے بارے میں نہ بتایا۔ دوپہر کا کھانا میں نے ... بجے ہی کھا لیا اور کمرے کو تالا لگا کر چابی کاؤنٹر پر دی۔ مس شیلا وہاں نہیں تھی۔ خدا جانے رات کو کہاں سوئی ہو گی اور کس حالت میں ہو گی۔ مجھے اس سے بھی اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری نظریں اپنی اگلی منزل کی طرف تھیں۔ میں نے رکشا پکڑا اور بانڈہ کے سٹیشن پر آ گیا۔ جبل پور ناگ پور کی جانب ٹرینوں کی آمد و رفت ابھی تک جاری تھی۔ وہاں کسی نے یہ بھی کہا دریائے کاویری میں بھی سیلاب آ رہا ہے۔ شاید جبل پور سے آگے گاڑی نہ جائے۔ میں نے سوچا کہ چلو یہاں سے تو نکلتے ہیں۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ دوپہر کے بعد کوئی تین بجے کے قریب ایک گاڑی جبل پور سے آئی۔ اسی گاڑی نے واپس ناگ پور جانا تھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ بانڈہ سے جبل پور کا فاصلہ کافی ہے۔ ریلوے لائن جنوب کی طرف جاتی ہے۔ شام تک گاڑی معمول کے مطابق چلتی رہی۔ جب رات ہوئی تو ٹرین کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی اور وہ کسی کسی جگہ ٹھہر بھی جاتی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں جبل پور پہنچ گیا۔ جبل پور وسطی ہندوستان کا بڑا اہم جنکشن ہے۔ اس سٹیشن سے کئی طرف ٹرینیں جاتی تھیں۔

پتہ چلا کہ یہاں سے بلاس پور جانے والی گاڑی ناگ پور سے آئے گی تو پھر وہی
مسافروں کو لے کر بلاس پور جائے گی۔ رات کے دو بجے یہ گاڑی جبل پور پہنچی۔ میں
دوسرے مسافروں کے ساتھ اس میں سوار ہو گیا۔ مسافروں نے بتایا کہ دریائے کاویری
چڑھا ہوا ہے۔ یہاں سے گاڑی نے ریلوے لائن بدل لی تھی اور جنوب کی طرف جانے
بجائے اوپر شمال کی طرف رخ کر لیا تھا۔ ساری رات ٹرین چلتی چلی گئی۔ اگلے روز
ہوئی تو ٹرین بلاس پور سے ابھی کافی دور تھی۔ دونوں جانب کبھی کھیت آجاتے۔ کبھی گھ
کے میدان اور اونچی نیچی پہاڑیاں اور پتھریلے ٹیلے آجاتے۔ کئی ندیاں گزریں۔ سب
سب ندیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان کا پانی کناروں سے نکل کر کھیتوں اور میدانوں میں
رہا تھا۔ ایک جگہ ٹرین بڑی آہستہ ہو گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر د
ریلوے لائن کی دونوں جانب پانی ہی پانی تھا۔

ایک سٹیشن آیا تو ٹرین وہاں کافی دیر رکی رہی۔ ایک مسافر نے ڈبے میں واپس
بتایا کہ آگے دریا میں سیلاب ہے۔ ریلوے لائن ٹوٹ چکی ہے اس لئے یہاں سے
ناگ پور کیلاش پور کی طرف سے ہو کر بلاس پور جائے گی۔ میں عجیب مصیبت میں پھ
گیا تھا۔ دلی پہنچنا محال ہو گیا تھا۔ مگر میں سوائے صبر کرنے کے اور کچھ کر بھی نہیں
تھا۔ ٹرین وہیں سے ناگ پور جانے والی ریلوے لائن پر آ گئی۔ ناگ پور کی طرف وسطی
کے تاریک جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ ان جنگلوں کی پہاڑیاں دور سے دکھائی دے
تھیں۔ زمین زیادہ تر جنگلاتی تھی۔ اونچی نیچی بھی تھی۔ کہیں پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ
ہوا تھا۔ جنگل کے درختوں کے جھنڈ ریلوے لائن کی دونوں طرف نمودار ہوتے تو
ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔ ختم ہوتے تو گھاس کے میدان شروع ہو جاتے جن میں
کہیں کھیتیاں نظر آجاتی تھیں۔ ہمارے وزیر آباد گوجرانوالہ حافظ آباد کی طرح دور
تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت یہاں بالکل نہیں تھے۔ مسافروں کی زبان بھی
گئی تھی۔ ان کے رنگ کالے اور قد چھوٹے ہونے لگے تھے۔ یہ تامل اور زیادہ تر
زبان بولتے تھے مگر ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان بھی بولی جا رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار

ہو گئی تھی۔ یہ سارے کا سارا علاقہ کسی دریا کے سیلاب کی زد میں آ چکا تھا۔
کچھ خبر نہیں تھی گاڑی کس طرف جا رہی ہے اور کہاں پہنچائے گی۔ ایک جگہ ٹرین
ک گئی۔ آگے ریلوے لائن کی مرمت کی جا رہی تھی۔ یہاں سے رینگتی ہوئی چل کر وہ
منگیالی نام کے ایک نیم پہاڑی چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر آکر رک گئی۔ جب اسے
کے کافی دیر ہو گئی تو میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ اتر کر آگے گیا۔ وہاں ایک ٹی
ی کھڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ آگے ریلوے لائن سیلاب میں بہہ گئی ہے۔ کچھ پتہ نہیں گاڑی
تنی دیر یہاں رکے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جبل پور واپس جانا پڑ جائے۔
مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔ مگر اندر ہی اندر غصہ پی رہا تھا۔ مسافر بھی دل ہو کر پلیٹ
فارم پر اتر آئے۔ یہ ویران ویران سا سٹیشن تھا۔ کسی نے بتایا کہ منگیالی کا قصبہ اپنی بید کی
یوں اور سانپوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ جب پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے اور ٹہلتے
میں تنگ آگیا اور ٹرین کے آگے جانے یا واپس جانے کے بارے میں بھی ابھی کوئی
نہ ہوا تھا تو میں نے سوچا کہ منگیالی قصبے میں ہی چلا جائے۔ کچھ وقت اسی طرح گزر
ے گا۔ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید اس قصبے سے آگے جانے والی کوئی لاری وغیرہ
جائے۔ کیونکہ لاریاں اور بسیں خطرہ مول لے کر بھی چلتی رہا کرتی ہیں۔
منگیالی کا قصبہ پہاڑی اور نیم پہاڑی دونوں کے درمیان تھا۔ کہیں زمین اونچی تھی
ں ڈھلان تھی۔ دو تین خالی خالی سے بازار تھے جن میں ایک منزلہ اور دو منزلہ پتھر کی
روں والے مکان ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ لوگ دیہاتی قسم
تھے اور ہندوؤں کی طرح دھوتی کرتوں میں ملبوس تھے۔ کئی لوگوں کے بدن پر سوائے
ی دھوتی کے اور کچھ نہیں تھا۔ بڑی غریبی تھی۔ کالے کالے بیمار بیمار سوکھے
تھے۔ کئی دکانوں پر بید کا بنا ہوا سامان مثلاً ٹوکریاں وغیرہ بک رہی تھیں مگر گاہک نہ
نے کے برابر تھے۔ میں نے سن لیا تھا کہ یہ قصبہ اپنے زہریلے سانپوں کی وجہ سے بھی
ر ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں کوئی سپیرا نظر نہ آیا تھا۔ کیونکہ جہاں سانپ زیادہ ہوں
ہاں سپیرے ضرور ہوا کرتے ہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے میں قصبے سے باہر آگیا۔ اس وقت سورج دور بھورے رنگ کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے درمیان یونہی سیر کرتا چلا جا رہا تھا۔ سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کہیں کہیں کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ناریل اور تاڑ کے درخت کھیتوں کے کناروں پر اگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے دامن میں درختوں کے جھنڈ ہی جھنڈ تھے۔ خدا جانے یہ کس قسم کے درخت تھے کہ ان کی چھتریاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ میں دائیں جانب مڑ گیا کہ یہاں سے واپس سٹیشن پر چلتا ہوں۔ جس طرف میں مڑا تھا ادھر ایک چھوٹا سا پہاڑی راستہ جھاڑیوں میں سے جا رہا تھا۔ میں نے ایک درخت کے نیچے ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ عورت میری جانب دیکھ رہی تھی۔

اس کے قریب سے گزرنے لگا تو عورت ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھی عورت تھی۔ رنگ سیاہ اور بدن پر صرف ایک ساڑھی ہی تھی۔ میں اسے فقیرنی سمجھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے مجھے نمسکار کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"بیٹا کیا تم مسلمان ہو؟"

میں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"ہاں مائی میں مسلمان ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو"

وہ بوڑھی عورت روتے ہوئے میرے پاؤں پر گر پڑی اور بار بار سجدے کرنے لگی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو مائی؟"

بوڑھی عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ روتے ہوئے بلک بلک کر کہنے لگی۔

"بیٹا تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری بیٹی کی جان بچا لو۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ میں اس کی بیٹی کی جان کیسے اور کہاں بچا سکتا ہوں وہاں سوائے

اس عورت اور میرے تیسرا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"مائی میں تمہاری بیٹی کی جان کیسے بچا سکتا ہوں یہ لو ایک روپیہ۔"

بوڑھی عورت نے روتے روتے کہا۔

"بیٹا! میں بھکارن نہیں ہوں۔ میں مصیبت کی ماری عورت ہوں۔ میری بیٹی کو ایسی بیماری لگ گئی ہے کہ وہ دو دن سے بے ہوش پڑی ہے۔ ہمارے گوروجی نے کہا ہے کہ تم شام میں سورج غروب ہونے سے پہلے اس راستے پر آ کر کھڑی ہو جاؤں اور مجھے کوئی مسلمان مل جائے تو میری بیٹی کی جان بچ جائے گی"

مجھے اس عورت سے ہمدردی پیدا ہونے لگی تھی۔ بے چاری مامتا کی ماری تھی۔ میں نے پوچھا۔

"مائی! کسی مسلمان کے مل جانے سے تمہاری بیٹی کی جان کیسے بچ سکے گی"

عورت نے آنسو ساڑھی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! گوروجی نے کہا ہے کہ اگر وہ مسلمان میری بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دے تو میری بیٹی بھلی چنگی ہو جائے گی بیٹا میں کتنی سوبھاگن ہوں کہ مجھے تمہارے روپ میں ایک مسلمان مل گیا ہے۔ مجھ پر دیا کرو مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے ساتھ چل کر اپنے ہاتھ سے میری بیٹی کو پانی پلا دو۔ میری بچی کی جان بچ جائے گی۔ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اگر مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ ندی میں کود کر جان دے دوں گی۔"

میں نے سوچا کہ اگر میرے پانی پلانے سے اس عورت کی بیٹی کی جان بچ سکتی ہے تو مجھے اس کے ساتھ ضرور چلے جانا چاہئے۔ اگر یہ محض توہم پرستی ہی ہو تب بھی مجھے اس دکھی ماں کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اس کی بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دینا چاہئے۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ انسانی ہمدردی کا بھی یہی تقاضا ہے۔ میری ٹرین کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب واپس روانہ ہوتی ہے۔ گارڈ نے تو یہی کہا تھا کہ آدھی رات تک ہمیں آگے لائن کی حالت بہتر ہونے کا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے عورت سے کہا۔

"مائی تمہارا گھر کتنی دور ہے؟"

بوڑھی عورت نے ہاتھ باندھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے اور میرا بار بار شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! وہ سامنے درختوں میں ہے۔ بھگوان تیرا بھلا کرے بیٹا۔ تو نے ایک دکھیا ماں کی پکار سن لی۔"

وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ ہم ہندو لوگ ہیں اور دیویکا دیوی کی پوجا کرتے ہیں مگر ہمارے گوروجی ہندو مت کے ساتھ مسلمانوں کے دھرم کو بھی بڑا اچھا سمجھتے ہیں۔ اسی واسطے انہوں نے میری بیٹی کو دو دن سے بے ہوش دیکھ کر کہا تھا کہ اگر اسے کوئی مسلمان اپنے ہاتھ سے پانی پلائے گا تو وہ مرے گی نہیں ورنہ مرجائے گی۔

ہم درختوں کے جھنڈ کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ درختوں کے انہی جھنڈوں کا پہلا جھنڈ تھا جو پہاڑی کے دامن میں مجھے اس طرف مڑتے ہی نظر آئے تھے۔ اس طرف سے ایک پگ ڈنڈی کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی تھی لیکن میں اس طرف نہ مڑا اور بوڑھی عورت کے ساتھ چلتا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہم درختوں کے درمیان بنے ہوئے بانس اور ناریل کی شاخوں سے بنے ہوئے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔

عورت ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بیٹا! میری بیٹی اندر ہے۔ اندر جاؤ"

میں اس کے ساتھ جھونپڑے میں داخل ہوگیا۔ جھونپڑے میں خشک پتوں کے فرش پر ایک جوان عورت سیدھی لیٹی بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے سر کی جانب مٹی کی دو چھوٹی مٹکیاں پڑی تھیں جن کے اوپر مٹی کے پیالے اوندھے پڑے تھے۔ میں نے جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اس کا سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ بوڑھی عورت رونے لگی۔

"بیٹی! تیرے بھاگ جاگ اٹھے۔ مسلمان بھائی تیری مدد کو آگیا ہے۔ گوروجی کا وچن پورا ہوگا تو اچھی ہو جائے گی۔"

بوڑھی عورت نے جلدی سے ایک مٹکی میں سے تھوڑا سا پانی پیالے میں ڈالا اور میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! اپنے شبھ ہاتھوں سے میری بیٹی کو ایک گھونٹ پانی پلا دے۔ بھگوان میری بیٹی کو اچھا کر دے گا۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے بے ہوش لڑکی کا سر تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ اس کی ماں نے لڑکی کا سر پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے لڑکی کا منہ تھوڑا سا کھولا اور پیالہ اس کے منہ کے ساتھ لگا کر پانی اس کے منہ میں ڈال دیا۔ لڑکی کو کھانسی آگئی۔ اس کی بوڑھی ماں خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے مارے آنسو بہنے لگے۔ مجھے دعائیں دے دے کر کہتی جاتی تھی۔

"بیٹی کو ہوش آگیا۔ میری بچی کو ہوش آگیا ہے بھگوان میرے مسلمان بیٹے کو ساری عمر خوش رکھنا۔ ہے بھگوان تو نے میری اکلوتی بچی کی جان بچالی---"

لڑکی کو ہوش ضرور آگیا تھا مگر اس نے ابھی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ بوڑھی عورت نے لڑکی کا سر آہستہ سے خشک پتوں پر رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"بیٹے تو نے مجھ بیوہ عورت پر بڑی کرپا کی ہے۔ اب ایک اور کرپا کر کے میرے ہاتھ سے میٹھا شربت تھوڑا سا پی لے۔ یہ شبھ شگون ہے۔"

اس نے دوسری مٹکی سے مٹی کے پیالے میں شربت تھوڑا سا ڈال کر میرے ہاتھوں میں پیالہ تھمایا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"میرے بیٹے! میں تمہاری جنم جنم کی ابھاری رہوں گی۔ تو نے میری بچی کی جان بچا لی۔"

میں نے اس عورت کا دل رکھنے کے لئے شربت کا ایک گھونٹ پی لیا۔ شربت شاید گڑ کا تھا۔ بڑا میٹھا۔ میں نے ایک ہی گھونٹ پیا اور پیالہ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ماتا جی اب میں چلتا ہوں۔ مجھے سٹیشن پر پہنچنا ہے۔"

بوڑھی عورت نے میرے قدموں پر گر کر مجھے سجدہ کر دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر
ہوئے روئے جا رہی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"مائی یہ نہ کرو۔ یہ ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

عورت ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ م
طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ پہلے والا عجز وانکسار اور آنسو نہ
تھے۔ اس دوران لڑکی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں لڑکی کی طرف ایک نگاہ ڈال
جھونپڑے سے باہر چلا گیا۔ دو تین قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں ماں بیٹی جھونپڑ
کے باہر کھڑی تھیں اور مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی ہا
جوڑ کر مجھے الوداعی نمسکار نہ کیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ آدمی کی جب غرض پوری ہ
جاتی ہے تو وہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے۔ میں بمشکل چھ سات قدم چلا ہوں گا کہ مجھے چکر
آیا۔ یہ چکر اتنا شدید تھا کہ درخت میری آنکھوں کے آگے گھوم گئے اور میں زمین پر
پڑا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو بانس کی ایک چارپائی پر اس طرح جکڑ
ہوئے پایا کہ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چارپائی کے ساتھ بندھے ہوئے ت
سب سے پہلا خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ دو
عورتیں فراڈ تھیں۔ سوال یہ تھا کہ یہاں مجھے کس لئے لایا گیا ہے۔ یہ کون لوگ ہ
انہوں نے مجھے کس مقصد کی خاطر چارپائی پر باندھ رکھا ہے۔ ان سوالوں میں سے ک
جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے پورا زور لگا کر اپنے ہاتھوں کی رسیاں تڑا
کوشش کی مگر میرے دونوں ہاتھ الگ الگ کر کے سرہانے کی جانب چارپائی کے بانس
ساتھ اتنے پکے کر کے باندھے گئے تھے اور رسیاں کچھ اس قسم کی تھیں کہ میرے
لگانے سے وہ میری کلائیوں میں دھنستی محسوس ہوتی تھیں۔

میں حیران پریشان بھی تھا اور بے بس بھی تھا۔ یا اللہ! یہ میرے ساتھ اچانک کیا

پش آگیا ہے۔ آخر وہ فراڈ عورت کون تھی جس نے ایک جھوٹا ڈرامہ رچا کر مجھے اپنے
جال میں پھنسایا اور پھر بے ہوشی کا شربت پلا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ یہ چھوٹی سی نیم
روشن کوٹھڑی تھی جس کی سامنے والی دیوار کے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ کوٹھڑی میں
سوائے اس چارپائی کے جس پر میں جکڑا ہوا تھا اور کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ دیواریں
لگ رہی تھیں جیسے کسی پہاڑی کے اندر یہ کوٹھڑی بنائی گئی ہو۔ دیوار میں پتھر ابھرے
ئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اسرائیلی ایٹمی راکٹوں والے بلیو پرنٹ کا تعویذ میرے
کے ساتھ ہی بندھا ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے یہ نہیں اتار لیا۔ میں
پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا ورنہ دیکھتا کہ میرا بٹوہ اور وہ ڈبی
ں میں چھ چیونگ گم بم ہیں میری جیب میں ہے یا نہیں ہے۔

میری حالت ایسی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ پر رحم آگیا۔ اتنا بے بس میں نے اپنے
پ کو شاید ہی کبھی محسوس کیا ہو۔ مجھے اس نیم روشن غار نما کوٹھڑی کا کوئی دروازہ دکھائی
ں دے رہا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا
طلب تھا کہ بے ہوش ہونے کے بعد کافی وقت گزر گیا تھا۔ ضرور اس وقت رات کے
ں گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ مجھے باہر آدمیوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ
آوازیں وہاں جہاں کہیں بھی دروازہ تھا وہاں آکر رک گئیں۔ ایک دم ساری آوازیں
اموش ہو گئیں۔ پھر اچانک بین بجنے لگی۔ یہ بین سانپ کو نچانے کے لئے بجائی جاتی
ہے۔ کوئی پانچ ایک منٹ تک کوٹھڑی کے باہر بین بجتی رہی۔ اچانک بین خاموش ہو گئی۔
کوئی باہر دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ دروازہ کھل گیا۔ مجھے دیئے کی روشنی میں چار
عجیب وغریب حلیے والے آدمی نظر آئے۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے پگڑ بندھے تھے۔
گلے میں منکوں کی مالائیں تھیں۔ سب کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رنگ کالے تھے۔
بدن پر گیروے رنگ کے لمبے لمبے کرتے تھے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں بین تھی۔

انہوں نے آتے ہی میری چارپائی کو اٹھایا اور کوٹھڑی سے نکال کر ایک غار نما راستے
ں ایک طرف چل پڑے۔ غار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دیوار میں طاق تھے جہاں

دیئے جل رہے تھے۔ یہ کوئی جنگلی قبیلے کے لوگ تھے۔ شکل وصورت اور بین کی وجہ سے
مجھے یہ سپیرے لگے۔ مجھے ٹرین میں سفر کرتے اس آدمی کی بات یاد آگئی جس نے اس
کے بارے میں کہا تھا کہ یہاں کی بید کی ٹوکریاں اور سانپ بڑے مشہور ہیں۔ تو کیا
سپیرے مجھے سانپوں کے آگے ڈالنے کے لئے لے جا رہے تھے۔ میرا ذہن ماؤف نہیں
تھا۔ میں پوری طرح ہوش وحواس میں تھا اور برابر وہاں سے فرار ہونے کے بارے
سوچ رہا تھا۔ لیکن اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے لے کر کہاں جا رہے ہیں۔

یہ کوئی غار تھا جو پہاڑی کے اندر ہی اندر ادھر ادھر گھومتا ہوا خدا جانے کس طرف
چلا جاتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچنے کے بعد مجھے بین کی آواز آنے لگی۔ یہ ایک بین نہیں تھی
بلکہ تین چار بینیں اکٹھی بج رہی تھیں۔ میری چارپائی ذرا آگے گئی تو ایک ہال کمرہ آگیا
چھت اونچی تھی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ دیوار کے آگے چبوترا بنا ہوا تھا چبوترے
پھن دار سانپ کا بہت بڑا بت نصب تھا۔ چبوترے کی دونوں جانب بڑے بڑے پگڑوں والے
لمبے لمبے گیروے کرتوں والے آدمی زمین پر خاموش بیٹھے تھے۔ وہ سب سپیرے ہی
سکتے تھے۔ دو سپیرے سانپ کے بت کی ایک جانب اور دو سپیرے سانپ کے بت
دوسری جانب بیٹھے بین بجا رہے تھے۔ ان کے آگے سانپوں کا ایک ایک جوڑا جھوم رہا تھا
بت کے بالکل آگے دو لمبے لمبے پتھر کے سٹریچر قسم کے چھوٹے چبوترے بنے ہوئے تھے
میری چارپائی ان میں سے ایک سٹریچر نما چبوترے پر لا کر رکھ دی گئی۔

ایک بوڑھا سپیرا ایک طرف سے نکل کر میری طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا
لمبوترا ڈول تھا۔ وہ میرے سرہانے کی جانب آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک بوڑھے سپیرے نے
کر میرا منہ کھولنے کی کوشش کی تو میں نے اسے پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"تم لوگ کون ہو۔ مجھے یہاں کس لئے باندھ رکھا ہے؟"

جس بوڑھے سپیرے کے ہاتھ میں مٹی کا ڈول تھا اس نے کہا۔

"ہم تمہیں کچھ کھلا پلا رہے ہیں۔ اگر تم نے نہ کھایا تو مرجاؤ گے"

بوڑھے نے ڈول میں سے کسی پھل کے ٹکڑے نکال کر میرے منہ میں ڈالے

پھل شیریں اور لذیذ تھا۔ اس میں کیلے اور سنگترے کی خوشبو تھی۔ پھل کھلانے کے بعد
بوڑھے نے اسی ڈول میں سے پھلوں کا شربت قسم کا کوئی مشروب میرے منہ میں تھوڑا کر
کے ڈالا۔ اس سے میرے بدن میں توانائی آگئی۔ مگر میری توانائی میرے کسی کام نہیں آسکتی
تھی کیونکہ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔
چاروں سپیرے برابر بین بجا رہے تھے اور ان کے سامنے سانپوں کے جوڑے پھن کھولے
جھوم رہے تھے۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کہاں میں ایک محب وطن کمانڈو جو اپنے وطن
پاکستان کے تحفظ کی خاطر اور جہاد کشمیر میں ایک مسلمان کی حیثیت سے شرکت کرنے کی
خاطر انڈیا میں آیا تھا اور کہاں ان وحشی سپیروں کے چنگل میں آکر پھنس گیا ہوں۔ جن
لوگوں نے انڈیا کے جنگل پہاڑ اور خاص طور پر وسطی انڈیا کے جنگلی قبائل کو نہیں دیکھا وہ
اتنی آسانی سے یہ باتیں نہیں سمجھ سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ زمانے
میں بھی انڈیا کے دور دراز دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسے ایسے گمنام وحشی قبیلے
آباد ہیں کہ جو پتھر کے زمانے کے انسان کی طرح نہ صرف قدرت کے مظاہرات مثلاً آگ
پانی دریا پہاڑ اور درختوں کی پوجا کرتے ہیں بلکہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے واسطے
اپنے بچوں اور دوسروں کے بچوں کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اخبار میں
ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ بھارت کے فلاں صوبے کے پہاڑی گاؤں میں ایک آدمی نے
کالی ماتا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بچی کو کالی ماتا کے بت کے آگے لے جا کر ہلاک
کر دیا۔ جب ایسے آدمی کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ آدمی عدالت
میں یہی بیان دیتا ہے کہ مجھے خواب میں کالی ماتا نے کہا تھا کہ اپنی بچی کی قربانی دو۔ میں تم
سے خوش ہوں گی۔

ایسا ہی سپیروں کا کوئی یہ قبیلہ بھی تھا جس کے چنگل میں بدقسمتی سے پھنس گیا تھا۔
آپ ہرگز خیال نہ کریں کہ میں اپنی سچی داستان آپ کو سناتے سناتے محض منہ کا ذائقہ
بدلنے کے لئے یا دہشت پیدا کرنے کے واسطے اس طرح کا واقعہ بیان کرنے لگ گیا ہوں۔

نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کوئی داستان گو یا افسانہ نگار نہیں ہوں۔ میں تو
تمام واقعات آپ کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ پیش آتے رہے۔ وقت یہ ہے کہ
آپ کو ان جنگلوں میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ جو لوگ ان جنگلوں میں رہ
چکے ہیں یا انہیں ان خطرناک جنگلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ میری باتوں کو کبھی نہ
جھٹلائیں گے اور کبھی نہیں کہیں گے کہ میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے اس
کے خوفناک واقعات بیچ میں لے آیا ہوں۔ آپ ذرا ایک بار بھارت کے ان وسطی
جنوبی جنگلوں میں نکل کر دیکھیں۔ پھر آپ افریقہ کے خوفناک جنگلوں کے بارے میں
دہشت ناک کہانیاں مشہور ہیں انہیں بھول جائیں گے۔ اس میں انڈیا کی گورنمنٹ
کے آئین کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان دور دراز دشوار گزار جنگلوں میں صدیوں سے
وحشی اور نیم وحشی قبیلے شروع ہی سے وحشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور جنوب میں جہاں
سانپوں کو دیوتاؤں کے اوتار سمجھ کر ان کی پوجا ہوتی ہے وہاں تو ایسی ایسی کہانیاں جنم لیتی
ہیں اور ایسے ایسے ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سامنے آتے ہیں
انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آج کی ترقی یافتہ سائنسی دنیا میں بھی ایسا ہو سکتا ہے
آج بھی جنوب مشرقی بھارت کے صوبوں میں جہاں ناگ دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور لوگ
سانپوں کو دیوتا سمجھتے ہیں آپ کسی سانپ کو مار نہیں سکتے۔ میں مدراس کے قریب ایک
گاؤں میں گیا تو میں نے گھروں کے صحن میں سانپوں کو یوں ادھر ادھر رینگتے دیکھا جس
طرح ہمارے دیہات کے مکانوں میں مرغیاں پھرتی ہیں۔ گھر کے بچے عورتیں ان سانپوں
کو گلے میں ڈالے ان سے کھیل رہے تھے۔ انہیں دودھ پلا رہے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا
یہ سانپ انہیں کچھ نہیں کہتے۔ کوئی چور گھر میں گھس آئے تو اسے ضرور ڈستے ہیں
انسانوں کے اعضائے تخلیق کی تو بھارت کے شہری مندروں اور گھروں میں بھی عام
ہوتی ہے۔ اس کو وہ شیو لنگ کی پوجا کہتے ہیں۔ ان باتوں کو ان حقیقتوں کو آپ کے
بیان کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ بھارت میں کوئی ایک ہندو دھرم نہیں ہے
دھرم کے بے شمار فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے دیوتاؤں کی اپنے حساب سے

انداز میں پوجا کرتا ہے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں میں لاکھ فرقے ہیں مگر آوا
گون پر سبھی فرقے متفق ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ میری داستان میں پڑھ چکے
ہیں کہ میں نے راجستھان کے ایک دھرم استھان میں رہ کر جین مت کی پوری تعلیم حاصل
کی تھی۔ جین دھرم میں آواگون کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جاتا جس طرح ہندو برہمن
اسے تسلیم کرتے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف اتنا کہہ کر اپنی داستان کی
طرف آتا ہوں کہ ہم جیسے بھی مسلمان ہیں ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں
مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔

اب میں وسطی ہند کے اس پہاڑی غار میں آتا ہوں جہاں میں پراسرار سپیروں کے
قبیلے کے قابو میں آگیا تھا اور ابھی تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک
کرنے والے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ چار سپیرے بڑے بڑے پگڑ باندھے
لمبے لمبے گیروے کرتے پہنے ناگ کے بت کی دونوں جانب بیٹھے بین بجا رہے تھے اور میں
رسیوں سے جکڑا ہوا بانس کی چارپائی پر پڑا تھا۔ اور چارپائی ناگ کے بڑے بت کے آگے
چبوترہ نما ذرا سے اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ چار آدمی
ایک اور چارپائی اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اس چارپائی پر کوئی عورت رسیوں میں جکڑی
ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بال دیکھے جو سرہانے کی جانب چارپائی سے نیچے لٹک رہے
تھے۔ بین کے شور میں ان آدمیوں نے یہ چارپائی لاکر میرے ساتھ والے چبوترے پر رکھ
دی۔ میں نے نظریں پھیر کر دیکھا۔ چارپائی پر جو عورت بندھی ہوئی تھی وہ لڑکی لگتی تھی۔
اس کا رنگ زرد تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ خوف کے مارے نیم مردہ ہو رہی تھی۔
اس کے حلق سے یہ جملے نکل رہے تھے۔

"مجھے نہ مارو۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے چھوڑ دو۔ اماں مجھے بچالو۔"

میں چونکا۔ یہ لڑکی بھی میری طرح مسلمان تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ کسی
خاص مقصد کے لئے ایک مسلمان مرد اور ایک مسلمان عورت کو پکڑ کر لائے تھے۔ بین کا
شور بہت تھا۔ اس شور میں دونوں بڑے بڑے پگڑوں والے بوڑھے سپیروں نے ہماری

چارپائیوں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد وہ ناگ دیوتا کے آگے جھک کر پیچھے ہٹ گئے۔

اب دو سپیرے ہاتھوں میں پٹاریاں لے کر آگے بڑھے۔ ایک سپیرا لڑکی کی چارپائی کے پاس اور ایک سپیرا میری چارپائی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے ایک ہی وقت پر حلق سے عجیب سی آوازیں نکالیں اور پٹاری کھول کر ہم پر انڈیل دی۔ لڑکی کی چیخیں نکل گئیں۔ پٹاری میں سے چھوٹے بڑے کتنے ہی سانپ نکل کر ہمارے بندھے ہوئے جسم پر رینگنے لگے۔ میں خود بھی دہشت زدہ ہوگیا۔ کئی قسم کے سانپ میری گردن بازوؤں، ٹانگوں اور سینے پر ادھرادھر رینگتے پھرتے تھے مگران میں سے کسی نے مجھے ڈسا نہیں تھا۔ تمام سپیرے نعرے لگا رہے تھے۔

"ناگ منی کی جے۔ ناگ منی کی جے"

یہ خوفناک کھیل یا پوجا کوئی دس منٹ تک جاری رہی۔ اس کے بعد چار آدمی لڑکی کی چارپائی اٹھا کر لے گئے۔ لڑکی یقیناً خوف کے مارے بے ہوش ہو گئی تھی کیونکہ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ چار سپیروں نے میری چارپائی اٹھائی اور مجھے میری کوٹھڑی میں لا کر ڈال دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک میں زندہ تھا۔ ابھی تک ان وحشی سپیروں نے مجھے سانپوں سے ڈسوا کر ہلاک نہیں کیا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا گیا۔ سپیرے چلے گئے۔ ان کے قدموں اور باتیں کرنے کی آوازیں آہستہ آہستہ دور جا کر خاموش ہو گئیں میں چارپائی پر رسیوں میں جکڑا ہوا پڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس عذاب سے مجھے کس طرح نجات مل سکتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر پوری طاقت کے ساتھ رسیوں کو توڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اب میرا جسم اکڑنے لگا تھا اور یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ہمت کچھ دیر بعد جواب دے دے گی میں تربیت یافتہ نڈر جان کمانڈو تھا۔ مگر جس طرح مجھے جکڑ دیا گیا تھا وہاں میری سخت جانی اور کمانڈو ٹریننگ میرے کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزری

تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کو یاد کر کے دعائیں مانگنے لگا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کہ مجھے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی تالا کھول رہا ہے۔

میں یہی سمجھا کہ کوئی سپیرا کوئی رسم پوری کرنے آیا ہو گا۔

طاق میں دیا جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔ درو
لوہے کا تھا۔ اس کے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ اندر آنے والا
سپیرا نہیں تھا بلکہ ایک دبلی پتلی دراز قد لڑکی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند
دیا۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پاس آئی اور مجھ سے کوئی بات کئے بغیر میرے ہاتھو
رسیاں کھولنے لگی۔ مجھے ایسے لگا کہ اس لڑکی کو میں نے کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں
اس سے پوچھا۔

”کیا مجھے سانپوں کے کھڈ میں پھینکنے کے لئے لے جا رہی ہو؟“

لڑکی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خاموش رہو۔“

اب میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو جھونپڑی کے اندر
پر بے ہوش پڑی تھی اور بوڑھی عورت یہ کہہ کر مجھے اس کے پاس جھونپڑی میں
آئی تھی کہ تم مسلمان ہو بیٹا۔ میری بیٹی کو اپنے ہاتھ سے پانی پلا دو۔ میری بیٹی ک
جائے گی۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

”تم وہی جھونپڑی والی لڑکی ہو ناں؟ تم نے اور تمہاری ماں نے دھوکے سے
لوگوں کے ہاں پھنسا دیا ہے۔ میں اگر زندہ بچ گیا تو تمہیں نہیں چھوڑوں گا“

اس دوران لڑکی میرے دونوں کلائیوں کی رسیاں کھول چکی تھی۔ اس نے ا

میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

”تم اسی طرح بولتے جاؤ گے تو ضرور زندہ نہیں بچو گے۔ میں تمہیں ان لوگوں کی قید
نکالنے آئی ہوں۔ زبان بند رکھو“

میرے بدن میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کیا واقعی یہ لڑکی مجھے ان خونی سپیروں کی قید
آزاد کرانے آئی تھی؟ اس نے میرے پاؤں بھی کھول دیئے۔ میں چارپائی پر اٹھ کر
گیا اور اپنی کلائیوں کو سہلانے لگا۔ لڑکی نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور دبے
دروازے کے پاس گئی۔ ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ میں نے سب سے پہلا
یہ کیا کہ اپنی جیب ٹٹولی جیب میں چیونگ گم ٹیبلٹ والی ڈبی محفوظ پڑی تھی۔ اسرائیلی
رے کے بریف کیس سے اڑائے ہوئے راکٹوں میزائلوں اور نیوکلر پاور پلانٹ کے بلیو
کی نقل میں نے تہہ کر کے تعویذ میں رکھی تھی وہ تعویذ بھی میرے بازو کے ساتھ
طرح بندھا ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ان سپیروں نے میرے بٹوے میں سے
بھی نہیں نکالی تھی۔ میں چارپائی سے اتر کر کوٹھڑی میں ٹہل کر ہاتھ پاؤں کھولنے لگا۔
ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔

دروازے میں سے لڑکی اندر آئی۔ آتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ تو
تعالیٰ نے کوئی فرشتہ میری مدد کو بھیج دیا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا دروازے سے
گیا۔ وہ غار میں آگے آگے جا رہی تھی۔ یہ غار کی مخالف سمت تھی۔ ایک جگہ غار میں
سیڑھیاں آگئیں۔ ہم سیڑھیاں اتر گئے۔ نیچے فضا بے حد مرطوب تھی اور عجیب سی
بلی ہوئی تھی۔ یہاں اندھیرا بھی تھا۔ لڑکی رک گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دو اور میرے ساتھ ساتھ چلو۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ یہ بڑی گہری سرنگ سی تھی۔ قدموں کے نیچے چھوٹے چھوٹے
رہے تھے۔ کچھ دور اندھیرے میں چلنے کے بعد چڑھائی شروع ہو گئی۔ لڑکی رک گئی۔
نے سرگوشی میں کہا۔

”آگے سیڑھیاں ہیں۔ دیکھ کر چڑھنا“

میں اس کے ساتھ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں سیڑھیاں گن بھی رہا تھا۔ کوئی پندرہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے ایسی روشنی نظر آئی جیسے رات کو تاروں بھری رات میں نیلی نیلی روشنی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی تازہ ہوا کے جھونکے بھی آنے لگے۔ یہ رات کی نیلی نیلی روشنی اور تازہ ہوا جس سرنگ میں سے ہم گزر رہے تھے اس کے دہانے سے آرہی تھی۔ غار کا دہانہ آیا تو ہم نکل کر جھاڑیوں کے درمیان آگئے۔

میں کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ تازہ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ میں نے لڑکی کے کاندھے پر سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے جب ہم قریب سے گزرتے تو جھینگروں کی آوازیں خاموش ہو جاتیں۔ میں اب جنگل کی آزاد فضا میں نکل آیا تھا۔ اب ایک سپیرا تو کیا اگر سارے سپیرے بھی مل کر آجاتے تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"بہن جی تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم مجھے قید سے چھڑا کر لے آئی ہو۔ بس اب میں آگے خود ہی چلا جاؤں گا۔"

لڑکی چلتے چلتے رک گئی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں مجھے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور چہرے کے نقوش دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ اس نے کہا۔

"جو سانپ ناگ منی کی پوجا کے وقت تمہارے اور دوسری مسلمان لڑکی کے اوپر پھینکے گئے تھے ان کے منہ میں سے زہر کی تھیلیاں نکالی ہوئی تھیں۔ لیکن جن سانپوں کو ہمارے سپیروں نے تمہارے اور مسلمان لڑکی کے کپڑوں اور تمہارے جسموں کی بو سنگھا دی ہوئی ہے وہ بہت زہریلے سانپ ہیں۔ ان کے زہر ان کے منہ میں موجود ہے تم جہاں جاؤ گے یہ سانپ تمہارا پیچھا کریں گے اور تمہیں ڈس کر ہلاک کر ڈالیں گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ابھی تو میرے پیچھے سانپ نہیں چھوڑے گئے۔ ابھی تو میں اس جنگل سے فرار ہو سکتا ہوں آگے کسی نہ کسی بستی یا شہر میں پہنچ جاؤں گا پھر سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ

ں گے"

لڑکی آگے چل پڑی۔ کہنے لگی۔

"اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔ میں اسی لئے تمہیں نکال کر لے آئی ہوں۔ ڑی دیر میں پجاری سپیرے تمہیں کوٹھڑی سے لینے آئیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ری کوٹھڑی میں پہنچ بھی چکے ہوں۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ تم فرار ہونے میں یاب ہو گئے ہو تو وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ زہریلے سانپوں کی چھ جوڑیاں تمہاری ش میں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"کیا تم مجھے جہاں لے جا رہی ہو وہاں یہ سانپ میرے پیچھے نہیں آئیں گے؟"

لڑکی بولی۔

"تم خاموشی سے میرے پیچھے چلتے رہو ان باتوں کا مجھے تم سے زیادہ پتہ ہے۔ میں ں کا بھی انتظام سوچ رکھا ہے ساری عمر ہو گئی ہے ان خونی سپیروں میں رہتے ۔ میں سب گر جانتی ہوں۔"

میری یہ ہمدرد لڑکی جھاڑیوں اور اونچی گھاس والے میدان میں سے گزر کر اب ایک لی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ گھاس رات کی شبنم سے بھیگ رہی تھی جس کی وجہ سے پتلون کے پائینچے گیلے ہو گئے تھے۔ ٹیلے کے اوپر چٹانوں کے درمیان ایک قدرتی غار تھا۔ اس غار کے آگے نرکلوں کے اونچے اونچے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے انہ تھا جس کے آگے پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی۔ اس سل نے غار کا منہ بند کر دیا لڑکی نے سل ایک طرف ہٹا دی۔ تاروں کی روشنی میں مجھے غار میں ایک چھوٹا سا بنا معلوم ہوا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"یہ تو کوئی کھڈ یا کھوہ معلوم ہوتا ہے۔"

اس نے کہا۔

"میں پہلے اندر جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا"

وہ جھک کر بلکہ گھٹنوں کے بل ہو کر غار کے تنگ دہانے میں سے اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر گھس گیا۔ اندر ایک طرف سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ روشنی میں دیکھا کہ غار کے اندر کا حصہ تھوڑا کشادہ ہے اور چھت بھی اونچی ہے۔ لڑکی مجھے کچھ آگے لے گئی۔ دیوار میں ایک شگاف تھا۔ روشنی اس شگاف میں سے باہر نکل رہی تھی۔ شگاف کے اندر کافی کھلی جگہ تھی۔ یہاں مٹی کا ایک دیا دیوار کے کھتے میں روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے ایک لڑکی دونوں گھٹنے سینے سے لگا کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی دکھائی دی۔

میں وہیں ٹھٹھک گیا کہ یہ لڑکی کہاں سے آگئی ہے۔ جو لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے آئی تھی اس نے کہا۔

"یہ لڑکی بھی مسلمان ہے۔ ہمارے آدمیوں نے اس کو بھی قید کر رکھا تھا۔ میں سے پہلے اسے نکال کر یہاں لائی تھی۔"

میں نے کونے میں بیٹھی لڑکی کو دیئے کی روشنی میں دیکھا تو میں نے اس کو بھی پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو میرے بعد ناگ منی کے بت کے سامنے لایا گیا تھا۔ وہ میری طرح ایک چارپائی پر بندھی ہوئی تھی۔ اس پر بھی میرے ساتھ ہی سانپ چھوڑ گئے تھے اور وہ دہشت زدہ ہو کر بار بار اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو اور خدا کو مدد کے پکار رہی تھی۔

مسلمان لڑکی میری طرف ڈری ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میری ہمدرد کہنے لگی۔

"تمہیں اپنے ساتھ اس لڑکی کو بھی نکال کر اپنے ساتھ لے جانا اور اسے اس ماں باپ کے گھر پہنچانا ہو گا۔ ہمارے سپیرے معلوم نہیں اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں یہ کسی شہر کا نام بتاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے زیادہ شہر نہیں دیکھے۔ اس سے پوچھو کہ یہ کس شہر جانا چاہتی ہے۔"

میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"بہن! تمہارے ماں باپ کہاں رہتے ہیں؟"

لڑکی مڈل کلاس کے پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی پڑھی لکھی تھی۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس کا نام نسیم بانو ہے۔ وہ بنارس شہر کی رہنے والی تھی۔ اس کے باپ کا گھر شہر کے جنوب مشرقی علاقے کی ایک بستی میں دریائے گنگا کے کنارے تھا۔ اس کے باپ کی شہر میں سٹیشنری اور سکول کی کتابوں کی دکان تھی۔ کہنے لگی۔

"ہمارا سکول دریا کی گھاٹ کے قریب ہے۔ ایک ہفتہ ہوا میں سکول سے واپس آرہی تھی کہ راستے میں ایک سپیرا سانپوں کا تماشہ دکھا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ تو امتحان میں اول آئے گی۔ تیرا ماتھا بتا رہا ہے۔ مجھے اپنے گھر لے جا کر بھوجن کرا۔ تجھے سانپ کا مہرہ دوں گا جس گھر میں مہرہ ہو وہاں سانپ بچھو کبھی نہیں آتا اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو یہ مہرہ سانپ کاٹے کے زخم پر رکھ دینا۔ وہ آدمی بچ جائے گا۔ ہمارے گھر دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے سانپ بچھو برسات میں نکل آتے تھے میں نے کہا چلو بابا میرے گھر چلو۔ میں تمہیں بھوجن کراتی ہوں۔ میں اسے لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک گلی میں سے گزری تو سپیرے نے خدا جانے کس طرح رومال میرے منہ کے اوپر رکھا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔"

میری ہمدرد لڑکی نے نسیم بانو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اب تم فکر نہ کرو۔ یہ تمہارا مسلمان بھائی بند ہے اسے بھی تمہاری طرح کچھ پلا کر بے ہوش کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا دے گا۔"

پھر اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تم اس لڑکی کے پاس یہاں بیٹھو۔ میں یہ معلوم کر کے آتی ہوں کہ ہمارے آدمی تمہاری تلاش میں کیا کچھ کر رہے ہیں اور انہوں نے کس کس علاقے میں جاسوس سانپ چھوڑے ہیں کیونکہ اب تک تم دونوں کے فرار کا ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہو گا۔ یہاں سے بالکل مت۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

جب وہ جانے لگی۔ تو میں نے سوال کیا۔

"اگر تمہارے سپیروں نے ہمیں ہلاک کر دینے کے لئے جاسوس سانپ چھوڑ رکھے ہیں تو وہ میرے اور اس لڑکی نسیم بانو کے کپڑوں اور جسم کی بو پر یہاں بھی آجائیں گے۔"

وہ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"میرے ساتھ غار کے منہ تک آؤ"

میں اس کے ساتھ شگاف میں سے نکل کر غار کے دہانے پہ آگیا۔ اس نے پتھر کی سل پرے گرا دی۔ غار کے دہانے میں سے جو کسی بڑے سوراخ کی طرح تھا ایسی روشنی اندر آنے لگی جیسے باہر آسمان پر پو پھٹ رہی ہو۔ وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے گئی۔ باہر آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی شبنمی ہواؤں میں کافی خنکی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں کھڑے رہو"

میں غار کے دہانے کے آگے اگے ہوئے اونچے اونچے نرکلوں کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ لڑکی جھک کر جھاڑیوں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ وہ اندھیرے میں خدا جانے کیا ڈھونڈنے لگ گئی تھی۔ جب دو ایک منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ پودے تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ بڑی خاص قسم کی جڑی بوٹی ہے۔ جانتے ہو اس کی تاثیر کیا ہے؟ اگر اسے کچل کر ان کے کچلے ہوئے ڈنٹھوں کو کسی جگہ رگڑ رگڑ کر مل دیا جائے تو ادھر سانپ کبھی نہیں آئے گا۔ اس کی بو سے سانپ اس طرح ڈرتا ہے جس طرح انسان سانپ سے ڈرتا ہے۔"

اس نے میرے سامنے ڈنٹھوں کو پتھر پر رکھ کر دوسرے پتھر سے کچل دیا۔ پھر اس کچلے ہوئے ڈنٹھل اور شاخیں پتھر کی اس سل پر رگڑ رگڑ کر ملنے لگی جو غار کے دہانے پر رکھا جانے والا تھا۔ جب اس نے ساری کچلی ہوئی جڑی بوٹی پتھر کی سل پر اچھی طرح مل دی تو کہنے لگی۔

"اب تم اندر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ ہمارے سپیروں نے جو سانپ تمہاری

لئے چھوڑے ہوئے ہیں وہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن انہیں ہماری بو تو ضرور آجائے گی اس طرح وہ غار میں نہیں آئیں گے لیکن وہ باہر بیٹھ جائیں گے اور سپیرے سمجھ جائیں گے کہ ہم غار کے اندر ہیں"

لڑکی کہنے لگی۔

"سانپ کوئی پولیس کے سپاہی نہیں ہیں۔ اس جڑی بوٹی کی تیز بو اس وقت پہاڑی کے چاروں طرف دو دو فرلانگ تک پھیل چکی ہے۔ سانپ اس کی بو پا کر اس پہاڑی سے بھاگ جائیں گے۔ تم بے فکر ہو کر بیٹھو میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

میں غار کے اندر آگیا۔ لڑکی نے باہر سے پتھر کی سل رکھ کر غار کا منہ بند کر دیا۔ میں غار کے اندر شگاف میں بنارس کی مظلوم مسلمان لڑکی نسیم بانو کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ رو رہی تھی اور سخت ڈری ہوئی تھی۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کبھی اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے پاس جا سکے گی۔ میں نے اسے بہت تسلی دی اور کہا۔

"تم اپنا ڈر خوف دور کر دو بہن۔ ہم بہت جلد یہاں سے نکل جائیں گے اور میں خود تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ مجھے دلی جانا ہے۔ میں بنارس سے ہوتا ہوا چلا جاؤں گا"

میری باتوں سے اس کی کافی ہمت بندھی۔ کہنے لگی۔

"بھیا! ان لوگوں کو ضرور پولیس کے حوالے کر دینا۔ اگر یہ رحم دل لڑکی مجھے میری کوٹھڑی سے میری رسیاں کھول کر یہاں نہ لاتی، تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا"

وہ رونے لگی۔

"میرے گم ہو جانے سے نہ جانے اماں ابو کا کیا حال ہو رہا ہو گا"

میں اسے تسلیاں دینے لگا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جس نے ہمیں اتنی بڑی مصیبت سے نکال دیا ہے وہ ہمیں یہاں سے بھی نکال دے۔

"مجھے بھی اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ میں تمہیں خود تمہاری اماں اور ابو کے پاس پہنچاؤں

گا"

میں اس کا خیال بدلنے کے لئے اس سے اس کے سکول اور سکول کی سہیلیوں کی
باتیں کرنے لگا۔ کچھ وقت اسی طرح گزر گیا۔ سپیرن لڑکی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ باہر
ضرور دن چڑھ آیا ہو گا۔ اب خونی سپیرے اور ان کے سانپ ہماری تلاش میں سارے
جنگل میں نکل آئے ہوں گے۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ سانپوں کا انسانی کپڑوں اور جسم
کی بو پر آجانا بیکار کی باتیں ہیں۔ میں اس لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ سپیرے
کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو ہے نہیں کہ گھات لگا کر ہم پر فائر کر دیں گے۔ کوئی سامنے آیا
تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے ایسے کمانڈو کے ہاتھ سے زندہ بچے۔ پھر یہ سوچ
کر بیٹھا رہا کہ خدا جانے اس میں کوئی سچائی ہی ہو۔ سانپ ہماری بو پا کر جنگل میں ہمیں
ڈس نہ دیں۔ یہ غریب لڑکی کہیں ویسے ہی ڈر کر شور نہ مچا دے۔ بہتر یہی ہے کہ سپیرن
لڑکی کا انتظار کر لیا جائے۔ وہاں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی
آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا کہ سپیرن لڑکی غار میں واپس آئی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ سپیرے سخت غصے میں ہیں اور سارے جنگل میں ہمیں تلاش
کرتے پھر رہے ہیں۔

"انہوں نے تمام زہریلے سانپ جن کو انہوں نے پہلے روز ہی تمہارے جسم اور
کپڑے سنگھا دیئے تھے تمہارے پیچھے چھوڑ دیئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ اس پہاڑی کی
طرف کوئی سانپ نہیں آرہا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے سانپوں کے ایک جوڑے کو اپنی
آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا منہ اس پہاڑی کی طرف تھا۔ انہیں تم دونوں کی بو آرہی
تھی لیکن جیسے ہی جڑی بوٹی کی تیز بو ہوا کے جھونکے کے ساتھ ان کے جسم سے ٹکرائی
اس طرح گھبرا کر ایک دم پیچھے کو بھاگے جیسے آگے آگ لگی ہو۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہمیں کتنی دیر اور یہاں رہنا ہو گا"

سپیرن لڑکی اپنے ساتھ ابلی ہوئی شکر قندی اور ایک کٹورے میں گڑ کا شربت

لی۔ اس نے شکر قندی کیلے کے پتوں پر ڈال کر ہمارے آگے رکھ دی۔ کہنے لگی۔

"دن کے اجالے میں تمہارا یہاں سے نکلنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہیں آج کا
اس جگہ بیٹھ کر گزارنا ہو گا۔ رات کو میں تمہیں خود ساتھ لے کر اس جنگل سے باہر
آؤں گی۔"

شکر قندی بڑی میٹھی تھی۔ مجھے بھوک بھی خوب لگی ہوئی تھی۔ میں نے اور نسیم بانو
نے شکر قندی کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی گڑ کا شربت پیا۔ جسم میں تازگی آگئی۔
ن لڑکی یہ کہہ کر چلی کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوپہر کو دوبارہ آؤں گی۔ اس
جانے کے بعد نسیم بانو سے باتیں کرنے لگا۔ غار کے اندر سردی نہیں تھی۔ مگر سردیوں
وسم تھا اس وجہ سے گرمی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس مظلوم لڑکی کا خوف اب
دور ہو چکا تھا۔ ایک دو بار وہ میری کسی بات پر ہنسی بھی تھی۔ دوپہر کے وقت سپیرن
ہمارے لئے کھچڑی لے کر آئی جس میں آم کا اچار ملا ہوا تھا۔ وہ پانی بھی لائی تھی۔
ہم نے شوق سے کھایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"باہر دن کتنا گزر گیا ہے؟"

اس نے بتایا کہ دوپہر ہو چکی ہے اور ہمارے آدمی تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک
ہیں۔ سارے سانپ بھی ناکام واپس آگئے ہیں۔ میں نے کہا۔

"تو پھر اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے"

وہ کہنے لگی۔

"جب تک باہر اندھیرا نہ ہو جائے یہاں سے نکلنے کا نام بھی نہ لینا۔ نہیں تو تمہارے
میں بھی ماری جاؤں گی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم کو ہماری مدد کا خیال کیسے آگیا؟"

سپیرن لڑکی خاموش ہو گئی۔ پھر بولی۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ ایسا لگتا ہے کہ بھگوان نے میرے دل میں خیال ڈالا کہ میں

تمہاری مدد کروں۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ عورت تمہاری ماتا جی تھی کیا؟"

سپیرن لڑکی کہنے لگی۔

"نہیں۔ وہ میری اصلی ماں نہیں ہے۔ اس نے مجھے یہاں پالا ہے۔ مجھے خود نہیں
معلوم کہ میری ماں کون تھی۔ ایک بوڑھے سپیرے نے بتایا تھا کہ تم ایک جنگل میں
جھاڑیوں کے پاس پڑی رو رہی تھیں۔ تمہاری عمر اس وقت چھ سات ماہ کی ہوگی کہ
تمہیں وہاں سے اٹھا کر لے آئے۔ بھگوان جانے میری ماتا کون تھی اور وہ مجھے
جھاڑیوں کے پاس کیوں چھوڑ گئی تھی۔ شاید ڈاکوؤں نے میری ماتا کو اغوا کیا ہو گا اور میں
اس کی گود میں ہوں گی۔ ڈاکو مجھے وہیں پھینک کر میری ماتا کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے
میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں ان سپیروں میں تھی۔ تب سے لے کر آج تک ان
رہ رہی ہوں۔ اچھا۔ اب میں چلتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"تم ہمیں لے کر یہاں سے کس طرف جاؤ گی؟ اور جس طرف تم ہمیں لے جاؤ
کیا وہاں سے کوئی شہر یا ریلوے سٹیشن قریب ہو گا؟"

اس نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تمہیں خود معلوم کرنا ہو گا۔ میں تمہیں
خطرناک جنگل سے باہر نکال کر واپس آجاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ میرا زیادہ دیر
رہنا ٹھیک نہیں۔"

اور وہ چلی گئی۔ اس کے بعد ہمارے لئے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ بس باتیں
رہے۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ بنارس کی لڑکی نسیم بانو نے مجھ سے میرے بارے
پوچھا کہ میں کون ہوں اور ان کے جال میں کیسے پھنس گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے
میں بس اتنا ہی بتایا کہ بمبئی سے دلی جا رہا تھا۔ سیلاب کی وجہ سے باندہ شہر میں رک

جبل پور سے ہوتا ہوا کانپور کے راستے دلی چلا جاؤں گا۔ ٹرین میں بیٹھا۔ آگے جا کر
ریلوے لائن بہہ جانے کی وجہ سے ٹرین کھڑی ہو گئی۔ میں یونہی سیر کرنے سٹیشن سے نکل
آیا اور اس سپیرن لڑکی کی ماں مجھے دھوکے سے بے ہوش کر کے یہاں لے آئی۔

یونہی باتیں کرتے وقت گزرتا چلا گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر دیئے کی بتی
اونچی کر دیتا تھا۔ آخر سپیرن لڑکی آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پوٹلی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارے لئے اس میں کھچڑی ڈال کر لائی ہوں۔ راستے میں جب بھوک لگے تو
کھا لینا۔"

میں نے اس سے کہا کہ اگر رات ہو گئی ہے تو ہمیں یہاں سے چل پڑنا چاہئے۔

سپیرن لڑکی نے کہا۔

"ابھی سورج غروب ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔ تھوڑا وقت اور بیٹھ جاؤ۔ جنگل
کو پوری طرح سے اندھیرا ہو لینے دو۔"

اس نے بتایا کہ سپیرے کل کسی نئی مسلمان لڑکی اور نئے مسلمان لڑکے کو پکڑنے
کے لئے نکلیں گے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ صرف مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو کیوں پکڑتے ہیں؟"

وہ کہنے لگی۔

"ان کے ہاں یہ ایک پرانی رسم چلی آرہی ہے یہ ہر سال کی پہلی اماوس کی رات کو
ناگ منی دیوتا کے آگے ایک مسلمان لڑکی اور ایک مسلمان لڑکے کی قربانی دیتے ہیں۔
اس سے پہلے یہ کئی مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کو ناگ منی دیوتا کے آگے ہلاک کر چکے
ہیں۔ تم خوش قسمت ہو اور پہلے مسلمان ہو کہ یہاں سے بچ کر جا رہے ہو۔"

میں نے دل میں سوچا کہ ان لوگوں کو یہاں زندہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے میں نے
سپیرن لڑکی سے کہا۔

"رات کو یہ سارے خونی سپیرے کہاں سوتے ہیں؟"

اس نے کہا۔

"جس غار میں تم قید تھے اور جہاں ناگ منی دیوتا کا بڑا بت ہے سارے سپیرے اسی غار میں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سوتے ہیں۔"

میں نے اسی وقت ان لوگوں کو ناگ منی دیوتا سمیت بم سے اڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ ٹائم بم میرے پاس موجود تھے مگر میں خود وہاں جا کر انہیں لگا نہیں سکتا تھا۔ اس غار کو تباہ کرنے کے لئے میرے چیونگ گم والے دو ٹائم بم ہی کافی تھے میرا ذہن تیزی سے ان بموں کو سانپ کے بت والے غار میں لگانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ سپیرن لڑکی رات ہونے کا انتظار کرتے ہوئے ہمارے پاس ہی بیٹھی دوسری لڑکی سے باتیں کر رہی تھی اور اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹائم بم کیسے لگایا جائے۔ میں خود ان بموں کو لگانے غار کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے سپیروں کی موجودگی سے کوئی خطرہ نہیں تھا ان سب سے میں اکیلا کمانڈو ہی نمٹ سکتا تھا۔ مجھے خطرہ ان کے زہریلے سانپوں سے تھا اگر وہ مجھ پر سانپ چھوڑ دیتے ہیں تو میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔ سپیرن لڑکی کے ہاتھ اگر میں بم کی ٹکیاں دے کر کہوں کہ یہ واپس جا کر ناگ منی کے غار میں چپکا دینا تو وہ ضرور پوچھے گی کہ یہ کیا ہے اور تم اسے وہاں کیوں چپکانا چاہتے ہو۔ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد جب میرے ذہن میں خونی سپیروں کے غار کو دھماکے سے اڑانے دینے کی کوئی ترکیب نہ آئی تو میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

سپیرن لڑکی کو وقت کا برابر احساس تھا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ باہر اندھیرا ہو گیا ہو گا۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ جانے سے پہلے اس نے ہم دونوں کو ہدایت کی کہ اس کے پیچھے پیچھے کم از کم پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ غار سے نکلنے کے بعد میں اور نسیم بانو سپیرن لڑکی کے درمیان پانچ قدموں کا فاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ مجھے رات کے اندھیرے میں بھی تھوڑا تھوڑا نظر آتا رہتا تھا۔ سپیرن لڑکی ہمارے آگے آگے جنوب کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ایک کھائی میں اتر گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اتر گئے۔ اس کھائی کی دیواریں تین اطراف سے کافی اونچی تھیں۔ صرف ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ سپیرن لڑکی ہمیں لے کر کھائی سے باہر

نکلی۔ اسی طرح کھیتوں، گھاس کے میدانوں، کھڈوں، کھائیوں اور درختوں کے گھنے جھنڈوں میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ آسمان بڑا کھلا کھلا نظر آ رہا تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ یہاں آکر گھنے درختوں کے جھنڈ ختم ہو جاتے تھے۔ سپیرن لڑکی رک گئی۔ جب میں اور نسیم بانو چلتے چلتے اس کے قریب آئے تو وہ کہنے لگی۔

"یہاں سپیروں کے جنگل کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ آگے تم خود ہی جاؤ گے۔ اور خود اپنا راستہ تلاش کرو گے"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آگے کوئی شہر ہے؟"

وہ کہنے لگی۔

"میں بہت دیر ہوئی ایک بار ماتا کے ساتھ اس طرف گئی تھی۔ مجھے یاد ہے یہاں سے آگے ہم نے بیل گاڑی میں سفر کیا تھا۔ پھر میں نے ریل گاڑی دیکھی تھی۔ اس کے آگے ایک گاؤں آیا تھا۔ میری ماتا اس گاؤں میں اپنی کسی رشتے دار سے ملنے گئی تھی۔ یہاں سے ہم واپس آگئے تھے۔ وہی گاؤں کہیں آگے آتا ہے۔"

میں نے سپیرن لڑکی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہمارے ساتھ جس ہمدردی کا سلوک کیا ہے اس کے لئے میں اور میری منہ بولی بہن نسیم بانو ہم دونوں تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں"

سپیرن لڑکی نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تم وقت خراب نہ کرو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ پیچھے کسی کو شک پڑ گیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جاؤ۔"

اتنا کہہ کر سپیرن واپس مڑی اور تیز تیز قدموں سے چلتی جہاں درختوں کے جھنڈ شروع ہوتے تھے ان جھنڈوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اب میرا اور بنارس کی لڑکی نسیم بانو کا سفر شروع ہو گیا۔ اس بے چاری نے کہاں اس قسم کے سفر کئے تھے۔ رات کے وقت اندھیرا۔ ستاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اور راستے میں کبھی کوئی کھائی آجاتی۔

کبھی کسی برساتی نالے سے گزرنا پڑتا۔ کبھی اونچی اونچی جھاڑیاں شروع ہو جاتیں۔ لڑ
تھوڑی دور چلتی تو ڈر کر بیٹھ جاتی کہ اندھیرے میں اسے کوئی سانپ نہ کاٹ لے۔ م
اسے حوصلہ دیتا۔ اس کی ہمت بندھاتا اور یہ خوف بھی دلاتا کہ ہو سکتا ہے خونی سپیر
ہمارے تعاقب میں لگے ہوں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دوبارہ چلنا شروع کر دیتی۔

ابھی تک مجھے وہاں کوئی پگ ڈنڈی وغیرہ نہیں ملی تھی جس سے یہ پتہ چلتا کہ آ
کوئی گاؤں وغیرہ ہو گا۔ جس طرف سپیرن لڑکی نے ہمیں چلنے کو کہا تھا ہم اسی رخ پر آہستہ
آہستہ چلے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس ختم ہو
تو مجھے کھیتوں میں کھڑی فصل نظر آئی۔ میری نگاہیں اندھیرے میں بھی کھیتوں کو پہچان لی
تھیں۔ اس کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ ہم ذرا قریب ہو گئے تو واقعی وہ جوار یا باجرے ک
فصل تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"آگے کوئی نہ کوئی گاؤں ضرور ہو گا۔ وہاں سے کوئی پکی سڑک شہر کو بھی جاتی ہو گی"

وہ سانس لے کر بولی۔

"بھائی! ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟"

لیکن ہم راستہ نہیں بھولے تھے۔ آگے ایک گاؤں آ گیا جس کے مکانوں پر رات
اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بس مکانوں کے خاکے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سارا میدانی علا
تھا۔ پہاڑیاں ٹیلے پیچھے رہ گئے تھے۔ پگ ڈنڈی چوڑے کچے راستے میں تبدیل ہو گئی تھ
ہم گاؤں کے پہلو سے گزرے تو دور بجلی کے کھمبوں کی روشنی نظر آئی۔ میں نے لڑکی
کہا۔

"وہ دیکھو۔ یہ پکی سڑک کی روشنیاں ہیں یہ سڑک ضرور کسی شہر کو جاتی ہے"

"کون سا شہر آئے گا؟ بنارس تو بہت دور ہو گا۔"

ہم کسی نہ کسی طرح چلتے چلتے پکی سڑک پر آ گئے۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ ہم
کے کنارے ایک جگہ بیٹھ کر تھکان اتارنے لگے۔ لڑکی بہت زیادہ تھک گئی تھی۔
دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اس دوران وہاں سے کوئی گاڑی یا ٹرک وغیرہ نہ گزرا۔

ہی نا امید ہو گیا تو سوچا کہ مشرق کی طرف چل پڑتے ہیں۔ آگے کوئی نہ کوئی قصبہ یا
ضرور آ جائے گا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی موٹر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ میں وہیں
گیا۔ پیچھے دیکھا۔ کسی گاڑی کی روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ گاڑی ابھی دور تھی کہ
سڑک کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا اور گاڑی کو روکنے کے لئے دونوں بازو ہلانے لگا۔

گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ اب لڑکی نسیم بانو بھی میرے پاس آ گئی تھی۔ یہ گاڑی
فوجی ٹرک تھا۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ مجھ سے کہیں غلطی تو نہیں ہو گئی۔ فوجی
میرے لئے خطرہ بن سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے پروا نہ کی۔ ٹرک میں سے
سکھ فوجی باہر نکل کر آیا اور پنجابی نما اردو میں بولا۔

"کون ہو تم۔ ادھر کیا کر رہے ہو"

میں نے اس سے کہا کہ یہ میری بہن ہے۔ ہمارے گاؤں میں سیلاب آ گیا تھا۔ جان
رہاگے۔ ماتا پتا سے بچھڑ گئے اور ادھر نکل آئے ہیں۔ ہمیں آگے کسی گاؤں میں پہنچا
۔ سکھ فوجی بولا۔

"آگے گاؤں نہیں ہے۔ ریوا ہے۔ چلو بیٹھو ٹرک میں۔"

ہم جلدی سے دوڑ کر ٹرک کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ٹرک بالکل خالی تھا۔ میں نے لڑکی
پوچھا۔

"یہ ریوا کوئی قصبہ ہو گا ہو سکتا ہے وہاں کوئی ریلوے سٹیشن بھی ہو"

لڑکی کہنے لگی۔

"ریوا تو شہر ہے۔ میری امی جی نے ایک بار اس شہر کا ذکر کیا تھا"

یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد فوجی ٹرک نے ہمیں ریوا پہنچا
یہ واقعی ایک شہر تھا۔ اگرچہ چھوٹا شہر تھا۔ رات کا وقت بازار سنسان پڑے تھے۔ میں
کھ فوجی سے کہا۔

"سردار جی ہمیں سٹیشن پر اتار دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی"

سکھ فوجی نے ہمیں سٹیشن پر پہنچا دیا۔

سٹیشن کے گیٹ کے اوپر انگریزی اور اردو میں موٹے لفظوں میں "ریوا" لکھا ہوا تھا۔
رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سٹیشن پر چند ایک مسافر ہی ڈیوڑھی میں پڑے تھے۔ ہم بھی
وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”تم یہاں بیٹھو۔ میں کسی سے پوچھتا ہوں کہ یہاں سے بنارس کس طرف ہے اور
کوئی گاڑی یہاں سے بنارس جاتی ہے یا نہیں“

مجھے ایک قلی مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بنارس کو جانے والی گاڑی کس
وقت جائے گی۔ وہ کہنے لگا۔

”یہاں سے کوئی گاڑی سیدھی بنارس نہیں جاتی۔ ایک گھنٹے بعد ایک گاڑی آئے گی
وہ تمہیں مرزا پور پہنچا دے گی۔ مرزا پور سے بنارس کے لئے دوسری گاڑی پکڑ لینا۔“

میں نے واپس آکر مرزا پور کے دو ٹکٹ لے لئے۔ ایک گھنٹے بعد واقعی ایک ٹرین
آگئی۔ میں اور نسیم بانو ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اس گاڑی نے دوسرے دن صبح صبح ہمیں
مرزا پور پہنچا دیا۔ مرزا پور پہنچ کر پتہ چلا کہ بنارس وہاں سے تھوڑی دور ہی ہے۔ اس
میں اس طرف کا جو علاقہ تھا ادھر میں زیادہ نہیں آیا تھا۔ یہ بہت حد تک میرے لئے نیا
علاقہ تھا۔ بہر حال مرزا پور ہمیں ایک گاڑی کچھ دیر بعد مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم بنارس
پہنچ گئے۔

بنارس ایک پرانا اور گندا شہر تھا۔ سٹیشن بھی مجھے پرانا لگا۔ انڈیا کے ہر صوبے
گندے مندے ننگے اور نیم ننگے سادھو لوگ جگہ جگہ چل پھر رہے تھے۔ بنارس دریا
گنگا کے کنارے آباد ہے۔ ویسے بھی بڑا پرانا شہر ہے۔ شہر کا گنجان حصہ بے حد گندا
اونچی نیچی گلیاں تھیں۔ کئی گلیوں میں پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ میں
بانو کو دریا کنارے والی بستی میں اس کے گھر لے گیا۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹے
بہن بھائیوں نے نسیم بانو کو دیکھا تو سب رونے لگ پڑے۔ میں نے انہیں کہا۔

”آپ لوگ کس لئے رو رہے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ میں آپ کی بچی
سالم بھیڑیوں کے چنگل سے نکال کر لے آیا ہوں“

م بانو بھی ہر ایک کے گلے لگ کر زارو قطار رو رہی تھی۔ ہم لوگ روتے بہت
ہ تو ہم لوگوں کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ رونے دھونے سے بہت واسطہ پڑتا
کچھ ویسے بھی ہمیں رونے کا بہت شوق ہے۔ خوشی اور غم دونوں موقعوں پر ہم
وتے ہیں۔ میں نے نسیم بانو کے والد کو جو ابھی گھر پر ہی تھا اور دکان پر نہیں گیا تھا
انی سنائی۔ وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر بار بار آسمان کی طرف دیکھتے اور خدا کا شکر ادا
۔ میں نے کہا۔

اب مجھے اجازت دیجئے۔ میں نے آپ کی امانت آپ کے پاس پہنچا دی ہے۔“

لوگ مجھے جانے نہیں دے رہے تھے مگر میرا وہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں وہاں سے
اہوا۔ سیدھا سٹیشن پر آگیا۔ وہیں ناشتہ کیا اور دو گھنٹے بعد ایک ٹرین میں سوار ہو کر
طرف روانہ ہو گیا جو میرا اصل ٹارگٹ تھا۔ دلی بنارس سے بہت دور تھا۔ راستے
پور کا سٹیشن آیا۔ پھر سلطان پور آیا۔ اس کے بعد لکھنؤ کا مشہور اور اسلامی
، کا حامل شہر آگیا۔ یہاں گاڑی کو دیر تک رکنا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ میری
ی چھٹی حس ایک بار پھر بیدار ہو گئی تھی۔ اگرچہ میں احمد آباد دوار کا والے خطروں
دور نکل آیا تھا پھر بھی میں دشمن ملک میں تھا اور پولیس کہیں بھی شک پڑنے پر
فتار کر سکتی تھی۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے بعد میں ڈبے میں آکر چوکنا ہو کر

لکھنؤ سے گاڑی چلی تو فتح گڑھ کے بڑے شہر کے سٹیشن پر ٹھہری۔ یہ کوئی ایکسپریس
ی۔ یہاں سے شاہ جہان پور بریلی اور مراد آباد سے ہوتی ہوئی دلی پہنچی۔ مجھے ٹرین
کرتے ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی۔ صبح ہونے والی تھی کہ ٹرین دلی کے
ن داخل ہوئی۔ یہ شہر میرا جانا پہچانا تھا اور میرے لئے خطروں سے بھرا ہوا تھا۔
نے سوچا کہ اپنے ماسٹر سپائی مغل ریستوران کے مالک کے پاس چلنا چاہئے۔ ایک
رکھیں کہ میں نے اپنے ماسٹر سپائی کا نہ تو نام اصلی لکھا تھا اور نہ اس کے
ن کا صحیح نام لکھ رہا ہوں۔ یہ بھی اس کے اصلی نام کی جگہ فرضی نام میں نے رکھا

ہوا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی بجائے بہتر ہے کہ مجھے اپنے دوسرے ماسٹر سپائی اور ہائی ایکسپلوسیوز کے ماہر گل خان کے پاس چلنا چاہئیے۔ اس کے گھر کا مجھے پتہ تھا۔ (گل خان کا نام بھی میں نے فرضی رکھا ہوا ہے۔ اس کا اصلی نام اور تھا۔ یہ ہندوستان کا شہری مسلمان پاکستان کا فدائی تھا اور آج کل دلی میں نہیں ہے بلکہ کینیڈا جا چکا ہے)۔ میں چاروں طرف سے خبردار رہتے ہوئے سٹیشن سے نکل کر باہر آگیا۔ دلی میں کافی ٹھنڈ تھی۔ میں نے جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کر لئے تھے۔ موٹر رکشا پکڑا اور گل خان کے گھر کی طرف چل پڑا۔

میں آپ کو گل خان کے مکان کا حدود اربع نہیں بتاؤں گا۔ بس میں اس آبادی میں آگیا جہاں ایک گلی میں وہ رہتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہ گیا۔ پھر مجھے اپنے مکان میں لے گیا۔ کہنے لگا۔

"تم اتنے دن کہاں رہے؟ سری نگر سے شیروان نے آدمی بھیج کر تمہارا پتہ پوچھا تھا۔ تم نے دوارکا اور مڈگھاٹ میں جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اس کی ہمیں بڑی خوشی ہے۔"

گل خان نے میرے لئے چائے بنوائی۔ میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری روداد بیان کی۔ کہنے لگا۔

"تم نے ایک محب وطن کمانڈو ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔"

پھر بولا۔

"مجھے وہ بلیو پرنٹ دکھاؤ جو تم اسرائیلی ایجنٹ کے کاغذات سے نقل کر کے لائے ہو۔"

میں نے اپنے بازو کے ساتھ بندھا ہوا تعویذ اتارا۔ اس میں سے پلاسٹک کے میں لپٹا ہوا وہ کاغذ نکال کر گل خان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ بھارت میں کسی ایٹمی ری ایکٹر کا نقشہ ہے اور یہ راکٹوں اور میزائلوں خاکے ہیں اس کا مطلب ہے کہ انڈیا کی حکومت کشمیر اور پاکستان کے خلاف استعمال

نے والے راکٹ اور میزائل بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم اس بلیو پرنٹ سے پتہ چلا سکتے ہو کہ یہ ایٹمی راکٹ اور میزائل کس جگہ پر ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک طرف انگریزی میں بمبئی لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے بمبئی جو انڈین حکومت نے ایٹمی ری ایکٹر لگایا ہے یہ راکٹ میزائل اسی جگہ تیار ہوں"

گل خان کہنے لگا۔

"اس بارے میں میں صحیح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمارا ایک آدمی نیوکلر فزکس کا ہے۔ اس نے نیوکلر فزکس کا پورا کورس کیا ہوا ہے۔ وہی ہمیں یہ بلیو پرنٹ دیکھ کر بتا سکے گا۔"

اسے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"ہم اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ میں آج رات کو اسے یہاں بلا لوں گا۔ تمہارے چائے اور بناؤں؟"

شکریہ! تو پھر یہ بلیو پرنٹ تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ تمہارے تیار کئے ہوئے ٹائم بموں نے بڑا کام دکھایا۔ دوارکا فورٹ کا اسلحے کا ذخیرہ انہی ٹائم بموں نے پورے اڑا دیا۔"

گل خان بولا۔

"ہم نے یہاں اخبارات میں سب کچھ پڑھ لیا تھا"

میں نے کہا۔

"مڈگھاٹ سٹیشن پر فوجی اسلحے کی ٹرین بھی انہی ٹائم بموں کی مدد سے ہم نے اڑائی ریم بھائی بھی میرے ساتھ ہی تھا"

گل خان کہنے لگا۔

کریم بھائی سچا دین دار مسلمان اور نڈر مجاہد ہے۔ وہ تمہاری طرح تربیت یافتہ کمانڈو تو نہیں ہے لیکن بڑا بہادر آدمی ہے اور اسلام اور پاکستان کے نام پر تو وہ ہر وقت جان قربان کر دینے پر تیار ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں آتی دفعہ اس سے بھی احمد آباد میں نہیں مل سکا۔ را کے چیف پانڈے کے بنگلے پر ایک دم پولیس کا چھاپہ پڑ گیا اور مجھے بنگلے کی پچھلی کھڑکی سے کود کر فرار ہونا پڑا۔"

گل خان بلیو پرنٹ پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"تمہارا فرار ہو کر سیلاب کی [illegible] سے باندہ پہنچ جانا بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ تم وہاں نہ پہنچتے تو [illegible] کا یہ قیمتی بلیو پرنٹ کبھی ہمارے ہاتھ نہ آتا۔"

میں نے مغل ریستوران والے اپنے ماسٹر سپائی کا پوچھا تو گل خان بولا۔

"تم نے بڑا اچھا کیا کہ سٹیشن سے سیدھا میرے پاس آ گئے۔ مغل ریستوران پر دو روز پہلے ہی چھاپہ پڑا تھا اور پولیس ہمارے ماسٹر سپائی کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ کسی نے مخبری کی ہو گی یا ہمارے ماسٹر سپائی سے کوئی بھول ہو گئی ہو گی۔"

"اسے پولیس نے دلی میں رکھا ہوا ہے یا یہاں سے باہر کسی ٹارچر کیمپ میں منتقل کیا گیا ہے؟"

میرے اس سوال پر گل خان نے کہا۔

"ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا اور ہمیں اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ہمیں پیچھے نہیں آگے کی طرف دیکھنا ہے۔ اتنا ہمیں یقین ہے ہمارا کوئی بھی ماسٹر سپائی پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی اذیت ناک تشدد کے باوجود ہم میں سے کسی کا نام اور ٹھکانہ نہیں بتائے گا۔ وہ مر جائے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔"

گل خان نے راکٹوں والا بلیو پرنٹ سنبھال کر رکھ لیا۔ کہنے لگا۔

"میں اپنے آدمی سے ملنے جاتا ہوں۔ بلیو پرنٹ میں ساتھ نہیں لے جا رہا۔ کوشش کروں گا کہ وہ رات کو یہاں میرے مکان پر آ جائے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے اور کیا اس کے پیچھے انٹیلی جینس پولیس لگی ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک سائنسی انسٹی ٹیوٹ میں ایک اہم عہدے پر کام کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا رابطہ ہم لوگوں سے ہے اور [illegible]م کشمیری مجاہدین اور پاکستان کا فدائی ہے اس لئے اسے بڑا محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔"

گل خان نے مجھے اس کا نام بتایا۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا آپ اسے جمشید کہہ لیں۔ گل خان نیوکلر فزکس کے پروفیسر جمشید سے ملنے چلا گیا۔ میں اس [illegible]ان پر ہی رہا۔ گل خان اس دو کمروں والے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کی نہ بیوی [illegible] بچے۔ وہ بڑا پابند صوم وصلوٰۃ تھا۔ محلے کی رفاعی کمیٹی کا ممبر تھا۔ یہ دلی کے [illegible]ں کا محلہ تھا۔ وہاں کسی کو ذرا بھی معلوم نہیں تھا کہ گل خان ایک ٹرینڈ کمانڈو ہے [illegible] ایکسپلوسیوز بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت وہ ٹائم بم تھے جو [illegible]نے چیونگ گم کی شکل میں بنا کر مجھے دیئے تھے اور جنہوں نے مڈگھاٹ سٹیشن پر انڈین [illegible]ی کشمیر جانے والی ایمونیشن ٹرین کو سٹیشن سمیت اڑا دیا تھا اور دوار کا فورٹ کے [illegible]ن کیمپ کو تباہ کر دیا تھا۔ اگرچہ سری نگر سے روانہ ہوتے وقت کشمیری مجاہد کمانڈو [illegible]نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں از خود گل خان سے ملنے نہ جاؤں مگر میں نے اچھا [illegible] سٹیشن سے سیدھا اس کے گھر چلا آیا۔ اگر میں اپنے ماسٹر سپائی کے نئی دلی والے [illegible]ران میں جاتا تو میرا پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔ گل خان کا مکان میں [illegible]ے پہلے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور سرینگر جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اسی نے [illegible]ران تک پہنچنے کا راستہ بتایا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد گل خان واپس آیا۔ کہنے لگا۔

"پروفیسر جمشید رات کو آئے گا۔ تم اوپر والے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں دوپہر

کو کھانا لے کر اوپر ہی آجاؤں گا۔ کمرے کی کھڑکیاں مت کھولنا۔ میں اسے ہمیشہ بند
ہوں۔ محلے میں کسی نے دیکھ لیا تو مجھ سے پوچھیں گے کہ اوپر کون آیا ہے۔ اگرچہ
مسلمانوں کا محلہ ہے لیکن یہاں دو ایک آدمی پولیس کے مخبر بھی ہیں۔ مسلمانوں کی
کمزوری انہیں لے ڈوبی ہے۔"

گل خان نے مجھے چابی دی۔ میں اوپر والے کمرے میں آگیا۔ مختصر سا کمرہ تھا۔
طرف دو کھڑکیاں کھلتی تھیں جو بند تھیں۔ موسم سردیوں کا تھا اس لئے مجھے بند
میں بھی سکون محسوس ہوا۔ ایک چارپائی بچھی تھی جس پر گرم کمبل اور بستر
چارپائی کے ساتھ ایک میز ایک کرسی لگی تھی۔ کونے میں چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔
کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ دوسری جانب مکان کی چھت تھی۔ چھت پر
عورتیں بیٹھی دھوپ تاپ رہی تھیں۔ ایک لڑکی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں
تھکا ہوا تھا۔ چارپائی پر پڑ کر سو گیا۔

دوپہر کے بعد گل خان نے مجھے آکر جگایا۔ وہ میرے لئے کھانا لایا تھا۔ اس
ملازم رکھا ہوا تھا جو اسے کھانا وغیرہ پکا دیتا تھا۔ میں کھانا کھانے لگا۔ وہ میرے پاس
کہنے لگا۔

"ٹائم بموں کو تم ابھی اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم کچھ اور
لیں گے۔ یہاں دلی میں اس میں استعمال ہونے والی ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے
اس کے بعد وہ چلا گیا۔

میں اپنے کمرے میں کھانا کھانے کے بعد کمبل اوڑھ کر پھر سو گیا۔ شام
جب گل خان نے مجھے آکر جگایا۔ وہ میرے لئے بازار سے ایک نئی گرم قمیض
خرید کر لایا تھا۔ میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا اور نئی پتلون کے ساتھ
پہن لی۔ جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو پروفیسر جمشید بھی آگیا۔

یہ ایک دبلا پتلا سانولے رنگ کا چمکیلے بالوں والا آدمی تھا۔ بالوں میں
سفیدی جھلک رہی تھی۔ کلین شیو تھا۔ اس نے گیبرڈین کا بھورے رنگ کا

ہوا تھا۔ گل خان نے میرا تعارف کرایا۔ وہ بڑی گرمجوشی سے ملا۔ گل خان نے اسے
بارے میں پہلے سے بتا دیا ہوا تھا۔ ہم نچلی منزل کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔
مکان میں یہی دو کمرے تھے۔ ایک بیٹھک اور اس کے اوپر ایک کمرہ اوپر والے
میں آگے تھوڑا سا صحن تھا بتی جل رہی تھی۔ گل خان نے پروفیسر جمشید کو بلیو
والا کاغذ نکال کر دیا۔ پروفیسر نے کوٹ کی جیب میں سے عینک نکال کر لگائی اور میز پر
پرنٹ رکھ کر اس پر جھک گیا۔ اس کے چہرے پر تجسس کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے
گل خان نے پوچھا۔

"پروفیسر! تمہیں اس میں کوئی خاص بات نظر آئی؟"

پروفیسر جمشید نے بلیو پرنٹ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"انڈین گورنمنٹ تو پلوٹونیم بم کا دھماکہ کرنے اور نیو کلر راکٹ نیو کلر وار ہیڈ کے
ائل بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ یہ اسی کا خاکہ ہے۔"

گل خان نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ بھارت میں کس جگہ بن رہا ہے؟"

پروفیسر نے بلیو پرنٹ سے نظریں ہٹاتے ہوئے عینک اتار کر میز پر رکھ دی اور کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بھارتی حکومت نے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہی
لست کو ڈاکٹر بھابھا کی سرپرستی میں انڈین اٹامک انرجی کمشن قائم کر دیا تھا۔ اس نے
یافتہ ممالک سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوششیں بھی شروع کر دی تھیں۔ پھر
۱۹ء میں بھارت کے پہلے ایٹمی ری ایکٹر نے کام شروع کر دیا تھا جو بمبئی میں ٹرامبے کے
اہر ہے۔ اب اسی ایٹمی ری ایکٹر میں پلوٹونیم صاف کرنے کا پلانٹ لگایا گیا ہے۔ اس بلیو
ٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اسرائیل بھارت کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔
بلیو پرنٹ میں ان راکٹوں اور میزائلوں کے بھی خاکے بنائے گئے ہیں جن میں پلوٹونیم
ہیڈ کے ساتھ اس جگہ تیار کیا جائے گا۔"

گل خان نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں بھارت کب تک اپنے ایٹمی پروگرام میں کامیاب ہو جائے گا"
پروفیسر جمشید عینک لگا کر دوبارہ بلیو پرنٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔

"اس بلیو پرنٹ پر جو علامتیں اور خاکے بنائے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے
بھارت دو چار سالوں کے اندر اندر ایٹمی دھماکہ کرے گا اور وہ دنیا کے نقشے پر ایٹمی
بن کر سامنے آجائے گا۔ اس بلیو پرنٹ سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ بھارت پہلے پلو
بم کا دھماکہ کرے گا۔ پلوٹونیم کے ایک چھوٹے بم میں پانچ سے دس کلو گرام پلو
استعمال ہوتا ہے۔ امریکہ نے ہیروشیما پر تو ایٹم بم گرایا تھا مگر ناگاساکی پر اس نے پلوٹو
گرایا تھا جس سے ناگاساکی کے دس ہزار شہری اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے۔ پلوٹونیم ب
بم سے کم ہلاکت خیز ہوتا ہے اور اس کا دائرہ اثر کسی ایک شہر تک ہی محدود رہتا
لازمی طور پر بھارت یہ بم وقت آنے پر پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا اور وہ
راولپنڈی اور لاہور کے شہروں کو تباہ کرنے کی ناپاک کوشش کرے گا۔"
میں نے کہا۔

"اس کا توڑ کیا ہو سکتا ہے؟ یعنی ہم پاکستان کے تحفظ کے لئے کیا اقدام ک
ہیں۔"
پروفیسر جمشید نے کہا۔

"سب سے بہترین توڑ تو یہ ہے کہ پاکستان بھی ایٹمی صلاحیت حاصل کرے۔ ا
پلوٹونیم بم بناتا ہے تو پاکستان کو ایٹم بم بنانا چاہئے تاکہ طاقت کا توازن برقرار رہے اور
معلوم ہو جائے کہ اگر اس نے لاہور یا کراچی پر پلوٹونیم بم گرایا تو پاکستان دلی ب
کلکتے پر ایٹم بم گرا کر انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔ دشمن کے طاقتور حملے کو صرف
سے زیادہ طاقتور جوابی حملے سے ہی روکا جا سکتا ہے۔"
گل خان گہری سوچ میں تھا۔ کہنے لگا۔

"کیا ہم کسی طرح بھارت کے ایٹمی عزائم کو ناکام نہیں بنا سکتے؟"
پروفیسر جمشید عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔ اس

پر بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔

انڈیا نے اپنے ایٹمی پروگرام کو بڑی مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا ہے۔ اس پروگرام کو
بنانے کے لئے بھارت میں وسیع پیمانے پر ایٹمی سائنس پر پر تحقیق کی جا رہی
بھارتی سائنس دانوں کی ایک پوری جماعت اس پر کام کر رہی ہے۔ اس کے
ائم کو ناکام بنانا مشکل ہے ہاں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے باہر کے ملکوں سے
بم یا پلوٹونیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے بھارت میں پہنچنے سے پہلے
پہنچنے پر تباہ کر دیں اس طرح سے ہم بھارت کے ایٹمی پروگرام کو موخر کر سکتے

ل خان نے جذباتی انداز میں کہا۔

اور اگر ہم بھارت کے ایٹمی ری ایکٹر کو ہی تباہ کر دیتے ہیں تو؟"
فیسر جمشید نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔

یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا"
انے کہا۔

پروفیسر! ہمارے لئے کوئی کام مشکل کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے اسلام یا
اور کشمیری مسلمانوں کی آزادی اور سلامتی کے لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی
یہ بتاؤ کہ ایک ایٹمی ری ایکٹر میں وہ کون سا کلیدی مقام ہوتا ہے کہ اگر اسے اڑا
تو سارا ڈھانچہ تباہ ہو جائے۔"
فیسر جمشید نے کہا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس وقت بھارت میں بمبئی کے قریب ایک
ری ایکٹر کام کر رہا ہے جس کے بارے میں یہی مشہور کیا گیا ہے کہ وہاں سے بجلی کے
ی حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن مجھے ایک خفیہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ راجستھان
مقام پر زیر زمین ایک خفیہ ایٹمی ری ایکٹر بھی کام کر رہا ہے۔ وہاں پلوٹونیم صاف
پلانٹ دن رات کام کرتا ہے۔ وہاں پلوٹونیم تیار کیا جا رہا ہے۔ اصل ایٹمی مرکز

راجستھان کا یہ خفیہ پلانٹ ہے۔ اگر کسی طریقے سے ہم اسے اڑا دیں تو میرے اندازے
کے مطابق بھارت کا ایٹمی پروگرام کم از کم سات آٹھ سال موخر ہو سکتا ہے۔"

میں نے گل خان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں اس مشن کو قبول کرتا ہوں"

پھر میں نے پروفیسر سے متوجہ ہو کر کہا۔

"پروفیسر کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ اس زیر زمین ایٹمی ری ایکٹر کی کون سی ایک
حساس کلیدی جگہ ہے جہاں پر اٹیک کرنے سے یہ ایٹمی مرکز تباہ ہو سکتا ہے"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"میں اس بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے کل رات آپ کو بتا سکتا ہوں۔"

بات اگلی رات پر جا پڑی۔ اگلی رات کا وقت طے کر لیا گیا اور پروفیسر جمشید چلا گیا
اس کے جانے کے بعد میں اور گل خان باتیں کرنے لگے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کشمیر
میں مجاہدین نے جہاد کی سرگرمیوں کو تیز کر دیا ہے۔ تازہ دم بھارتی فوجی یونٹیں وہاں پہنچ
رہی ہیں اور مجاہدین ان کے فوجی ٹھکانوں کو کمانڈو آپریشن سے تباہ کر رہے ہیں۔

وہ کہنے لگا۔

"مڈ گھاٹ پر تم لوگوں نے جو فوجی اسلحہ کی ٹرین اڑائی تھی اور پھر دوار کا فورٹ کو تباہ
کیا۔ اس سے مجاہدین آزادی کے حوصلے بہت بلند ہوئے ہیں۔ ان کا مورال اپ ہو
ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"میرا پروگرام تو یہ تھا کہ یہاں سے سیدھا کشمیر کے محاذ پر چلا جاؤں گا اور شیر دل
اور دوسرے کشمیری کمانڈوز کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک ہوں گا لیکن جب سے یہ
ہوا ہے کہ پاکستان کے خلاف بھارتی حکومت نے ایٹمی میزائلوں کی تیاری شروع کر
ہے میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کا ارادہ کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ میں سب
پہلے راجستھان کے زیر زمین خفیہ ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ل خان نے کہا۔

اس کے متعلق پروفیسر جمشید کل رات ہمیں کچھ بتا سکے گا کہ ہم کس طریقے سے
ایکشن کر سکتے ہیں۔ میں اب سونے جاتا ہوں۔ صبح ملاقات ہو گی"

گل خان بھی چلا گیا۔ میں بستر پر لیٹ کر راجستھان کے اٹامک انرجی کمشن ری ایکٹر
میں سوچنے لگا۔ اس قسم کے حساس اداروں میں سیکورٹی کے بہت سخت انتظام
ہیں۔ ایٹمی ری ایکٹر میں جتنے سائنس دان، ٹیکنیشن کلرک مزدور وغیرہ کام کرتے
ان کے پاس باقاعدہ شناختی کارڈ ہوں گے۔ ان کی آتے جاتے زبردست چیکنگ
ہو گی۔ باہر کے آدمی کا داخل ہونا بہت مشکل ہو گا۔ پھر بھی میں پر امید تھا۔ مجھے
میرے ایٹمی ری ایکٹر میں داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا ہو
اس ری ایکٹر کو تباہ کرنا اب ضروری ہو گیا تھا۔ اگر یہ انڈیا کی سیکورٹی کا معاملہ
تان کی نیشنل سیکورٹی کا نازک مسئلہ بھی تھا۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ جنگ
نے کی صورت میں انڈیا پاکستان کے شہروں پر پلوٹونیم بم یا ایٹمی میزائل گرا کر
بے گناہ پاکستانی عورتوں مردوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ یہ میرا
ر پاکستانی فریضہ تھا کہ میں دشمن کے ایٹمی ہتھکنڈوں کو جتنا نقصان پہنچا سکتا ہوں
نچاؤں۔ چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

را دن طلوع ہوا۔ گل خان میرے ساتھ ناشتہ کر کے چلا گیا۔ دوپہر کو آیا تو میرے
ۂ گیا۔ وہ کچھ فکر مند تھا۔ کہنے لگا۔

یرے آدمی نے اطلاع دی ہے کہ نئی دلی کے تھانے میں تمہاری تصویر موجود
احمد آباد میں تم نے کوئی تصویر اتروائی تھی۔"

ا نے اسے بتایا کہ پولیس نے جب مجھے گرفتار کیا تھا تو میری تصویر اتروا کر احمد آباد
ی جہاں سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جو نقلی کیپٹن
ۂ بن کر دوار کا فورٹ میں آیا تھا اور گولہ بارود کے ذخیرے کو تباہ کرنے کے بعد
گیا تھا۔

گل خان کہنے لگا۔

"اب تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اچھا کیا جو تمہیں یہاں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اگرچہ پولیس تمہیں دلی میں تلاش کرتی نہیں پھر رہی۔ ایسی کوئی ہنگامی صورت حال نہیں ہے۔ لیکن پولیس کو تمہاری تلاش ضرور ہے اور دلی کے تمام پولیس سٹیشنوں کو خبردار کر دیا گیا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ جس قسم کے مخدوش حالات پیدا ہو گئے ہیں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ڈاڑھی مونچھیں بڑھا لوں اور جس قدر حلیہ بدل سکتا ہوں بدل لوں کیونکہ مجھے دلی اور راجستھان کے آس پاس ہی رہنا ہے اور کمانڈو آپریشن شروع کرنا ہے۔"

گل خان بولا۔

"کم از کم یہ تو تمہیں ضرور کرنا ہو گا تمہارے سر کے بال زیادہ بڑے نہیں ہیں آج سے شیو کرنی بھی چھوڑ دو۔ اور یہاں سے ہرگز باہر مت نکلنا۔ محلے میں ابھی تک کسی کو تمہارے بارے میں علم نہیں ہے کہ تم میرے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ کیونکہ یہاں تمہاری مخبری ہو سکتی تھی"

میں نے اسے کہا۔

"ڈاڑھی مونچھوں کے بال بڑھنے میں تو بہت دن لگ جائیں گے۔ اتنے دن میں یہاں کیسے چھپا رہوں گا۔ کسی نہ کسی کو ضرور میرا پتہ چل جائے گا اور میں اس وقت کسی حالت میں بھی گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا مشن ہے جسے مجھے ہر حالت میں پورا کرنا ہے۔ یعنی راجستھان کے انڈین ایٹمی ری ایکٹر کی تباہی۔"

گل خان بولا۔

"رات کو پروفیسر جمشید کو آجانے دو وہ جو کچھ بتائے گا اس کی روشنی میں آگے کوئی فیصلہ کریں گے۔"

وہ دن بھی کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ میں گل خان کے مکان کے اوپر والے کمرے میں ہی بند رہا۔ وہ مجھے پانچ بجے آکر چائے بھی بنا کر دے گیا۔ اس نے احتیاط کے طور پر کھانا وغیرہ پکانے والے ملازم کو بھی چھٹی پر بھیج دیا تھا۔ تاکہ کسی کو خبر تک نہ ہو کہ اس مکان میں ایک پراسرار اجنبی ٹھہرا ہوا ہے۔

رات کے دس بجے پروفیسر جمشید آیا۔

اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی امید افزا معلومات حاصل کر کے نہیں لایا۔ میں اور گل خان اوپر والے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ گل خان نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا معلومات حاصل کی ہیں۔

پروفیسر جمشید سگریٹ سلگا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھارت کا یہ خفیہ ایٹمی ری ایکٹر راجستھان میں راج گڑھ سے آگے رام گڑھ کے مغرب میں دو صحرائی ٹیلوں کے درمیان زمین کے اندر بنایا گیا ہے۔ اس کا ریکارڈ کسی سرکاری فائل میں ایٹمی ری ایکٹر کی حیثیت سے نہیں ہے۔ صحرائی ٹیلوں کے درمیان ایک جانب چھوٹی سی دومنزلہ عمارت بنی ہوئی ہے جس کے باہر منرل یعنی معدنی ریسرچ سنٹر کا بورڈ لگا ہے۔ ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ یہاں معدنیات کے بارے میں تحقیق کا کام ہوتا ہے لیکن اس عمارت کے نیچے ایٹمی ری ایکٹر لگا ہوا ہے جس کو راستہ اسی آفس کے اندرونی احاطے کے ایک خفیہ کمرے سے ہو کر جاتا ہے۔ اس ایٹمی ری ایکٹر میں پلوٹونیم کا پلانٹ لگا ہے۔ جہاں افزودہ یورینیم اور ایٹمی ایندھن تیار کرنے پر بھی کام شروع ہو چکا ہے۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر زمین کے نیچے کافی وسیع رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور انتہائی جدید پیمانے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ تازہ ہوا اور پانی کے نکاس کا پورا انتظام ہے۔ جہاں تک سکیورٹی کا معاملہ ہے تو میری معلومات کے مطابق اس دفتر اور خاص طور پر زیر زمین ایٹمی ری ایکٹر کے اندر وہاں کے کارکنوں کے سوا کسی دوسرے آدمی کا داخل ہونا ناممکن ہے۔ وہاں کوئی ڈیڑھ دو سو کے قریب سائنس دان اور ٹیکنیشن مختلف شفٹوں میں کام کرتے ہیں اور دن

کام ہو رہا ہے۔"

میں اور گل خان خاموشی سے پروفیسر جمشید کی باتیں سن رہے تھے۔ گل خان کچھ سا ہو گیا تھا۔ مگر میں ناامید نہیں تھا میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"وہاں کام کرنے والے لوگ کہاں رہتے ہیں؟"

پروفیسر نے بتایا کہ رام گڑھ سے پہلے راج گڑھ کے بڑے قصبے میں ان کے لئے پختہ روں اور تین تین کمروں والے کوٹھی نما کوارٹرز بنے ہیں۔ یہ لوگ وہاں رہتے ہیں ام نہاد منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی گاڑیاں انہیں لینے آجاتی ہیں۔ وہاں کسی بڑے نس دان کو بھی اپنی کار رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

"اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ کسی کو شک نہ پڑے کہ یہ اونچے عہدے کے لوگ اتنے چھوٹے سے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کیسے ملازم ہو گئے ہیں"

پروفیسر جمشید نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں کسی کو اپنی فیملی لانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہفتہ وار چھٹی پر یہ لوگ ل یا دوسرے قریبی شہروں میں اپنی اپنی فیملی کو ملنے چلے جاتے ہیں۔ جو سائنس دان ے بڑے شہروں یعنی دلی، بمبئی کلکتہ سے یہاں آئے ہیں وہ مہینے میں ایک بار اپنے گھر یں انہیں صرف چار دن کی چھٹی ملتی ہے۔ یہاں ہر شے انتہائی رازداری میں رکھی ہے۔ اگر میں سرکاری سائنسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں کام نہ کر رہا ہوتا تو اتنی ت بھی حاصل کرنا ناممکن تھا۔"

پروفیسر جمشید چونکہ ہمارا اپنا آدمی تھا اس لئے گل خان نے اسے بھی بتا دیا کہ نئی دلی لیس سٹیشن پر میری تصویر پہنچ چکی ہے۔ پروفیسر جمشید کی میں نے یہ عادت نوٹ کی جب بھی وہ کسی بات پر ذرا سوچنے لگتا تھا تو عینک اتار کر رومال سے اس کے شیشے رنے لگ جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔ وہ میری طرف تھا۔ پھر گل خان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے ہمارے دوست کو فوراً اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہوگا"

گل خان نے کہا۔

"یہ کام ابھی سے شروع ہو گیا ہے"

میں نے کہا۔

"میں یہی کر سکتا ہوں کہ سر کے بال بڑھا لوں۔ داڑھی مونچھیں رکھ لوں۔ پلاسٹک سرجری تو میں کرا نہیں سکتا۔"

پروفیسر جمشید نے گہری سوچ میں سے ابھرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری پلاسٹک سرجری بھی کرائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے بڑی رازداری کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر بہترین پلاسٹک سرجن مدراس میں ہے۔ مگر اس پر کافی رقم خرچ ہوگی۔ ہمارے پاس اتنے فنڈ نہیں ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی پروفیسر' میں اپنا حلیہ اس طرح تبدیل کروں گا کہ پولیس بھی مجھے نہیں پہچان سکے گی۔ میں تو اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ راجستھان کے اٹیمی ری ایکٹر میں کس طرح داخل ہوا جائے اور پھر صرف داخل ہونا ہی کافی نہیں۔ وہاں رہ کر ماحول کا جائزہ لینا ہوگا اور ایسی سکیم تیار کرنی ہوگی کہ اٹیمی ری ایکٹر کے پلانٹ کو دھماکے سے اڑایا جا سکے۔"

ہم تینوں خاموش ہو گئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا کیا ایسا کوئی ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ میں اٹیمی ری ایکٹر میں معمولی کلرک یا مزدور کی شکل میں بھرتی ہو جاؤں؟

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہاں کسی مقامی آدمی کو ملازم نہیں رکھا جاتا۔ جتنے کلرک یا آن سلکٹر ورکرز ہیں انہیں بھی ریواڑی کے شہر یا دلی سے بھرتی کر کے وہاں بھیجا گیا ہے۔ ان کی باقاعدہ بریفنگ ہوئی ہے اور ان سے تحریری حلف لیا گیا ہے کہ وہ باہر اپنی بیوی بچوں سے بھی اٹیمی ری ایکٹر کی سرگرمیوں کے بارے میں ذکر نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنے فیم

ں کو بھی یہی بتایا ہوا ہے کہ وہ رام گڑھ کے معدنیاتی ریسرچ سنٹر میں کام کرتے ہیں۔ ں راجستھان کی زمین کے اندر معدنی ذخائر کی بابت ریسرچ ورک ہوتا ہے۔"

میں نے یونہی پروفیسر سے سوال کر دیا۔

"اس اٹیمی ری ایکٹر کا ڈائریکٹر ضرور کوئی اسرائیلی ہوگا"

پروفیسر نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ اس کا ڈائریکٹر ایک سکھ سائنس دان ہے جس نے امریکہ اور سویڈن اٹیمی پروسیسنگ اور نیوکلر فزکس کی خاص طور پر تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا نام ڑ ارجن سنگھ سوڈھی ہے۔ اس کی فیملی بھی دلی میں رہتی ہے۔ وہ اکیلا راج گڑھ کے ٹی کوارٹرز میں ایک نسبتاً بہتر چھوٹی سی کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔ مہینے میں ایک بار دلی فیملی کے پاس جاتا ہے۔ ویسے اس کے بارے میں میرے سراغ رساں نے ایک پ بات ضرور بتائی ہے"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

پروفیسر مسکراتے ہوئے بولا۔

"سردار جی پیتے پلاتے بھی ہیں اور ہفتے کی رات کو ریواڑی میں کسی عورت کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں اس نے یہی بتایا ہوا ہے کہ ریواڑی میں اس کا چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ اس کے پاس ویک اینڈ گزارنے چلا ہے۔"

میری خاص کمانڈو حس بیدار ہوئی۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"یہ عورت کون ہے؟"

پروفیسر بولا۔

"میرے سراغ رساں کا کہنا ہے کہ یہ ریواڑی کی کوئی نیم طوائف ہندو عورت ہے اس کا نام درگاوتی ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک پوری سکیم آ گئی۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"آپ مجھے ریواڑی میں درگاوتی کے مکان کا پتہ لا کر دے سکتے ہیں؟"

گل خان میری طرف تکنے لگا۔

"یہ تم کس لئے پوچھ رہے ہو؟"

میں نے اسے کہا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ کیونکہ میرا کوئی منصوبہ ایسا نہیں ہوگا جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ پڑے۔"

پروفیسر نے کہا کہ وہ اپنے آدمی سے درگاوتی کاریواڑی کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے گل خان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گل خان بھائی! میں نے سر کے بال اور ڈاڑھی مونچھیں بڑھانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ اب میرے کام آئے گا"

اس نے پوچھا۔

"وہ کس طرح؟"

میں نے کہا۔

"مجھے سکھ بننا ہوگا۔ میں سکھوں کی طرح اپنے بالوں کا جوڑا بنا کر پگڑھی باندھوں اور ڈاڑھی بھی سکھوں ایسی بڑھاؤں گا۔"

"مگر اس میں تو دو مہینے لگ جائیں گے"

"کوئی بات نہیں۔ میرے کمانڈو مشن کا تقاضا ہے کہ میں جب تک پورا سکھ نہ بن جاؤں۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھاؤں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دلی پولیس آ سے مجھے پہچان نہیں سکے گی۔"

"لیکن تم سکھ بن کر کرو گے کیا؟" پروفیسر نے سوال کیا۔ میں نے اسے جواب دیا

"پہلے مجھے سکھ بن جانے دو۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ میرے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ تم صرف مجھے اتنا بتادو کہ کہیں دو مہینوں میں ایٹمی ری ایکٹر کا ڈائریکٹر ارجن سوڈھی یہاں سے تبدیل ہو کر تو نہیں چلا جائے گا؟"

پروفیسر جمشید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایٹمی ری ایکٹر کے پراجیکٹ میں کسی چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ساتھ لانگ ٹرم کے معاہدے ہوئے ہیں اور ڈائریکٹر ارجن سنگھ سوڈھی تو پلوٹونیم بم کے دھماکے اور ایٹمی راکٹ اور میزائل تیار کرنے تک وہیں رہے گا۔ یہ بات طے شدہ ہے۔"

میں نے مطمئن ہو کر کہا۔

"بس پھر ٹھیک ہے"

ان لوگوں نے مجھ سے بہت پوچھا کہ میری سکیم کیا ہے مگر میں نے یہی کہا کہ اپنی سکیم سکھوں والا حلیہ بنانے اور اپنا ایک نقلی سکھ نام رکھنے کے بعد بتاؤں گا۔

چونکہ ابھی مجھے اپنے سر کے اور ڈاڑھی کے بالوں کے بڑے ہونے کے انتظار میں کم از کم ڈیڑھ دوماہ تک وہاں ٹھہرنا تھا اس کے پیش نظریہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے گل خان کے مکان سے کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں میں آسانی سے آس پاس چل پھر سکوں اور کوئی مجھے آسانی سے دیکھ بھی نہ سکے۔ ایسی جگہ دلی شہر کے شمال مغرب میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے عقب میں جو پرانا قبرستان ہے وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر جنگلی بیریوں کے درختوں کے نیچے ایک پرانی قبر ہے۔ اس قبر کی چاردیواری کے پاس ایک پرانا مکان تھا یہاں گل خان مجھے لے آیا۔

"یہاں تم پر کسی کو شبہ نہیں پڑے گا۔ تم ویسے دن کے وقت مزار شریف کی طرف مت جانا۔ کیونکہ زیادہ لوگ اس طرف ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا تمہیں صبح شام کھانا پہنچا دیا کرے گا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں دوسرے تیسرے دن آجایا کروں گا۔ اگر کسی قسم کی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو کوشش کرنا کہ خواجہ صاحب کے مزار کے بڑے گیٹ کے پاس پبلک ٹیلی فون بوتھ سے مجھے اس نمبر پر خبر کر دینا۔"

گل خان نے مجھے نمبر لکھ دیا۔ یہ ایک شکستہ دیواروں اور چھت والے اکیلے کمرے کا مکان تھا جس کے آگے چھوٹا سا صحن اور آگے دیوار تھی جس پر املی کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ چارپائی اور بستر پہلے سے پہنچا دیا گیا

تھا۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ دسمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ میں صبح صبح اٹھ کر مکان کے پیچھے جو کھیت تھے اور جہاں مغلیہ زمانے کی ایک پرانی قبر کی چاردیواری تھی اس طرف سیر کرنے نکل جاتا۔ تھوڑی دور تک سیر کرتا۔ وہیں تھوڑی سی ورزش کرتا۔ کیونکہ کمانڈو کو اپنے آپ کو فٹ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا سائیکل پر میرے لئے دو وقت کا کھانا اور تھرمس میں چائے لے کر آجاتا۔ دن کا سارا وقت میں مکان کے اندر اور مکان کے صحن میں دھوپ میں بیٹھ کر گزار دیتا۔ چھوٹا سا غسل خانہ مکان کے احاطے کے کونے میں تھا۔ ایک دن چھوڑ کر گل خان بھی آجاتا اور میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نئی دلی پولیس کی جانب سے میری تلاش کے سلسلے میں ابھی تک کوئی نمایاں کارروائی شروع نہیں کی گئی۔

"تمہاری تصویر نئی دلی کے تھانے میں دوسرے مجرموں کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے۔ ہم اگر وہاں سے تصویر نکال بھی لائیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ ایک تصویر گم ہو جانے کے بعد وہاں دوسری تصویر لگا دی جائے گی"

ہفتے کی شام کو پروفیسر جمشید بھی آجاتا۔ آہستہ آہستہ میرے سر کے اور ڈاڑھی مونچھوں کے بال بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک قدرتی عمل تھا۔ گل خان نے دو تین بار مجھ سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں سکھ بن کر کیا کروں گا۔ میں نے ہنس کر اسے ٹال دیا۔ میں وقت آنے سے پہلے انہیں اپنے منصوبے اور کمانڈو ایکشن کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے منصوبے پر ضرور ہنسیں گے اور اسے دور از کار اور ناقابل عمل بتائیں گے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی لیکن مجھے مردوں کی نفسیات خاص طور پر سکھوں کی نفسیات کا گہرا تجربہ تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ میں سکھوں کے مقدس شہر امرتسر کا رہنے والا تھا اور بچپن سے سکھوں کو دیکھتا چلا آیا تھا۔ مجھے اپنے منصوبے کی کامیابی کا سوفیصد نہ سہی ساٹھ فیصد ضرور یقین تھا اور میرے ساٹھ فیصد کامیابی کافی تھی۔

دن کو سردی کی وجہ سے میں تھوڑی بہت دھوپ تاپ لیتا تھا۔ رات کے وقت کم

کر چارپائی پر بیٹھا اندھیرے میں سگریٹ پیتا رہتا۔ مجھے رات کے وقت لالٹین یا دیا
انے سے گل خان نے منع کر رکھا تھا۔ دسمبر کے آخر اور جنوری کے مہینے کے شروع
رشیں ضرور ہوا کرتی ہیں۔ یہ سردیوں کی بارشیں ہوتی ہیں اور بڑی ٹھنڈی ہوائیں
ہیں۔ گل خان نے مجھے ایک نیلے رنگ کا پرانا گرم اوور کوٹ دے دیا تھا کہ اگر
زیادہ ہو تو میں اسے پہن لیا کروں۔ مجھے اس شکستہ مکان میں آئے دس پندرہ دن ہو
تھے۔ میری ڈاڑھی کے اور سر کے بال کافی بڑھ آئے تھے۔ مگر ابھی سکھوں والی
ڈاڑھی نہیں بنی تھی اور سر کے بالوں کا بھی جوڑا نہیں بن سکتا تھا۔

ایک دن صبح کو ہی آسمان پر بادل چھانا شروع ہو گئے۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔
میں اضافہ ہو گیا۔ میں کمرے میں ہی دروازہ بند کر کے چارپائی پر کمبل اوڑھے لیٹا
گل خان ایک دن پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اس کے آنے کی امید نہیں تھی۔
ل والا لڑکا ٹفن کیریئر میں دو وقت کا کھانا اور چائے والی تھرمس دے کر جا چکا تھا۔ میں
ے کے بعد کچھ دیر کے لئے سو گیا۔

سو کر اٹھا تو مجھے باہر بادلوں کی گرج سنائی دی۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے
مجھ گیا کہ باہر شام ہو گئی ہے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کا ایک پٹ کھولا تو اندر سرد ہوا کا
کا آیا۔ مجھے کمانڈو ٹریننگ نے بہت سخت جان بنا دیا ہوا تھا۔ عام لوگوں کی طرح مجھے
ی گرمی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہی حال بھوک پیاس کا تھا۔ میں زیادہ سے
دیر تک بھوک اور پیاس کو برداشت کر سکتا تھا۔ میں کھڑکی میں ہی کھڑا رہا۔ باہر
ج غروب ہو چکا تھا اور شام کا سرمئی دھندلکا بادلوں کی وجہ سے زیادہ گہرا ہونے لگا تھا۔
نے ہاتھ الٹا کر کے کھڑکی سے باہر نکالا۔ ابھی بارش شروع نہیں ہوئی تھی بادل میں
ی تھوڑی دیر کے بعد ہلکی کبھی زیادہ گرج سنائی دے جاتی تھی۔

میرا دل کمرے کی فضا سے نکل کر باہر سیر کرنے کو مچلنے لگا۔ یہ جگہ ایک تو ویسے بھی
آباد علاقے میں تھی اور دوسرے سردی اور بادلوں کی وجہ سے دور دور تک کوئی انسان
پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لمبا گرم اوور کوٹ پہنا۔ کمرے کو تالا لگایا اور

مکان کے عقب میں جو میدان تھا اس کے ساتھ ساتھ درگاہ شریف کی طرف چلنے لگا۔
ہوا چل رہی تھی۔ خوب سردی پڑنے لگی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے وسطی
کے تاریک جنگلوں کی راتوں کے اندھیرے دیکھے تھے۔ یہ تو شہر کی شام کا اندھیرا تھا۔ اس
میں مجھے ہر شے صاف نظر آرہی تھی۔ جنگلوں میں راتوں کو دربدری کرتے رہنے کی وجہ
سے میری آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں کی تھوڑی تھوڑی صفت پیدا ہو گئی تھی اور جہاں
دوسرے آدمی کو رات کے وقت کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا وہاں میں کچھ نہ کچھ دیکھ لیتا تھا۔

چلتے چلتے میں ان بیریوں کے درختوں کے پاس پہنچ گیا جو کسی مغلیہ دور کی کسی قد
قبر کی دیوار پر جھکے ہوئے تھے۔ جب میں قبر کے احاطے کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے قریب
گزرا تو میرے دل میں قبر پر فاتحہ پڑھنے کا خیال آگیا۔ میں نے وہیں سے اپنا رخ احا
کے دروازے کی طرف کر لیا۔ دروازہ دیوار سے زیادہ خستہ حال تھا۔ بس پرانی اینٹوں
چوکھٹ ہی رہ گئی تھی۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کی پرانی اینٹیں بھی جگہ جگہ
اکھڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے سنگ مرم
ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر پر کوئی دیا نہیں جل رہا تھا۔ رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے
قبر پر ایک افسردہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاموشی سرد آہیں بھرتی محسوس ہوتی تھی

میں نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور قبر کے قریب ہی ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا
خدا جانے یہ کس شہزادے یا شہزادی یا کس گمنام ہستی کی قبر ہو گی۔ جس کی زندگی
کیسے ہنگاموں سے بھرپور گزری ہو گی۔ اور اب اس کی قبر پر سوائے ویران اور غ
انگیز خاموشی کے اور کچھ باقی نہیں۔ میں اپنی محدود سوچ کے مطابق انسان کی بے ثبا
غور کرنے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں، میں نے سوچا، کہ اگر انسان اپنی موت کے تص
اپنی قبر کے تصور کو آنکھوں کے سامنے رکھے یا کبھی کبھی اس کا تصور ہی کر لیا کرے
بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

بادلوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی۔ دو سیکنڈ بعد بادل گرجے اور آہستہ آہستہ
گرج دور ہوتی گئی۔ یہاں سردی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ قبر کے احا

اری رات کے اندھیرے میں گم ہو رہی تھی۔ جس طرف دیوار پر بیری کے درخت
ہوئے تھے اس طرف زیادہ اندھیرا تھا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہم بیری کے درختوں
ڑا ڈرا کرتے تھے اور گرمیوں کی دوپہروں میں ان درختوں کے پاس نہیں جایا کرتے
اگر جاتے بھی تو ایک خوف دل میں رہتا تھا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ بیری کے
ں میں چڑیلیں رہتی ہیں جو بچوں کو پکڑ کر ان کے کلیجے نکال کر کھا جاتی ہیں۔ بڑے ہو
ر خاص طور پر کمانڈو بن جانے کے بعد اس قسم کے ڈر خوف سے میرا ذہن پاک ہو
۔ اب تو ایسے ایسے خطرناک جنگلوں میں ایسے ایسے گھنے درختوں پر راتیں گزاری
کہ اگر آپ ان درختوں کو دن کے وقت دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔ میں مغلیہ عہد کی
قبر کے پاس شروع رات کے اندھیرے میں اطمینان سے بیٹھا تھا۔ مجھے بالکل ڈر
محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا۔

گرم اوور کوٹ میں مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ بادلوں میں ایک بار پھر بجلی
گئی اور اس کے بعد بادل گرجنے لگے۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ میں جہاں
تھا میرے اوپر درخت کی گھنی شاخیں تھیں۔ مجھے ان شاخوں میں بارش کے قطروں
رنے کی خاص آواز سنائی دی۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ پھر میرے سر پر بھی بارش
دو ایک بوندیں گریں۔ میں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ میں اٹھنے لگا تو مجھے
لگا جیسے کسی نے سرد آہ بھری ہو۔ یہ آواز میں نے صاف سنی۔ میں نے آس پاس
رے میں دیکھا وہاں سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ آپ نے میری داستان میں
ہو گا کہ میں روحوں کا بڑا قائل ہوں۔ صرف قائل ہی نہیں ہوں بلکہ اکثر روحیں
ملتی رہی ہیں۔ میں یہی سمجھا کہ ضرور یہ اس مرحوم کی روح نے سرد آہ بھری ہے
کا جسد خاکی اس قبر میں پڑا ہے۔

میں جان بوجھ کر اس خیال سے وہاں بیٹھا رہا کہ اگر وہاں قبر والے کی روح آئی ہوئی
و شاید مجھ سے کوئی بات کرے۔ میں نے روحوں سے اکثر باتیں کی تھیں اور ان کی
کی بھی تھیں۔ لیکن ان روحوں سے جب بھی میں نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد

کی زندگی کیسی ہوتی ہے تو اس کے جواب میں ہر روح نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ کر
نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک روح نے تو مجھے یہ کہہ کر ایسے سوا
پوچھنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

”یہ خدائی راز ہے۔ کسی روح کو یہ راز بتانے کی اجازت نہیں۔ اگر آئندہ تم نے
سوال پوچھا تو میرا تمہارے پاس آنا جانا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔“

اس کے بعد میں نے کسی روح سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔ میں قبر کے پاس خاموش
بیٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ شاید کوئی روح مجھ سے ہم کلام ہو۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی
بادلوں کی گرج سنائی دیتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ بارش باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھ
معمولی سی بونداباندی ہونے لگی تھی جو درخت کے نیچے بہت کم محسوس ہوتی تھی۔

میں دیر تک وہاں قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ اب بونداباندی زیادہ ہونے لگی تھی۔ اند
بھی گہرا ہو گیا تھا۔ رات آگئی تھی۔ میں اٹھ کر اکیلی قبر کے مقبرے سے باہر آگیا اور ا
مکان کی طرف چلنے لگا۔ باہر آکر محسوس ہوا کہ بونداباندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیا
رہی ہے۔ میں نے اپنے قدم تیز کر لئے۔ جب مکان کے قریب پہنچا تو بارش زیادہ تی
گئی تھی۔ کمرے میں آکر میں نے اوورکوٹ اتار کر اسے جھاڑا اور دیوار میں ٹانگ
گل خان نے مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ اگر بہت ضرورت محسوس ہو تو
بتی جلا لینا۔ مگر جلانے سے پہلے کھڑکی دروازہ بند کر لینا اور موم بتی کو کونے میں رکھ کر
کے آگے کوئی چیز اس طرح رکھ دینا کہ اس کی روشنی کھڑکی اور دروازے کی درزوں
پڑے۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ کمرے میں تھوڑی سی روشنی ضرور ہونی چاہئے۔
کی اندھیری راتوں میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ نظر آتا رہتا ہے۔ لیکن رات کے وقت
کمرے میں اگر لائٹ نہ جل رہی ہو تو اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں
اپنے تجربے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ دیکھ لیتا تھا۔ مگر اس وقت دل چاہ رہا تھا کہ ذرا
ہو اور روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ پیا جائے۔

میری جیب میں تین چار موم بتیاں کاغذ میں لپٹی ہوئی موجود تھیں۔ میں

تی جلا کر کونے میں فرش پر لگا دی اور اس کے آگے کھانے کا جو ٹفن کیریر تھا وہ رکھ
فن کیریر کے سائے کے بہت بڑے بھوت نے پونے کمرے کو اندھیرے سے ڈھانپ
ب میں کھڑکی بھی کھول سکتا تھا لیکن احتیاط کے طور پر میں نے ایسا نہ کیا اور چارپائی
ار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگایا اور بند کھڑکی میں سے آتی بارش کی ہلکی ہلکی
سننے لگا۔ یہ بڑی رومانٹک سی آواز تھی۔ اس آواز کو شاعر لوگ بہت پسند کرتے
لیکن میں شاعر نہیں تھا۔ میں نے دور دراز گمنام بارانی جنگلوں کی ایسی ایسی
ادھار بارشیں دیکھی تھیں کہ جن کی آواز ایسی ہوتی تھی جیسے سمندر کی طوفانی
ں چٹانوں سے ٹکرا رہی ہوں۔ اس آواز سے انسان کا دل دہل جاتا تھا۔

میں بارش کی دھیمی دھیمی آواز بھی سن رہا تھا اور نیم وا آنکھوں سے بند دروازے
طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بند دروازے میں سے کوئی سفید
نکل کر اندر آگیا ہے۔ میں نے آنکھیں پوری کھول دیں۔ مگر سایہ کمرے میں آتے
یسے غائب ہو گیا۔ میں نے دو تین بار آنکھیں جھپکائیں۔ شاید یہ میرا وہم تھا سگریٹ
ی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب افسردہ قسم کی یکسانیت سی چھائی
تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتا رہا۔ سردی کی وجہ سے میں نے کمبل
نے گھٹنوں پر ڈال رکھا تھا۔ جب سگریٹ ختم ہونے لگا تو میں نے جھک کر فرش پر رکھے
کے ایش ٹرے میں اسے بجھا دیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور سونے کی تیاری
نے لگا۔ ابھی میں کمبل کو ٹھیک کر رہا تھا کہ بند دروازے کے پاس وہی سفید سا ہیولا
بار پھر نظر آیا۔

اب میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے تجربے اور میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا کہ یہ
ی چیز کا سایہ ہے۔ سایہ ابھی تک دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس تھا۔ سائے کی
ید بادل ایسی سفیدی آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا
رسائے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم کون ہو؟ کس مقصد کے لئے آئے ہو؟“

سفید سایہ آہستہ آہستہ فضا میں تیرتا ہوا میری چارپائی سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر
آکر رک گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ سفید ہیولے نے اب ایک انسانی جسم کی شکل
اختیار کرلی تھی۔ میں نے مزید غور سے دیکھا یہ کوئی انیس بیس سال کا نوجوان تھا جس کا
لباس سر سے پاؤں تک سفید تھا۔ سر پر مغل شہزادوں والی پگڑی تھی پگڑی بھی سفید تھی۔
سائے نے بڑی صاف مگر دور سے آتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں مغل شہزادے کی روح ہوں۔ تم نے فاتحہ پڑھ کر مجھے ثواب پہنچایا تھا۔
آسمانوں پر میری روح کو سکون ملا۔ میں تمہیں تمہاری بھلائی کی ایک بات بتانے تمہارے
پاس آیا ہوں۔"

مجھے ذرا بھی ڈر خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ روحوں سے اکثر اس قسم کی میری
ملاقاتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ ویسے بھی نیک روحوں کو دیکھ کر دل کو بڑا سکون ملتا ہے۔ نیک
روحیں اپنے ساتھ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں لاتی ہیں۔ میں نے مغل شہزادے سے
مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ کسی قبر کو دیکھے تو فاتحہ پڑھ کر مرنے والے کی روح
کو ثواب پہنچائے۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"مسلمان اپنے فرائض بھولتے جا رہے ہیں۔ میں تم سے اس لئے بھی خوش ہوں کہ
اسلام کا سچا جذبہ تمہارے اندر ابھی زندہ ہے اور مظلوم کشمیری مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر
اپنے گھر سے نکل کر دشمن ملک میں آئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"خدا مجھے اسلام، پاکستان اور اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں اور مجاہدوں کی مدد کی توفیق
عطا فرمائے۔ لیکن میرے دوست میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری بھلائی کی جو
بات کی ہے اور جس کی خاطر تم آسمانوں سے اتر کر زمین پر آئے ہو وہ کیا ہے؟"

مغل شہزادے کی روح کہنے لگی۔

"سنو! تم پر عنقریب ایک بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ میں تمہیں اس سے
رنے آیا ہوں"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا یہ کوئی آسمانی آفت ہے اور کیا میں اس سے خبردار ہو کر بچ سکتا ہوں؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"انسان اکثر اپنی پیدا کی ہوئی آفتوں اور عذابوں میں پھنستا ہے۔ تم پر بھی جو آفت
ہونے والی ہے وہ خود تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔"

میں بے چین سا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ نیک روحیں ہمیشہ سچ بولتی ہیں۔ وہ جھوٹ
بولتیں۔ اگر مغل شہزادے کی اس نیک روح نے کہا ہے تو ضرور مجھ پر کوئی آفت
ہونے والی ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ آفت کس نوعیت کی ہوگی تو
نے جواب دیا۔

"یہ بتانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔ یہ قدرت خداوندی کے راز ہیں اور ہم ان
ں کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ تم چونکہ جہاد کشمیر میں شریک ہو کر کشمیری مسلمانوں پر ظلم
والے کفار کا مقابلہ کر رہے ہو اور تم نے اللہ کے پسندیدہ دین اسلام کی سربلندی
لئے اپنی جان کی بازی لگا رکھی ہے اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہو اس
اللہ کے حکم سے تمہیں آنے والی آفت سے آگاہ کرنے آیا ہوں"

میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"اے نیک روح! میں اللہ کی راہ میں اپنے اوپر آنے والی آفتوں کی پروا نہیں کرتا۔
آفت میرے کسی گناہ کی سزا ہے تو میں اس کا مقابلہ بھی کروں گا۔ اور خدا کے
سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگوں گا۔"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"یہی ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے کہ اگر اس کو اپنے گناہوں کا احساس ہو تو وہ اللہ
پنے گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ مجھے

قدرت خداوندی کی جانب سے ایک بات کی اجازت ملی ہے کہ میں تمہیں اتنا بتادوں کہ
جب تم پر آفت نازل ہوگی تو تمہیں کیا کرنا ہوگا"

میں ہمہ تن متوجہ ہوگیا۔

"نیک روح! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا۔ مجھے بتاؤ کہ
آفت زدہ ہونے کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

مغل شہزادے کی روح نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے سفید نورانی چہرے نے
آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر دھیمی اور دور سے آنے والی آواز میں
کہا۔

"ہندوستان کے شہر نجیب آباد کے باہر پتھر گڑھ کا پرانا قلعہ ہے۔ یہ قلعہ نواب نجیب
الدولہ مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں بنوایا تھا۔ نواب نجیب الدولہ برصغیر پاک و ہند میں
حق و باطل، کفر و اسلام کی جنگ کے وہ بہادر مجاہد تھے جنہوں نے ہندوؤں کے اسلام دشمن
ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور اسلام کا پرچم بلند کئے رکھا۔ پتھر گڑھ کا قلعہ اسی
مجاہد کی یادگار ہے۔ اس قلعے کے عقب میں نجیب آباد کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں
یہاں ایک خطرناک دشوار گزار جنگل ہے جس کا نام کجلی بن ہے۔ کجلی بن کے جنگل میں
ایک ٹیلہ ہے جس کو لال پہاڑی کہتے ہیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس ٹیلے کی چوٹی
ساتھ ساتھ دو سرخ رنگ کی مخروطی چٹانیں کھڑی ہیں۔ جب تم پر آفت نازل ہو تو تم
بن کے جنگل کی لال پہاڑی پر جانا۔ یہاں پہاڑی کے دامن میں ایک پرانا کنواں ہے۔ ا
کنوئیں کے پاس بانس کے جھنڈ میں ایک قبر ہے۔ اس قبر کا اب نشان ہی باقی رہ گیا۔
کے پتھر زمین سے ابھرے ہوئے ہیں تم وہاں باوضو ہو کر فاتحہ پڑھنا۔ یہ اس مسلمان خا
کی قبر ہے۔ جو کفر و اسلام کے معرکے میں مرہٹہ سپاہیوں کے ایک دستے سے مقابلہ
ہوئی شہید ہوگئی۔ اگر اس شہید خاتون کی روح تمہیں اپنی ملاقات کا شرف عطا کرنے
آگئی تو اس کے آگے اپنی آفت بیان کرنا۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے
تم پر پڑی ہوئی آفت کیسے دور ہو سکتی ہے۔"

میں نے مغل شہزادے کے بیان کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا تھا اور ساری
بل اپنے ذہن میں یاد کر لی تھی۔ اور اسے کئی بار ذہن میں دہرا بھی لیا تھا۔ مغل
دے کی روح نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

اور روح کا سفید سایہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جا کر غائب ہوگیا۔ مغل
دے کی روح کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں کھو گیا۔ سوچنے لگا کہ کس قسم کی
ت مجھ پر نازل ہونے والی ہے۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ پاک!
گناہ گار تیرا بندہ ہوں۔ میری غلطی قصور معاف کر دینا اگر مجھ پر کوئی آفت ضرور آنے
والی ہے تو اپنے کرم سے مجھے اتنا حوصلہ عطا کرنا کہ میں اسے برداشت کر سکوں۔ اس
بعد میں نے اپنے بٹوے میں جو چھوٹی سی نوٹ بک تھی اس میں وہ تمام تفصیل درج
لی جو مجھے مغل شہزادے کی روح نے بتائی تھی۔ نجیب آباد کے گھنے جنگلوں میں میں
دوبار گیا ضرور تھا اور کجلی بن کے بارے میں بھی سن رکھا تھا مگر لال پہاڑی کبھی نہیں
ی تھی۔ میں نے ابھی سے اپنے آپ کو آنے والی مصیبت کے لئے تیار کر لیا اور اس
خیال کو دل سے نکال کر اپنے اگلے کمانڈو مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ باہر بارش
آواز تیز ہوگئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ سرد ہوا کے ساتھ بارش کی باریک
ہاڑ میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کپڑے بدل کر موم بتی
ائی اور سو گیا۔

گل خان اگلے روز شام کو آیا تو میں نے اسے مغل شہزادے کی روح کے بارے میں
ہ نہ بتایا۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا ہمارے کمانڈو مشن سے
ئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کافی رات گئے تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دلی
لیس کو میری تلاش ضرور ہے مگر میری تلاش میں کوئی بڑے پیمانے پر مہم شروع نہیں
ئی۔ صرف خفیہ ایجنسیوں کو خبردار کر دیا گیا ہے اور خفیہ پولیس کے آدمی ایئرپورٹ،
لوے سٹیشنوں، سنیما گھروں اور بڑے بڑے ریستورانوں کے باہر تعینات کر دیئے گئے

ہیں۔ ان کے پاس میری تصویر بھی ہے۔ میں نے کہا۔

"اب تو میں یہاں سے سکھ بن کر ہی نکلوں گا۔ میرا حلیہ اتنا بدل گیا ہوگا کہ پہلی نظر میں کسی کو مجھ پر شک نہیں پڑ سکے گا"

"پھر بھی تمہیں ان علاقوں سے دور رہنا ہوگا جہاں خفیہ پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔"

میں نے گل خان کو بتایا کہ سکھ بننے کے بعد دلی میں نہیں رہوں گا۔ مجھے یہاں سے دوسرے شہر جانا ہوگا۔ اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"آخر تم اپنے منصوبے کو اتنا چھپا کر کیوں رکھ رہے ہو۔ ہم تمہارے اپنے آدمی ہیں۔ ہمیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"گل خان بھائی! حرج کی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے عہد کر رکھا ہے کہ اپنے پراجیکٹ کا انکشاف صرف اس وقت کروں گا جب میں اپنے مشن پر روانہ ہوں گا"

گل خان تھرمس میں سے پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ وہ وقت بھی جلد آجائے گا۔"

ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ بارش دوپہر کے بعد تھم چکی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"تم یہاں سے باہر سیر وغیرہ کے لئے کس وقت نکلتے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ صرف منہ اندھیرے قریبی کھیتوں میں جا کر ہلکی پھلکی ورزش کر لیتا ہوں۔ وہ بولا۔

"پھر بھی تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

رات کے دس بجے کے قریب گل خان چلا گیا۔

اسی طرح اس ویران مکان میں اکیلے رہتے ہوئے جب دو مہینے گزر گئے تو میں نے

ں کیا کہ اب کمانڈو مشن شروع کرنے کا وقت آگیا ہے۔ شام کو گل خان آیا میں نے ڑھی ہوئی چھوٹی ڈاڑھی اور سر کے لمبے بالوں کو سر کے اوپر اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔

"گل بھائی! میرا خیال ہے میں پورا سکھ بن گیا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

گل خان نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

"میرے حساب سے تمہیں ابھی دو ہفتے اور انتظار کرنا چاہئے۔"

مزید دو ہفتے بھی گزر گئے۔ اس روز گل خان اپنے ساتھ چھوٹا آئینہ بھی لایا تھا۔ میں آئینے میں اتنے دنوں کے بعد اپنی شکل دیکھی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی نوجوان جوگی مجھے رہا ہے۔ میری مونچھوں کے بال میرے ہونٹوں کے اوپر گر رہے تھے۔ ڈاڑھی بے طریقے سے بڑھ چکی تھی۔ بال بھی جھاڑیوں کی طرح بڑھ گئے تھے۔ گل خان بولا۔

"اب تمہارا حلیہ بالکل سکھوں ایسا ہو گیا ہے۔ ذرا سر پر جوڑا تو باندھو"

میں نے سکھوں کے طرح بالوں کو اوپر کر کے جونڈا بنایا اور اس کے گرد رومال باندھ ب آئینہ دیکھا تو میں بالکل سکھ لگ رہا تھا۔ گل خان سے میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے جب میں نے سکھوں والی پگڑی باندھ لی اور ڈاڑھی کو بھی کانوں کی کھینچ کر باندھا تو پولیس والے مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

گل خان نے کہا۔

"خیال تو یہی ہے لیکن تمہیں اس کے باوجود بے حد احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ سی ی والوں کی نظریں بڑی تیز ہوتی ہیں۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"کل تم میرے لئے وہ لباس لے آنا جو یہاں دلی میں یا اس کے آس پاس سکھ عام پہنتے ہیں"

خاص لباس نہیں ہوتا سکھوں کا۔ بس یہ لوگ عام طور پر تنگ موری کے پاجامے کھلے گریبان کا کرتہ واسکٹ یا گرم کوٹ پہنتے ہیں۔ کمر میں کرپان ہوتی ہے۔ اور وازمات ہوتے ہیں جو سکھ دھرم کا حصہ ہیں۔ مثلاً کڑا، کرپان، کچھا کیس اور کنگھا۔

لیکن دلی میں پڑھے لکھے سکھ زیادہ تر انگریزی سوٹ پہنتے ہیں۔ یہ میں نے خاص طور پر
دیکھا ہے کہ سکھ گرمیوں سردیوں انگریزی سوٹ بڑے شوق سے پہنتے ہیں۔ گرمیوں میں
اگر کوٹ نہیں پہنتے تو قمیض پتلون ہی پہن لیتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ کل میں یہ ساری
چیزیں اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔"

میں نے اسے کہا۔

"مجھے کچھ روپوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسے باقی رہ گئے
ہیں۔ کیا تم اس کا بندوبست کر سکو گے؟"

گل خان بولا۔

"اس کی تم کبھی فکر نہ کرنا۔ جیسا کہ یہ بات تمہارے علم میں ہوگی۔ ہم نے ایک
خفیہ فنڈ قائم کر رکھا ہے دلی کے مسلمان اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں اور پاکستانی بھائیوں
سے صرف محبت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے
ہیں۔ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟"

میں نے پہلے سے حساب لگایا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"ابھی صرف پانچ ہزار روپے کی رقم ہی کافی ہوگی۔ اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں
بتادوں گا۔"

ٹھیک ہے میں کل یہ رقم بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں اسلحہ وغیرہ تو نہیں
چاہئے؟

میں نے کہا۔

"نہیں میرے کمانڈو مشن کے پہلے مرحلے میں مجھے کسی قسم کے اسلحے کی ضرورت
نہیں پڑے گی۔ ہاں جب میں راجستھان کے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں داخل ہونے
کامیاب ہوگیا تو مجھے جس قسم کے اسلحے وغیرہ کی ضرورت ہوگی وہ میں تمہیں کسی ذریعے
سے بتادوں گا یا خود تمہارے پاس آکر بتادوں گا۔"

گل خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اپنا منصوبہ تم اب کل ہی بتاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"انشاء اللہ"

اگلے روز گل خان شام ہونے سے پہلے ہی آگیا اس کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا۔
ہیں میرے لئے کپڑے تھے۔ میں نے اسے خاص طور پر کہا تھا کہ مجھے پڑھے لکھے سکھ
پ دھارنا ہے اس لئے وہ میرے لئے پتلون کوٹ لایا تھا۔ ایک بندھی بندھائی
ں والی پگڑی تھی جو ان دنوں بازار میں نئی نئی بکنے لگی تھی۔ اس پگڑی کی خوبی یہ تھی
ے باندھنا نہیں پڑتا تھا۔ ٹوپی کی طرح پہن لی جاتی تھی۔ میں نے ریہرسل کے طور
سارے کپڑے پہن لئے۔ سر پر پگڑی بھی ٹھیک طرح سے جمالی۔ گلے میں کرپان
۔ ایک کلائی میں لوہے کا کڑا پہن لیا۔ سر کے جوڑے میں کنگھا بھی پھنسا لیا۔ نیچے
دیئر یعنی کچھا بھی پہن لیا۔ ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں کو مروڑیاں بنا کر انہیں اوپر
کر کانوں کے پاس دوسرے بالوں میں پھنسا دیا۔ مونچھوں کے بڑھے ہوئے بالوں کو
نے اسی طرح رہنے دیا۔ بس ہاتھوں سے تھوڑا تھوڑا ایک طرف کر لیا۔ جب میں نے
نے میں اپنی شکل دیکھی تو یقین کریں کہ میں خود اپنے آپ کو نہ پہچان سکا۔ گل خان
طرف گردن ٹیڑھی کر کے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔

"دوست! تم تو سچ مچ بالکل سکھ لگتے ہو۔ پہچانے ہی نہیں جاتے۔ لیکن ایک بات

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

گل خان نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے جو ختنے ہو چکے ہیں اس کا کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اس کا وقت نہیں آنے دوں گا۔"

میں نے سارا لباس اتار دیا اور اپنے کپڑے پہن لئے۔ گل خان تھرمس میں چائے

لایا تھا۔ اس نے مجھے پانچ ہزار روپے بھی جو نوٹوں کی شکل میں تھے دے دیئے تھے جو میں نے بٹوے میں سنبھال کر رکھ لئے تھے۔ چائے کے دوران اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا کمانڈو مشن کب اور کہاں سے شروع ہو گا۔

میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ چائے کا گھونٹ پیا اور پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

"گل خان! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مشن میں تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا

"اچھا؟"

"ہاں" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ "بلکہ تمہیں اپنی ساتھ کسی اور نوجوان کو بھی۔ جانا ہوگا۔ تم دونوں میرے کمانڈو مشن کے پہلے مرحلے میں میری مدد کرو گے تمہارا زیا سے زیادہ دو دن کا کام ہو گا اس کے بعد تم دلی واپس آجاؤ گے۔ آگے سارا کام م ہو گا۔"

"لیکن تمہارا پروگرام کیا ہے"؟

میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں ریواڑی پہنچنے کے بعد بتاؤں گا۔"

کیا ہمیں ریواڑی جانا ہو گا۔"

"ہاں۔ مگر اپنے ساتھ تم جس نوجوان کو لے کر جاؤ گے وہ اپنا آدمی ہونا چاہئے۔"

گل خان کہنے لگا۔

"ظاہر ہے اپنا ہی آدمی ہوگا۔ دوسرے آدمی کا تو یہاں کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

میں نے گل خان کو سمجھا دیا کہ انہیں اس قسم کا حلیہ بنانا ہوگا جس قسم کا حلیہ علاقے کے اوباش قسم کے نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ اور انہیں اپنے ساتھ ایک پستول رکھنا ہوگا جو خالی ہوگا۔ جیسے جیسے میں اپنے منصوبے کو بتاتا جاتا تھا گل خان کی حیرت اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن میں اسے اصل پروگرام ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔

"ہمیں کب ریواڑی کے لئے روانہ ہونا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"پہلے میں اکیلا جاؤں گا۔ وہاں سے میں تمہیں دو لفظی خط لکھوں گا کہ یہاں پلاسٹک ، کاروبار کی کافی گنجائش ہے آپ آجائیں۔ یہ خط ملتے ہی تم دونوں ریواڑی میرے ۓ ہوئے پتے پر پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد میں تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا گا اور میں کیا کرنے والا ہوں۔"

میں نے اپنا ایک سکھ نام بھی سوچ لیا تھا۔ جب اس بارے میں گل خان نے مجھ سے چھا تو میں نے کہا۔

"میں نے اپنا نام جسونت سنگھ سوڈھی رکھا ہے"

میں پہلے بھی یہ بتا چکا ہوں اور اب بھی آپ کو بتاتا چلوں کہ گل خان ہمارا دلی میں رہائی تھا۔ یہ مضبوط جسم والا کمانڈو ٹائپ آدمی تھا۔ پہلوانی بھی کرتا تھا۔ اس نے بھی نگ آباد کے جنگل میں مرد مجاہد سے باقاعدہ کمانڈو ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ کمانڈو ن پر کبھی کبھار ہی کشمیر کے محاذ پر گیا تھا۔ وہ ہائی ایکسپلوسویز کا ماہر تھا اور کیمسٹری میں نے ایم اے کیا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام گل خان نہیں تھا۔ یہ تو میں نے اس کا فرضی رکھا ہوا ہے اور اس کے مکان کا ایڈریس بھی اسی لئے نہیں لکھا کہ انڈیا کی حکومت ، پکڑ نہ لے۔ وہ کسی دوسرے ملک کا جاسوس نہیں تھا۔ وہ انڈیا کا باشندہ تھا۔ انڈیا کا ں تھا۔ مسلمان ہونے کے ناطے وہ بھارت میں مسلمانوں کے جائز حقوق کے حصول کے ، اور کشمیر میں مظلوم کشمیری کفار کے ظلم و ستم کے خلاف جو جنگ لڑ رہے تھے ان کی ادی اور حق خود اختیاری کا حامی تھا۔ پاکستان سے اسے اس لئے زبردست محبت تھی کہ ان اسلامی ملک ہے اور پاکستان میں اس کے دینی بھائی رہتے ہیں اور بھارت کی ت پاکستان کو نقصان پہنچائے یہ گل خان بھی دوسرے بھارتی مسلمانوں کی طرح ہرگز ار کھ سکتا تھا۔

میں نے اسی رات گل خان سے سارے معاملات طے کر لئے اور کہا کہ وہ یہ معلوم کے لائے کہ دلی سے ریواڑی جانے والی گاڑی کس وقت چلتی ہے۔ گل خان رات کو

جلدی چلا گیا۔

دوسرے روز وہ رات کو آیا۔ وہ ساری معلومات لے کر آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"دلی سے ریواڑی کی جانب دن میں تین چار گاڑیاں جاتی ہیں۔ جن میں پسنجر ٹرینیں بھی ہیں اور ایکسپریس ٹرینیں بھی ہیں۔ ریواڑی دلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ دلی سے جے پور جانے والی لائن پر ہے۔ دلی سے آگے اس لائن پر گوڑ گاؤں بڑا سٹیشن آتا ہے۔ اس کے بعد فرخ نگر آتا ہے۔ پھر پٹانڈی اور اس کے بعد ریواڑی آجاتا ہے۔ ایکسپریس ٹرین پر یہ ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر ہے۔"

میں نے گل خان سے پوچھا کہ صبح صبح کونسی گاڑی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی دلی سے جے پور کے لئے تیار ہو کر صبح اذانوں کے وقت چلتی ہے۔ یہ گاڑی میرے لئے بڑی مناسب تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں منہ اندھیرے دلی کے سٹیشن سے نکل جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے دوسرے دن منہ اندھیرے یہ گاڑی پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ گل خان نے کہا۔

"میں آج کی رات تمہارے پاس ہی رہوں گا۔"

وہ رات کو میرے پاس اسی ویران سے کمرے میں رہا۔ رات ہم جلدی سو گئے۔ پو پھٹنے کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ گل خان کو جگایا مجھے کوئی نقلی ڈاڑھی مونچھ تو لگانی نہیں تھی۔ میری سکھوں والی ڈاڑھی مونچھ پہلے ہی سے تیار تھی۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ اور پتلون قمیض پہن کر سر پر سکھوں والی پگڑی بالوں کا جوڑا بنانے کے بعد اچھی طرح سے جمالی۔ پگڑی نے میرے دونوں کان ڈھانپ دیئے تھے۔ گل خان نے اپنی کلائی کی گھڑی دے دی۔ کرنسی نوٹ والا بٹوہ میں نے کوٹ کی بجائے پتلون کی جیب میں رکھ لیا جو بٹن لگانے سے بند ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی جیب کاٹنی اتنی آسان نہیں ہوتی۔ گل خان نے مجھے بتایا کہ راجستھان میں دن کے وقت کل گلابی موسم رہتا ہے مگر رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ مجھے چندریکا کے سلسلے میں اس کا تجربہ تھا۔

"اس لئے میں نے تمہارے لئے زیادہ گرم کپڑے کی پتلون اور کوٹ نہیں خریدا۔"

میرے پاس چیونگ گم ٹیبلٹ کی شکل میں جو چھ ٹائم بم تھے وہ میں نے پہلے سوچا کہ گل خان کو دے دوں پھر کچھ سوچ کر ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ ہم نے نظام الدین اولیاء کے مزار شریف کے چوک میں آکر ایک موٹر رکشا لیا اور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ سڑک کی بتیاں ابھی روشن تھیں۔ سٹیشن پر پہنچے تو جے پور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر لگ چکی تھی۔ ڈبوں میں مسافر سوار تھے۔ کافی رش تھا۔ ہم نے وہیں پلیٹ فارم پر ٹی سٹال کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گل خان نے کھڑکی کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔

"محتاط رہنا۔ مجھے تمہاری طرف سے اس وقت تک فکر رہے گی جب تک تمہارا خط نہیں ملتا۔"

میں نے آہستہ سے ہاتھ نکال کر گل خان سے مصافحہ کیا اور کہا۔

"گل بھائی! اب میں جانوں اور میرا کام تم جاؤ"

گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ گل خان چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد گاڑی جے پور کی طرف روانہ ہو گئی۔

جس وقت میں ریواڑی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ریواڑی کا سٹیشن ایسا ہی تھا جیسے چھوٹے شہروں کے سٹیشن ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے میں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ وہاں پولیس کے سپاہی کتنے ہیں اور کہاں کہاں پر ہیں۔ وہاں تین سپاہی تھے اور یہ ریلوے پولیس کے سپاہی تھے۔ میں ان کے پاس سے ہو کر گزر گیا۔ کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ وہاں کئی دوسرے سکھ مسافر بھی ٹرین سے اترے تھے۔ میں بھی ایک سکھ نوجوان کے حلیے میں تھا۔ سٹیشن کے باہر کئی رکشے اور تانگے کھڑے تھے۔ دور ایک پرانی سی ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی ڈرائیور مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر بیڑی پھینک کر جلدی سے گاڑی سے نکل آیا۔ "آیئے سردار جی! کدھر چلنا ہے بیٹھئے میں پہنچائے دیتا ہوں۔"

اس نے ماتھے پر لال تلک لگا رکھا تھا۔ ریواڑی میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ سٹیشن کے باہر مجھے سامنے دو تین مندروں کے عکس نظر آئے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے سکھوں والے پنجابی لہجے میں کہا۔

"چل یار"

اس نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

"سردار جی کس طرف چلیں؟"

میں نے کہا۔

"بادشاہو تمہارے شہر کی سیل کرنے آئے ہیں کسی ہوٹل ووٹل میں لے چلو۔ جہاں کوئی مال پانی بھی مل جائے اور رات بھی کٹ جائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نوجوان لڑکا تھا۔ میری طرف اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"بادشاہو فکر ہی نہ کرو"

ٹیکسی ریواڑی کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں سے گزرنے کے بعد ایک کشادہ سڑک پر آگئی۔ اس کی ایک جانب سبزیوں ترکاریوں کے کھیت تھے۔ دوسری جانب آبادی تھی۔ دن کے وقت سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھی۔ ہندو لوگ دھوتیاں باندھے گزر رہے تھے۔ موٹر گاڑی ایک بھی ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ ٹیکسی آبادی کی ایک کشادہ سڑک کی طرف گھومی تو مجھے کسی مندر میں بجتی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔

ٹیکسی ایک درمیانے درجے کی دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ جس کی پیشانی پر ہندی زبان میں رام جی ویشنو ہوٹل کا بورڈ لگا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے میں ہندی اور گجراتی زبانیں پڑھ بھی لیتا تھا اور گجراتی زبان تو تھوڑی بول بھی لیتا تھا۔ مجھے احمد آباد میں رہ کر اس کا کافی محاورہ ہو گیا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"اوئے یہ تو ویشنو ہوٹل ہے یہاں کیا مال پانی ملے گا۔ یہاں تو گوشت کی ایک بو بھی نہیں ملے گی۔"

ڈرائیور نے گھوم کر میری طرف پچھلی سیٹ پر دیکھا اور آنکھ مار کر کہا۔

"سردار جی! بس یہ صرف نام کا ہی ویشنو ہوٹل ہے۔ یہاں سب کچھ ملتا ہے۔ آیئے رے ساتھ اس کا منیجر میرا واقف ہے"

میں یہ ساری حرکتیں اور اپنے آپ کو اوباش قسم کا سکھ ظاہر کرنے کا ڈرامہ جان ھ کر کھیل رہا تھا۔ یہ میرے کمانڈو مشن کا بڑا اہم مرحلہ تھا۔ وہ مجھے ہوٹل کے منیجر کے ں لے گیا جو ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ سر پر گاندھی کیپ بلکہ کانگریسی ٹوپی ائی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے کاؤنٹر پر ایک طرف لوبان سلگ رہا تھا۔ ماتھے پر ویشنو کا تلک تھا۔ پیچھے کرشن کی تصویر لٹک رہی تھی۔ ہمیں آتا دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ھ باندھ کر نمسکار کہا۔ ڈرائیور نے بھی نمسکار کیا اور کہا۔

"گوپال جی! ہمارے سردار جی دلی سے ریواڑی کی سیر کرنے آئے ہیں۔ کچھ دن آپ ے ہوٹل میں رہیں گے۔"

گوپال اس ہوٹل کے منیجر یا مالک کا نام تھا جو میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے میری رف دیکھا اور بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔

"سردار جی! آپ کو ہمارے ہوٹل میں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ آپ کا سامان کہاں ہے؟"

میں نے اپنا سکھوں والا پنجابی میں اردو بولنے کا لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے اپنا کوئی سامان نہیں ہے۔ ہم ادھر مکان بنانے نہیں آیا۔ سیر کے واسطے آیا ہے۔ یہاں ایک گردوارہ ہے اس کے بھی درشن کرنے ہیں۔ بتاؤ کوئی اچھا سا کمرہ خالی ہے۔ غسل خانہ ساتھ ہونا چاہیے۔"

وہ ہمیں ہوٹل کی پہلی منزل میں ہی پیچھے کی جانب واقع ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بس غنیمت تھا۔ مجھے کمرے کی اچھائی برائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مجھے تو وہاں کچھ ن گزارنے تھے۔ میں نے یونہی کمرے کے نقص نکالنے شروع کر دیئے۔ ہوٹل کا منیجر ھبرا سا گیا۔ اور کہنے لگا۔

"سردار جی! آپ جو کہیں گے ہم یہاں لا کر رکھ دیں گے۔ میں نیا پلنگ ابھی بچھوائے دیتا ہوں۔ بھگوان کی دیا سے آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

بیس روپے کمرے کا چوبیس گھنٹے کا کرایہ تھا۔ میں نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر منیجر کے حوالے کیا۔

"ابھی یہ رکھو زیادہ دیر ٹھہرنا ہوا تو اور پیسے دے دوں گا۔ کیوں اوئے؟ اب تو خوش ہو ناں؟"

منیجر نوٹ لے کر خوش ہوا۔ کاؤنٹر پر آکر میں نے رجسٹر میں اپنا نام جسونت سنگھ سوڈھی لکھوایا اور دلی کا غلط سلط پتہ لکھوا دیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی پچاس روپے دیئے تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگا۔

"سردار جی! مجھے حکم کریں میں کب یہاں آؤں آپ گردوارے کس وقت جائیں گے۔ میں سارے شہر کی آپ کو سیر کراؤں گا۔"

میں نے کہا۔

"ایک گھنٹے بعد آجانا۔ ابھی میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ اب جاؤ۔"

ٹیکسی ڈرائیور خوش خوش چلا گیا۔ میں کمرے میں آگیا۔ میرے پاس ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا۔ جس میں میری دو تین قمیضیں، دو بنیانیں اور کنگھی ٹوتھ برش صابن تولیہ وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ دوسری طرف کھیت تھے۔ کھیتوں میں دور ایک ٹریکٹر چل رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ٹیکسی ڈرائیور آگیا۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا۔ اسے مزید پچاس روپے دیئے اور اوباش آدمی کا کردار ادا کرتے ہوئے سکھوں کے لہجے میں کہا۔

"دیکھ اوئے۔ مجھے کوئی گھٹیا قسم کا تماش بین نہ سمجھنا۔ دلی کانپور کی اونچی سے اونچی گانے والیاں میری دوست ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ ریواڑی میں کوئی اونچے درجے کی گانے والی بھی ہے؟ اگر ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں واپس دلی جاتا ہوں۔"

ڈرائیور نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"سردار جی مہاراج! میں تو آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ بڑے اونچے درجے ے کھلاڑی ہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ ایسا ہیرا دکھاؤں گا کہ دلی کانپور میں بھی نہ دیکھا گا۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

ڈرائیور بولا۔

"مہاراج! ویسے تو ریواڑی میں گانے والیوں کا کوئی بازار نہیں ہے۔ لیکن یہ عورتیں پنے اپنے گھروں میں ناچ گانے کا دھندا کرتی ہیں سرکار کو معلوم ہے۔ مگر سرکار نے ان کو ندا کرنے کا لائسنس دے رکھا ہے۔"

میں نے اسے پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"اوئے اصل بات بیان کر۔ کون ہے اونچی درجے کی گانے بجانے والی جس کا تو بھان کر رہا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ پھر جلدی سے جیب میں رکھ لی۔ جانتا تھا کہ سکھ تمباکو نہیں پیتے اور میرے سامنے اسے سگریٹ کا پیکٹ نہیں نکالنا ہئے تھا۔ کہنے لگا۔

"سردار جی مہاراج! ایک بڑی خاندانی عورت ہے۔ رات کو دو گھنٹے دھندا کرتی ہے بھی صرف ناچ گانا۔ اور کچھ نہیں۔ خوبصورت بھی بہت ہے۔ ایرے غیرے کو اپنے گھر ں داخل ہی نہیں ہونے دیتی۔"

میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"اوئے اس کا نام بھی لو"

"اس کا نام درگاوتی ہے مہاراج"

یہی میرا ٹارگٹ تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"اس کا مکان کہاں ہے؟"

وہ بولا۔

"مہاراج! میں لے چلوں گا آپ کو۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ ابھی چلو۔"

وہ میری بے تابی دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج درگاوتی دن کے وقت نہ تو ناچ گانا کرتی ہے نہ کسی سے ملتی ہے۔ رات کو آپ کو لے چلوں گا۔ آج کیا دن ہے؟"

میں نے کہا۔

"آج منگل وار ہے۔ کیوں۔ تم نے دن کیوں پوچھا۔"

وہ کہنے لگا۔

"مہاراج! اس لئے پوچھا ہے کہ درگاوتی ہفتے کی رات کو کسی سے نہیں ملتی۔"

"کیوں اوئے؟ ہفتے کو اسے کوئی بیماری لگ جاتی ہے؟ ہفتے کو وہ کیوں نہیں ملتی؟"

ٹیکسی ڈرائیور رازداری سے کہنے لگا۔

"مہاراج! ہفتے کی رات کو درگاوتی کا یار اس سے ملنے آتا ہے۔ ساری رات رہتا ہے اگلا سارا دن رہتا ہے اور شام کو چلا جاتا ہے۔"

ڈرائیور کی باتوں سے میری معلومات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"یہ اس کا یار کون ہے اوئے؟ میں اس کو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا"

ڈرائیور نے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

"نہیں نہیں مہاراج! وہ کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہے۔ بہت بڑا افسر ہے۔ سنا ہے راج گڑھ سے آتا ہے۔ وہ بھی آپ کی طرح سردار جی ہے"

ٹیکسی ڈرائیور ہنسنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر مروڑا اور گالی دے کر کہا۔

"اوئے ہنستا کیوں ہے؟"

ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور لہجے

پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار میں ہفتے کی رات کو درگاوتی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مگر آج تو ہفتہ ہے۔ ہم آج رات درگابائی کے کوٹھے پر گانا سننے چلیں گے۔"

"جو حکم مہاراج! میں کتنے بجے آجاؤں؟"

"نو دس بجے آجانا"

"یہ ٹائم بالکل ٹھیک رہے گا مہاراج"

اور ٹیکسی ڈرائیور مجھے پرنام کر کے چلا گیا۔

رات کو وہ مجھے درگا وتی طوائف یا نیم طوائف کے پاس لے گیا۔ درگا وتی کا مکان آبادی سے باہر الگ تھلگ جگہ پر واقع تھا۔ وہاں املی اور نیم کے بڑے درخت تھے۔ مکان کیا تھا ایک پرانی خستہ حال ایک منزلہ کوٹھی تھی جس کی بیرونی دیواریں بارش اور دھوپ کی وجہ سے کالی ہو رہی تھیں۔ صحن میں گھاس اگ رہی تھی۔ کوٹھی کی چار دیواری کی حالت بھی بڑی شکستہ تھی۔ برآمدہ کے ستون پھولدار بیلوں میں چھپ گئے تھے۔ برآمدے کے آگے ایک چوکیدار سٹول پر ڈنڈا گھٹنوں پر رکھے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ وہ میرے ٹیکسی ڈرائیور کو جانتا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کہا۔

"رامو بھائی! سردار جی دلی کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ درگا بائی سے ملنے آئے ہیں۔ ذرا اندر خبر کر دو۔"

برآمدے کے آگے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ایک بلب برآمدے کے باہر جل رہا تھا جس کی روشنی سارے صحن اور درختوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ چوکیدار بولا۔

"بائی جی کے پاس آدمی بیٹھے ہیں۔ پھر کسی وقت آنا۔"

میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر چوکیدار کو دیا اور کہا۔

"یار تو کیوں ناراض ہوتا ہے۔ درگا بائی سے کہو ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے۔"

چوکیدار نے سو روپے کا نوٹ صدری کی جیب میں ٹھونسا اور تیز تیز قدم اٹھا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر سے طبلے گھنگھروؤں کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈرائیور ہنس کر بولا۔

"مہاراج آپ نے بڑا اچھا کیا۔ مگر سو روپے دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دس پندرہ ...ہی یہ راضی ہو جاتا۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے یار! ٹھیک ہے۔"

چوکیدار نے اندر جا کر درگا بائی کے آگے نہ جانے میری کتنی تعریف کی ہوگی کہ ...ے رئیس سردار جی ہیں۔ دلی سے خاص طور پر ملنے آئے ہیں۔ باہر آیا تو مسکرا رہا تھا۔ ...لگا۔

"بائی جی تو راضی نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا ہے۔ ...یے میرے ساتھ۔"

ٹیکسی ڈرائیور میرے ساتھ چلنے لگا تو میں نے اسے وہیں روک دیا۔

"تمہارے جانے کی ضرورت نہیں۔ تم یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔"

ٹیکسی ڈرائیور مایوس سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں چوکیدار کے ساتھ ایک کمرے میں ...گزر کر دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس آ گیا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ...یدار نے مجھے وہیں رکنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔ ایک منٹ بعد واپس آیا۔

"آئیے سردار جی!"

اس نے دروازہ کھولا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے مجھے حنا کے عطر کی خوشبو آئی۔ کمرے میں چھت کے ساتھ ایک فانوس روشن تھا۔ قالین بچھا ہوا تھا۔ ...ر کے ساتھ صوفے لگے تھے۔ یہ کسی طوائف کا کمرہ نہیں لگتا تھا۔ صوفے پر ٹیبل ...پ کے پاس ایک بیس بائیس سال کی جوان عورت ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنے ...بنی سنوری بیٹھی تھی۔ اس نے سونے کے مختصر سے زیور پہن رکھے تھے۔ رنگ کھلتا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندیا لگی تھی۔ بہت خوبصورت نہیں تھی مگر نین نقش بڑے دلکش ...مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا سا مسکرا کر مجھے پرنام کیا اور بڑی صاف اردو ...میں بولی۔

"مہاراج شما کر دیجئے گا۔ آج اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ویسے بھی بہت کم لوگوں سے ملتی ہوں۔ بیٹھئے آپ کیا پئیں گے؟"

میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور سکھوں کی طرح اپنی ڈاڑھی پر دو تین بار ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"درگاوتی جی! آپ کے بارے میں بالکل ٹھیک سنا تھا۔ آپ تو واقعی بہت خوبصورت ہیں اور آپ کا اخلاق بھی بہت اچھا ہے۔ ورنہ آپ ملنے سے انکار بھی کر سکتی تھیں۔ میں بھی آپ کا گانا سننے نہیں آیا۔ بس آپ کے درشن کرنے دلی سے ریواڑی آیا ہوں۔ آپ کی اتنی تعریف سنی کہ من آپ کے درشنوں کو مچلنے لگا۔"

چوکیدار دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ درگاوتی اپنی تعریف سے خوش ہوئی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ کے قریب تپائی پر ایک جانب لگا ہوا بٹن دبایا۔ مجھے کوٹھی کے کسی کمرے سے آتی گھنٹی کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ درگاوتی کہنے لگی۔

"سردار جی مہاراج! وہ لوگ خود اچھے لوگ ہیں جو میری تعریف کرتے ہیں۔ ورنہ میں تو سیدھی سادی سی عورت ہوں۔"

ایک نوجوان خادمہ اندر آئی۔ اس نے جھک کر مجھے پرنام لیا درگاوتی نے اسے چائے لانے کو کہا۔ کیونکہ کمرے میں تھوڑی تھوڑی ٹھنڈ تھی۔ اگرچہ ریواڑی میں سردیوں کا موسم اتنا شدید نہیں تھا۔ جتنا دلی میں تھا۔ میں نے درگاوتی کو بتایا کہ میرا جالندھر کے زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔ دلی میں ہماری دو کوٹھیاں ہیں۔ نیوکلر فزکس میں بی۔ایس۔سی کیا ہوا ہے۔ (یہ نیوکلر فزکس میں بی۔ایس۔سی کرنے والی بات میں نے ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کہی تھی)۔ درگاوتی میری باتیں کچھ توجہ اور زیادہ بے نیازی سے سنتی رہی۔ لگتا تھا کہ وہ مجبوراً وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ خادمہ ٹرے میں چائے اور مٹھائیاں لے کر آ گئی۔ درگاوتی نے خاص پیشہ ورانہ انداز میں چائے بنا کر مجھے پیش کی۔

میں نے جیب سے سو سو روپے کے دس نوٹ نکال کر درگاوتی کو پیش کئے۔

"درگا جی! میری طرف سے یہ چھوٹی سی شردھانجلی سویکار کریں۔"

میں نے دیکھا کہ درگاوتی کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا تھا۔ پہلے جو اس پر بیزاری کی ایک کیفیت طاری تھی وہ بالکل غائب ہو گئی تھی۔ اس نے نوٹ لیتے ہوئے بڑی پیشہ ورانہ ادا سے کہا۔

"مہاراج اس کی کیا ضرورت تھی۔ آج تو میرے سازندے بھی یہاں نہیں ہیں۔ آپ کو گانا بھی ڈھنگ سے نہ سنا سکوں گی۔"

میں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"درگا جی! ہم صرف آپ کا گانا سننے تھوڑے آئے ہیں۔ ہم تو آپ کے صرف درشن چاہتے تھے۔ گانا پھر سن لیں گے۔ ایسی جلدی کیا ہے۔"

میں سکھوں کی طرح کبھی اپنے آپ کو میں کہتا اور کبھی اس علاقے کے رواج کے مطابق ہم کہنے لگتا۔ کمرے میں طوائفوں والا ماحول نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ گانے بجانے والا کوئی دوسرا تھا۔ وہاں مجھے سوائے نوکرانی کے کوئی دوسری عورت یا مرد نظر نہیں آیا درگاوتی اب بڑی دلچسپی کے ساتھ میری باتیں سن رہی تھی اور خود بھی مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگی تھی۔

ہزار روپے نے بڑا کام دکھایا تھا۔ طوائفوں کے تالے صرف روپے کی چابی سے کھلتے ہیں۔ درگاوتی بھی ایک طوائف تھی۔ اگرچہ بھارت کے بڑے شہروں کی طوائفوں کے مقابلے میں اس کا سبھاؤ گھریلو عورتوں ایسا تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں اٹھ کر چلنے لگا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"کھانا کھا کر جائیے گا مہاراج۔"

میں نے درگاوتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا دبایا اور کہا۔

"سوہنیو! کل پھر آئیں گے۔"

درگاوتی شرما گئی۔ بولی۔

"کل ضرور آئیے گا میں انتظار کروں گی۔"

وہ دوسرے کمرے کے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔ میرا ڈرائیور برآمدے کے

باہر چوکیدار کے پاس سٹول پر اس کے ساتھ ہی ٹک کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلد
سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹیکسی میرے ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔ ڈرائیور بڑا خوش تھا۔ کیونکہ میں ن
درگاوتی کی بڑی تعریف کی تھی۔ میں ہوٹل کے باہر ٹیکسی سے اترا تو ڈرائیور بولا۔

"مہاراج! کل کس وقت آؤں؟"

اب مجھے اس شخص کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اس سے جو کام لینا تھا۔ میں لے
تھا۔ میں نے کہا۔

"کل آنے کی ضرورت نہیں۔ تم پرسوں آجانا کل میں آرام کروں گا۔"

دوسری رات میں اکیلا ہی سائیکل رکشے میں بیٹھ کر درگاوتی کے گھر پہنچ گیا۔ اس
میری بڑی آؤ بھگت کی۔ دوتین آدمی پہلے سے وہاں بیٹھے تھے۔ میرے آنے پر درگا
نے انہیں رخصت کر دیا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ چھوٹا تھا۔ قالین
چاندنی بچھی تھی گاؤ تکئے لگے تھے۔ اگالدان پڑے تھے۔ ایک سارنگی والا اور ایک طبلے
بیٹھا تھا۔ پورا طوائفوں والا ماحول تھا۔ میں گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نوکرانی ا
ٹرے میں شراب کی بوتل اور دو گلاس لے کر آگئی۔ میں نے درگاوتی سے کہا۔ "درگا
میں شراب نہیں پیتا۔ چائے منگوالیں۔ چائے ضرور پیوں گا۔"

وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

"تعجب ہے۔ آپ شراب نہیں پیتے۔ کوئی بات نہیں۔ میں بھی نہیں پیوں گی۔
میں بھی آپ کے ساتھ چائے پیوں گی۔"

چائے کے ساتھ بسکٹ اور مٹھائیاں بھی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے درگاوتی ہا
سامنے رکھ کر اسے طبلے اور سارنگی کے ساتھ ملاتی رہی۔ پھر اس نے ایک غزل چھیڑ
اس کی آواز عام طوائفوں ایسی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں اسے سو سو رو
ویلیں دیتا رہا۔ سازندے بھی حیران ہو رہے تھے۔ کیونکہ سو سو روپے کی ویل امیر
تماش بین بھی کم ہی دیتا ہے۔ میں نے سو روپے کی ایک ویل سازندوں کو بھی دے د

ں رات میں نے درگاوتی کے گانے پر دو ہزار روپے لٹا دیئے۔ مگر یہ روپے میری
ری تھی۔ میں اپنے کمانڈو پراجیکٹ کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔ رات ایک بجے
یں درگاوتی کے گھر سے واپس ہوٹل میں آیا۔ چار دنوں میں میں نے درگاوتی پر
، خرچ کر دیئے کہ وہ مجھ سے بے حد متاثر ہوئی اور میرا دم بھرنے لگی۔ اب ہفتے
لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہفتے کی شام کو رام گڑھ راجستھان کے خفیہ نیوکلر پلانٹ یا
ں ایکٹر کا ڈائریکٹر سردار ارجن سنگھ سوڈھی آنے والا ہے۔ میں جمعے کی رات کو
کے گھر سے جدا ہونے لگا تو میں نے اسے کہا۔

رگا جی! اب کل آپ کے پھر درشن ہوں گے۔"

گاوتی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بڑے عجز کے ساتھ بولی۔

سونت جی!"

ب ہماری آپس میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ طوائفوں کے ہاں روپے کے ہاتھ
ے ہوتے ہیں۔ وہاں روپیہ درمیان کے سارے حجابات اٹھا دیتا ہے اور مہینوں کی
چند گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب وہ مجھے کبھی مہاراج اور کبھی سردار
بت کے موڈ میں ہوتی تو جسونت جی کہہ کر پکارنے لگتی تھی۔ اس نے کہا۔

جسونت جی! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کل میرے ایک مہربان اور
لنے والے آرہے ہیں۔ کل میں آپ سے نہیں مل سکوں گی۔ مجھے شما کر دیجئے

ں نے اس سے مزید بالکل نہ پوچھا کہ اس کا یہ مہربان اور پرانا دوست کون ہے۔
پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھے تو معلوم تھا کہ سردار ارجن سنگھ سوڈھی
لا رہے ہیں۔ میں نے درگاوتی کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار سے اس کے بالوں کو
ہوئے کہا۔

ئی بات نہیں درگا جی! میں کل دلی کا ایک چکر لگا لوں گا۔ کچھ روپے بھی تو لانے
ے"

وہ ہنس دی۔ میں نے بھی تھوڑا ہنس کر اس کے رخسار کو پیار کیا اور دو ایک روز بعد
آنے کا کہہ کر واپس اپنے ہوٹل میں آگیا۔ میں نے اسی وقت صبح دلی جانے کا پروگرام
طے کر لیا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میرے پاس پیسے تقریباً ختم ہو گئے تھے اور ابھی
درگاوتی پراجیکٹ پر تھوڑی سی مزید سرمایہ کاری کی ضرورت تھی۔ دوسرے میں نے
درگاوتی سے جو یہ کہہ دیا تھا کہ میں نے نیوکلر فزکس میں بی اے کیا ہوا ہے تو اس کا مجھے
ایک جعلی سرٹیفکیٹ بھی بنوانا تھا۔ کیونکہ آگے چل کر اس سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑنے
والی تھی۔

میں صبح صبح ایک بس میں بیٹھ کر دلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ دلی وہاں سے زیادہ دور
نہیں تھا اور ریواڑی سے بسیں چلتی ہی رہتی تھیں۔ دلی پہنچ کر میں نے گل خان کو اس
کے خاص نمبر پر ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ میں آگیا ہوں۔ اور اس کے نظام الدین اولیاءؒ والی
آبادی کے مکان پر جا رہا ہوں۔ گل خان نے کہا۔

"میں رات کو ہی آسکوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر پروفیسر جمشید کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ ایک خاص معاملے میں ان کا مشورہ
ضروری ہے۔"

گل خان نے کہا کہ وہ پروفیسر کو لیتا آئے گا۔ میں نے اسے فون بھی مزار شریف
والے مین گیٹ سے تھوڑی دور جو پبلک ٹیلی فون بوتھ تھا وہیں سے کیا تھا۔ وہاں سے
مغل شہزادے کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچایا اور یہ سوچتا ہوا
خان کے پرانے مکان کی طرف چل پڑا کہ مغل شہزادے کی روح نے مجھ پر نازل ہونے
والی جس آفت کا ذکر کیا ہے خدا جانے وہ کب اچانک نازل ہو جائے۔

بہرحال اس بارے میں مجھے ایک الگ پریشانی سی ضرور لگ گئی تھی۔ کیونکہ
یقین تھا کہ نیک روحیں اگر آکر کوئی بشارت دیں تو وہ غلط بشارت نہیں ہوتی۔ مکان
تھا۔ اس کی چابی ہم نے ایک خاص جگہ چھپائی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں سے چابی نکال

زہ کھولا اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ اب مجھے وہاں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنا
انتظار کرنے کی مجھے عادت تھی۔ بلکہ یہ بات میری کمانڈو ٹریننگ میں شامل تھی۔ میں
ریواڑی کے بس اڈے سے کر کے چلا تھا۔ دوپہر کے وقت باہر جا کر ایک ہوٹل سے
کھایا۔ میں چونکہ اپنے اصلی حلیے میں نہیں تھا بلکہ سکھ نوجوان کے بھیس میں تھا
لئے مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمرے میں
لیٹ گیا۔ مجھے نیند آگئی۔ کوئی چار پانچ بجے میری آنکھ کھلی۔ سردیوں کے دن چھوٹے
ے ہیں۔ جلدی شام پڑ گئی پھر رات ہوگئی۔ میں کمرے کے کونے میں موم بتی جلا کر بیٹھ
کھڑکی کا صرف ایک پٹ میں نے تھوڑا سا کھول رکھا تھا تا کہ باہر کے حالات سے باخبر
سکوں۔

رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی کہ گل خان اور پروفیسر جمشید بھی آگئے۔ گل خان
ے لئے کھانا ساتھ لایا تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے انہیں سارے واقعات بیان کر
۔ اس وقت میں نے انہیں اپنے منصوبے کی پوری تفصیل بیان کر دی۔ لیکن میں یہ
ل ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ خود پڑھ لیں گے کہ میں نے راجستھان رام گڑھ
زیر زمین بھارتی ایٹمی ری ایکٹر میں داخل ہونے کا کیا منصوبہ بنایا تھا۔
میں نے پروفیسر جمشید سے کہا کہ مجھے جسونت سنگھ سوڈھی کے نام کا ایک سرٹیفکیٹ
ئے جس میں یہ درج ہو کہ میں نے نیوکلر فزکس میں بی۔ ایس۔ سی کیا ہے۔ وہ اور گل
آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہ سرٹیفکیٹ تمہیں کب تک چاہئے؟"

میں نے اندازہ لگا کر اسے بتایا کہ مجھے ہفتہ دس دن کے بعد یہ سرٹیفکیٹ ضرور مل
ہئے۔ گل خان بولا۔

"فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میرے کمانڈو مشن کا منصوبہ بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہا
پھر گل خان سے کہا۔

”جس روز میں تمہیں خط لکھوں اس کے دوسرے دن تم خود اور اپنے ساتھی کو
لے کر ریواڑی میرے ہوٹل میں پہنچ جانا۔ لیکن ہوٹل میں رات کے وقت آنا“
میں نے اسے ہوٹل کا ایڈریس اور کمرہ نمبر لکھوا دیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔
”میں نے اس کا پورا انتظام کرلیا ہوا ہے۔ تمہارا خط ملتے ہی ہم دلی سے ریواڑی
چل پڑیں گے۔“
پروفیسر جمشید نے پہلے تو مجھے سکھ کے حلیے میں دیکھ کر پہچانا ہی نہیں تھا۔ پھر پہچان
لیا اور ہنس کر بولا۔
”سردار جی! تم تو پورے سکھ بن گئے ہو“
میں نے دلی پولیس کے بارے میں پوچھا کہ میرے بارے میں پولیس کی سرگرمیاں
کس مقام تک پہنچی ہیں۔ گل خان اپنے سراغ رساں کے ذریعے اس کے متعلق پوری
پوری خبر رکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔
”تازہ اطلاع کے مطابق تمہاری تصویر لکھنؤ کانپور اور پنجاب پولیس کو بھی دے دی
گئی ہے۔ خفیہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ مگران کا خیال ہے کہ تم پاکستان واپس
چکے ہو“
میں نے کہا۔
”بس کچھ عرصے تک انہیں اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنا چاہئے۔ جب تک ہمارا ا
گڑھ ایٹمی ری ایکٹر والا مشن مکمل نہیں ہوتا میں چاہتا ہوں کہ پولیس میرے بارے
بالکل لاعلم رہے۔“
گل خان اور پروفیسر جمشید دوسرے دن شام کو آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ دوسرا
بھی میں نے کچھ وقت کمرے میں سو کر اور کچھ باہر ٹہلتے ہوئے گزار دیا۔ شام کو میر
دونوں ماسٹر سپائی آگئے۔ گل خان کو میں نے مزید کچھ روپوں کے لئے کہا تھا۔ وہ یہ رد
بھی لے کر آیا تھا۔ شروع رات ہم نے مل کر کھانا کھایا اور میں ریواڑی جانے کے
وہاں سے بس سٹینڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کیونکہ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا اور د

ہفتے کا دن بلکہ ہفتے کی رات گزر چکی تھی جو رات ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن
سوڈھی نے درگا دتی کے ہاں گزارنی تھی۔ میں اتوار کے روز ہی ریواڑی پہنچ گیا۔
ل کے منیجر نے بتایا کہ اس دوران میرا ٹیکسی ڈرائیور دو تین بار آکر میرا پوچھ گیا تھا۔
ا دوپہر میں نے ہوٹل کے کمرے میں گزار دی۔ شام کو اٹھا نہا دھو کر کپڑے بدلے
سکھوں والی جو بڑی پگڑی رکھی ہوئی تھی اس سے مجھے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ اگرچہ
اکوئی بوجھ نہیں تھا مگر مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے میرا سر جکڑ دیا ہے۔ شام
را ٹیکسی ڈرائیور آگیا۔ میں نے سوچا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے گالیاں وغیرہ دے کر
سے الگ کر دینا چاہئے۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ میں نے اسے
ے میں بلا لیا۔
کہنے لگا۔
”مہاراج آپ دلی کیوں چلے گئے تھے؟ میں تو پریشان ہوگیا کہ بھگوان خیر کرے“
میں نے اسے غصے میں آکر کہا۔
”کیوں اوئے کھوتے دیا پترا۔ میں دلی کیوں نہیں جاسکتا۔ اور تم پریشان کیوں ہو گئے
میں تمہارے پیسے مار کر چلا گیا تھا؟“
ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے اور عاجزی سے بولا۔
”مہاراج جی! میں آپ کا نوکر جو ہوا نوکروں کو اپنے مالک کی چنتا تو رہتی ہی ہے“
آدمی بڑا چالاک تھا۔ میں نے اسے بیس روپے دیئے اور کہا۔
”چل مجھے گردوارے لے چل۔ ماتھا ٹیکنا اے“
ٹیکسی ریواڑی کے گردوارے کی طرف جارہی تھی۔ وہ مجھ سے درگا دتی کے بارے
پوچھنے لگا۔ میں نے قدرے بے تعلقی سے کہا۔
”اچھی عورت ہے۔ بس دو ایک بار گیا ہوں“
اج! حکم کرو۔ میں کوئی نئی چیز دکھا دیتا ہوں۔“
ں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"بکواس نہ کراوئے جنگلی آدمی"

وہ چپ ہو گیا۔ گردوارہ آگیا۔ میں نے اندر جا کر گرو گرنتھ صاحب کے آگے ماتھا ٹیکا۔ پرشاد لیا۔ گربانی کا پاٹھ کیا اور واپس ہوا۔ اس دوران میں چاروں طرف ماحول کا جائزہ لیتا رہا اور محتاط رہا۔ گردوارے سے باہر نکل کر ٹیکسی کی طرف بڑھا تو وہاں دو پولیس کے سپاہی نظر آئے۔ میں ذرا اونچی آواز میں گربانی کا پاٹھ کرتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ پولیس والوں نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ان کی ویسے ہی وہاں ڈیوٹی لگی ہو گی۔ سکھ بن جانے یعنی سکھ نوجوان کا روپ دھار لینے سے مجھے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا تھا کہ اس خیال سے میرے ذہن پر جو تناؤ اور دباؤ سا رہتا تھا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں وہ کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں چاروں طرف سے باخبر رہتا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو یہ کہہ کر چلتا کیا کہ وہ کل دن میں کسی وقت آکر پتہ کر جائے کہ مجھے کہیں جانا تو نہیں۔

وہ پرنام کر کے چلا گیا۔ رات کو میں درگاوتی کے مکان پر جا پہنچا۔ میری جیب میں پورے ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ میں نے بھی خوب عطر لگایا ہوا تھا۔ ریواڑی میں ہی میں نے اس کے لئے عطر کی شیشی خرید لی تھی۔ اس کا میں نے درگاوتی کو تحفہ پیش کیا تو بڑی خوش ہوئی۔ وہ بڑی بنی سنوری تھی اور کوئی سیٹھ قسم کا موٹا لالہ اس کے پاس بیٹھا پان چبا چبا کر منہ مار رہا تھا۔ درگاوتی نے لالہ جی کو دو تین باتیں کر کے رخصت کر دیا۔ پھر وہ مجھے لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ میرے لئے پھل اور مٹھائیاں آگئیں۔ جام کا دور چلنے لگا۔ درگاوتی نے مجھے دو تین ٹھمریاں سنائیں۔ میں نے ہزار روپیہ اس پر نچھاور کر دیا۔

اب میں ہر رات اس کے پاس جاتا اس کا گانا سنتا اور ہزار بارہ سو روپے اس پر نچھاور کر کے واپس آجاتا۔ اس طرح چھ دن گزر گئے۔ پھر ہفتے کی رات آگئی۔ درگاوتی نے مجھ سے معذرت کی کہ کل رات میں فارغ نہیں ہوں گی۔ کل ہفتے کی رات ہے میرے مہربان اور پرانے ملنے والے آ رہے ہیں۔

"ہفتے کی رات آپ کو تو معلوم ہی ہے وہ میرے پاس گزارتے ہیں۔ کل کی رات کے لئے مجھے شما کر دیجئے گا۔"

میں نے درگاوتی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بادشاہو! فکر کی کونسی بات ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم اتنی پیاری ہو۔ تمہارے تو بہت کرنے والے ہوں گے۔ چلو میں بھی دلی اپنے ماتا پتا سے مل آتا ہوں اتوار کو واپس آ جاؤں گا۔"

میں اسی رات کی صبح کو ایک بار پھر دلی پہنچ گیا۔ اس بار میں نے جان بوجھ کر بس میں ... کیا کہ وہاں لوگوں کی نظروں میں نہ آجاؤں۔ کیونکہ ریواڑی چھوٹا شہر تھا اور میں بس سے دلی روانہ ہوتے ہوئے لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ میں نے ٹرین پکڑی ... لی آگیا۔ آتے ہی گل خان کو فون کیا۔ اس نے یہ اچھی خبر سنائی کہ میرا بی۔ ایس۔ سی کا سرٹیفکیٹ تیار ہو کر آگیا ہے۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"تم دوپہر کو ہی میرے پاس آجاؤ۔ رات ہونے کا انتظار نہ کرو۔"

وہ دوپہر کو آیا اور ساتھ میرے لئے کھانا چائے وغیرہ بھی لیتا آیا۔ اس نے مجھے سرٹیفکیٹ دیا۔ یہ دلی یونیورسٹی کا بی۔ ایس۔ سی کا سرٹیفکیٹ تھا۔ ایسی عمدہ نقل تیار کی گئی کہ ہو بہو اصلی لگتا تھا۔ یونیورسٹی کی مہریں بھی لگی تھیں اور اس زمانے میں دلی یونیورسٹی کا جو چانسلر تھا اس کے بھی پکے دستخط موجود تھے۔ سرٹیفکیٹ پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ میں نے نیوکلر فزکس کے مضمون میں بی۔ ایس۔ سی درجہ اول میں پاس کیا ہے۔ گل خان کہنے لگا۔

"میں نے اس کی ایک فوٹو کاپی کروا کر اپنے پاس رکھ لی ہے۔ تم اصلی سرٹیفکیٹ لے جانا۔ ویسے اگر یہ گم ہو جائے تو دوسرا جعلی سرٹیفکیٹ بھی تیار ہو سکتا ہے۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"گل بھائی! اب کمانڈو ایکشن کا وقت آگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے جانے کے دوسرے دن اپنے خاص آدمی کو لے کر رات کے وقت میرے ہوٹل ریواڑی پہنچ

جاؤ۔ اپنے ساتھ پستول اور ایک بڑا چاقو لانا مت بھولنا۔ پستول تمہارے پاس رہے گا اور
چاقو دوسرے آدمی کے پاس ہوگا۔"

ہم نے ایک بار پھر اپنے منصوبے کی ساری تفصیل کو دہرایا اور میں نے اسے اچھی
طرح سے ذہن نشین کرادیا کہ ان لوگوں کو کس طرح غنڈوں کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ گل
خان بولا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم پرسوں رات تمہارے پاس ہوں گے۔"

وہ دن اور اس کا اگلا دن میں نے دلی میں اسی مکان میں گزارا اور دوسرے دن ک
رات کو واپس ریواڑی آگیا۔ اس سے اگلی رات گل خان بھی اپنے ساتھی کو لے کر
میرے ہوٹل کا پتہ معلوم کر کے میرے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک باڈی بلڈر ٹائپ
کا نوجوان تھا جو اپنے گروپ کا ہی با اعتماد نوجوان تھا اس میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر
بھرا ہوا تھا۔ وہ کشمیر کے محاذ پر بھی لڑ چکا تھا اور بقول اس کے اس نے کئی ڈوگرہ فوجیوں
ہلاک کیا تھا۔ دونوں پتلون قمیض میں تھے اور بند گلے کی اونی جرسیاں پہنی ہوئی تھیں
ریواڑی میں دن کے وقت اتنی ٹھنڈ نہیں پڑتی تھی مگر رات کو سردی ہو جاتی تھی۔ ہ
نے رات کا کھانا اکٹھے ہی کھایا۔ اس کے بعد دونوں ہی چلے گئے۔ وہ سٹیشن کے پاس کہ
ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے دن رات کو مجھے اپنے کمانڈو منصوبے کے پہ
مرحلے پر عمل شروع کرنا تھا۔ میں رات کی بجائے شام کو ہی درگاوتی کے مکان پر چلا گیا
ایک گھنٹہ اس کا گانا سنا۔ اس پر کچھ روپے نچھاور کئے اور کہا۔

"درگا جی! آج کسی سنیما میں جا کر فلم دیکھی جائے بڑا دل چاہ رہا ہے۔"

وہ ذرا سوچنے لگی تو میں نے کہا۔

"بس انکار نہ کرنا درگا جی! میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ رات کا شو دیکھیں گے۔ میں جا
ٹکٹ بک کرا آتا ہوں۔ بڑی اچھی فلم چل رہی ہے۔"

درگاوتی نے مسکرا کر کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔"

ریواڑی میں ایک دو ہی سنیما ہاؤس تھے اس زمانے میں ایک سنیما ہاؤس نیا نیا بنا تھا۔
بانے وہاں کونسی انڈین فلم چل رہی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ اتنا یاد ہے اس
دلیپ کمار نے کام کیا تھا۔ میں نے گیلری کی دو سیٹیں بک کرالیں۔ واپسی پر اس
نے کا جائزہ لینے لگا۔ جہاں مجھے درگاوتی کے ساتھ رکشا یا ٹیکسی میں گزرنا تھا۔ وہاں سے
ما میں گل خان کے پاس اس کے ہوٹل میں گیا۔ اسے بتایا کہ آج رات ہم سنیما دیکھنے
ہے ہیں۔ واپسی پر ایکشن پلے ہوگا۔ میں نے ان دونوں کو ساتھ لیا۔ ایک ٹیکسی میں
اور دور سے انہیں درگاوتی کا مکان دکھا دیا۔ گل خان بولا۔

"ہم رات کا آخری شو ٹوٹنے کے بعد یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے اسے بتا دیا تھا کہ درگاوتی کے مکان میں رات کو سوائے سازندوں کے اور
مرد نہیں ہوتا۔ آدھی رات کے بعد اگر اس کا کوئی آدمی آجاتا ہو تو اس کی مجھے خبر
۔ مگر رات بارہ ایک بجے تک وہ اکیلی ہی ہوتی ہے۔

دونوں واپس چلے گئے۔ میں نے درگاوتی کے پاس آکر اسے سنیما کے ٹکٹ دکھائے
ہا۔

"سوہنیو! تیاری شروع کردو۔ دوسرا شو شروع ہونے میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا
"

درگاوتی نے نئی مگر سادہ ساڑھی نکال کر پہنی اور چوکیدار کو بھیج کر ٹیکسی منگوائی۔
ا سازندوں سے کہا کہ وہ اس کے واپس آنے تک گھر پر ہی رہیں۔ ہم دونوں ٹیکسی
بیٹھ کر سنیما ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئے۔ گل خان اور اس کے ساتھی کو میں نے
دیا تھا کہ انہیں کس وقت آنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ فلم دیکھ کر ہم واپس آئے تو رات
ب بج رہا تھا۔ دونوں سازندے کمرے میں سو رہے تھے۔ درگاوتی نے انہیں اٹھاتے
ئے کہا۔

"تمہیں یہاں پہرہ دینے کے لئے کہا تھا اور تم لمبی تان کر سو رہے ہو۔ جاؤ پیچھے اپنی
ڑی میں جا کر سوؤ۔"

دونوں سازندے اٹھ کر چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ کوٹھی کے پیچھے کسی کوٹھڑی میں
رات کو سوتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کچھ فکر لگی۔ لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ
سازندے کوٹھڑی میں جاتے ہی سو جائیں گے اور ویسے بھی میرے منصوبے میں پستول
کے فائر کا دھماکہ شامل نہیں تھا۔ درگاوتی کہنے لگی۔

"جسونت جی! آج یہیں پر سو جاؤ۔ کہاں ہوٹل میں اس وقت جاؤ گے۔"

مجھے تو ہر حالت میں وہیں ٹھہرنا تھا۔ میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی"

میں کوٹ اتار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ درگاوتی دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے چلی
گئی۔ میں نے وقت دیکھا۔ گل خان کے آنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ درگاوتی واپس
آئی تو اس نے سلکی نائیٹی پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے جسم کے پیچ و خم نمایاں ہو
کر نظر آرہے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھنے لگی تو میں نے کہا۔

"میری جان جی! ذرا میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں دور سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم
اس لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

بات یہ تھی کہ منصوبے کے مطابق اسے میرے ساتھ نہیں بلکہ سامنے والے
صوفے پر بیٹھنا چاہئے تھا جس کے پیچھے دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے اطمینان کر
لیا تھا۔ اس دروازے کو اندر سے چٹخنی نہیں لگی تھی۔ درگاوتی شرماتی ہوئی دروازے کے
ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

میں اس کے حسن کی اس کے جسم کی تعریفیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ دیوار پر لگے
کلاک کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ گل خان کے آنے میں پانچ سات منٹ رہ گئے تو میں ہوشیار ہو
کر بیٹھ گیا۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور گل خان اور اس
کا ساتھی اس حالت میں اندر داخل ہوئے کہ گل خان کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے
ساتھی کے ہاتھ میں برہنہ خنجر تھا۔ پروگرام کے مطابق گل خان نے آتے ہی درگاوتی کی
گردن میں بازو ڈالا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ اس

چھلانگ لگا کر میرے پیچھے آگیا اور خنجر میری گردن پر رکھ دیا۔ درگاوتی کا دہشت
ے رنگ اڑ گیا تھا۔ گل خان نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"کسی قسم کی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا میرا پستول بھرا ہوا ہے۔ اس عورت کے
یک ہی گولی کافی ہوگی۔"

یں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے میں ذرا نہیں گھبرایا ہوں۔ میں درگاوتی پر یہی ظاہر کرنا
تا۔ میں نے گل خان سے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

گل خان نے کہا۔

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہئے۔"

پھر اس نے درگاوتی کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔

"بتا تمہارے زیور اور مال دولت کہاں پر ہے اگر آواز نکالی تو پستول کی گولی تیرا بھیجہ
ے گی۔"

درگاوتی کو گل خان نے صوفے پر سے کھینچ کر اپنے آگے کھڑا کیا ہوا تھا۔ درگاوتی کی
کے مارے بری حالت تھی۔ اس پر لرزہ طاری تھا۔ بڑی مشکل سے بولی۔

"مجھے نہ مارنا۔ سارے زیور روپے سامنے والی الماری میں ہیں۔"

ری کی چابی کہاں ہے؟"

گل خان نے پوچھا۔

"الماری کھلی ہوئی ہے۔"

درگاوتی نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس کا ساتھی جو خنجر میری گردن پر رکھے کھڑا تھا۔ وہ پروگرام کے مطابق جان بوجھ
ذرا غافل ہوگیا۔ گل خان جیسے ہی درگاوتی کو کھینچتا ہوا الماری کی طرف بڑھا میں نے
خان پر چھلانگ لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ اس کا پستول پرے جا پڑا۔ میں نے درگاوتی
کھانے کے لئے گل خان کو جبڑوں پر زور سے مکا مارا اور پستول اٹھانے لگا۔ اتنے میں

اس کا ساتھی خنجر سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے کے پیچھے گرا دیا اور پستول اٹھا کر گرج کر کہا۔

"اوئے تم کو پتہ نہیں تھا کہ یہاں شیر دل جسونت سنگھ سوڈھی بیٹھا ہوا ہے۔ میں تو تم دونوں کو اڑا کر رکھ دوں گا۔"

گل خان اور اس کا ساتھی جیسا کہ انہیں سمجھا دیا گیا تھا ہاتھ کھڑے کر کے ایک طرف کھڑے تھے۔ درگاوتی میرے ساتھ لگ گئی تھی اور اس کا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی انہیں قتل نہ کرنا۔ میری بڑی بدنامی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو ان کی جان بخشی کر دیتا ہوں۔ لیکن میں انہیں پولیس کے حوالے ضرور کروں گا۔"

درگاوتی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ خوف کے مارے ابھی تک اس کے حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ کہنے لگی۔

"بھگوان کا واسطہ ہے۔ پولیس یہاں آئی تو وہ مجھے بھی پکڑ کر لے جائے گی۔ وہ مجھے بڑا خوار کرے گی۔ ان کو یہاں سے بھگا دو"

میں نے گل خان سے کہا۔

"سن اوئے وڈے غنڈیا اس عورت نے تمہاری جان بچالی ہے۔ تمہیں جیل جانے سے بھی بچا لیا ہے۔ اب یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اگر پھر کبھی اس گھر کا رخ کیا تو یاد رکھنا میں یہاں تمہارے سواگت کو موجود ہوں گا۔ پھر میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

گل خان نے پہلے سے طے شدہ مکالمے بولتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار جی! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔"

میں نے گل خان کا پستول اور اس کے ساتھی کا خنجر اپنے قبضے میں کر لیا۔ اور اٹھ کر ان کے قریب گیا۔ دونوں کی پیٹھ پر ایک ایک لات ماری اور انہیں کمرے سے نکال کر

ھی کے برآمدے میں لے آیا۔ باہر آ کر دیکھا تو منصوبے کے مطابق انہوں نے چوکیدار منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے ستول کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ برآمدے میں آ کر گل خان سرگوشی میں پوچھا۔

"کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب کام ٹھیک ہوا ہے۔"

پھر اونچی آواز میں دونوں کو بے ضرر سی گالی دے کر کہا۔

"خبردار اگر دوبارہ ادھر میں نے تم کو دیکھا۔ یاد رکھو۔ میں پنجابی بھی ہوں اور سکھ ہوں۔ دفع ہو جاؤ۔"

برآمدے کے اوپر روشن بلب کی روشنی میں بندھا ہوا چوکیدار ہمیں دیکھ رہا تھا۔ گل ن اور اس کا ساتھی دونوں بھاگ کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ پستول ے ایک ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں نے چوکیدار کے منہ سے کپڑا ۔ اس کی رسیاں کھولیں۔ وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ڈاکوؤں کو بھگا دیا ۔ فوراً واپس درگاوتی کے کمرے میں آیا۔

وہ صوفے پر پڑی تھی۔ اس کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ں۔ میں نے اسے گلاس میں پانی لا کر پلایا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے حوصلہ کہ گھبرانے کی اب کونسی بات ہے۔ میں نے ڈاکوؤں کو بھگا دیا ہے۔ پھر پستول اور خنجر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"درگا جی! تمہارے کہنے پر میں نے انہیں چھوڑ دیا ورنہ میں دونوں کا خون کرنے والا ۔"

درگاوتی نے اپنا سر میرے ساتھ لگا دیا اور روتے ہوئے بولی۔

"جسونت جی! تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارے احسان کا بدلہ کبھی نہیں تی۔"

وہ رو رہی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا اور کہا۔

"درگا جی! رونے کی کونسی بات ہے بھلا میرے ہوتے ہوئے کس میں اتنی ہمت ہے کہ تمہاری طرف بری نظر بھی دیکھے۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر بولی۔

"بھگوان کے لئے میرے پاس ہی رہنا۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"

میں نے کہا۔

"بادشاہو! اب تو جیون بھر تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جا سکتے ہیں؟"

وہ ذرا اپنے ہوش و حواس میں آئی تو ہاتھ جوڑ کر میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو درگا جی! تمہارے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔"

وہ میری بہادری اور جواں مردی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی! اگر تم ہمت سے کام نہ لیتے تو میں لٹ گئی تھی۔"

ایک بات کا مجھے زندگی میں تجربہ بھی ہوا ہے اور میرا مشاہدہ بھی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ عورت مرد کے حسن' اس کی شہرت اور اس کی دولت سے بھی بہت متاثر ہوتی ہے مگر جتنا متاثر وہ مرد کی بہادری سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے اتنا متاثر نہیں ہوتی۔ شاید یہ قدرتی بات ہے۔ بہادر مرد کی عورت دل سے قدر کرتی ہے۔ میں نے یہ سارا ڈرامہ بھی اسی لئے رچایا تھا کہ وہ مجھ سے صرف شدت کے ساتھ متاثر ہی نہ ہو بلکہ میری زیر بار احسان ہو جائے۔ پھر مجھے اس سے جو کام نکالنا تھا اس کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اس نے مجھے خاص طور پر منع کر دیا کہ میں اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ اس نے چوکیدار کو بھی بلا کر کہا۔

"خبردار! کسی کو اس واقعے کا پتہ نہ چلے۔ تم سمجھو کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ سازندے سو رہے ہوں گے۔ انہیں بھی کچھ نہ بتانا۔ میں نہیں چاہتی کہ پولیس مجھ سے پوچھ گچھ

یہاں آئے یا مجھے تھانے بلائے۔ میری بڑی بدنامی ہوگی۔ آج تک میرے ساتھ کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔"

وہ رات میں نے درگاوتی کے مکان پر ہی بسر کی۔ دوسرے روز بھی میں دوپہر تک ے پاس ہی رہا۔ پھر رات کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ گل خان اور اس کا ساتھی میری کے مطابق واپس دلی روانہ ہو چکے تھے۔ میرے مشن کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ ھے اس کے دوسرے مرحلے پر کام شروع کرنا تھا۔

یں رات کو درگاوتی کے پاس گیا تو اس کے لئے ریشمی ساڑھی کا ایک تحفہ بھی لیتا وہ مجھے دیکھ کر اور ساڑھی کا تحفہ لے کر بڑی خوش ہوئی۔ مجھ سے رات کے واقعے کر کے میری بہادری کی تعریفیں کرنے لگی۔ ہم چائے پی رہے تھے۔ میں نے اسے

"درگا جی! آج مجھے کوئی اپنی پسند کی چیز سناؤ۔"

سازندوں نے ساز چھیڑ دیئے۔ درگاوتی نے خدا جانے کس کی غزل سنائی۔ غزل کی میرا بالکل دھیان نہیں تھا۔ میں اپنے اگلے مرحلے کی ابتدا کرنے والا تھا۔ اور اسی ے میں سوچ رہا تھا۔ مگر اس دوران اسے سو سو روپے کی ایک ہزار کی ویلیں دینا ں بھولا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں تقریباً ہر دوسرے روز اسے ایک ہزار روپے کسی بہانے دے دیتا تھا۔ مجھ سے بڑھ کر تماش بین اسے کہاں مل سکتا تھا اور اب تو ی مریدنی سی بن گئی تھی۔ اس نے مجھے صاف صاف کہا تھا کہ رات کو میری جگہ وسرا تماش بین ہوتا تو بھاگ جاتا۔ غزل ختم ہوئی تو میں نے باتوں ہی باتوں میں اسے

"درگا جی! میں تو چاہتا ہوں کہ دلی چھوڑ کر میں ریواڑی میں آجاؤں۔ پتا جی نے جھے کی جائیداد پہلے ہی الگ کر دی تھی اور میں نے اسے بیچ کر دس لاکھ روپے ں جمع کروا رکھے ہیں۔ سوچتا ہوں یہ سارے روپے یہاں ریواڑی کے کسی بینک کرادوں اور کوئی مکان لے کر رہنے لگوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ دس لاکھ کا سن کر درگاوتی کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی تھی۔ آنی بھی چاہئے تھی۔ کہنے لگی۔

"تو تم یہاں آ کیوں نہیں جاتے۔ بے شک میرے پاس ہی رہ لینا۔"

میں نے کہا۔

"نہیں درگا! یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں یہاں کوئی مکان لے لوں گا۔ میں مکان لے سکتا ہوں۔"

درگاوتی میرے قریب ہو گئی۔

"میں تمہیں بڑا اچھا مکان لے دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

میں نے فکر مند ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں کوئی کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ یہ کہیں کہ میں باپ کی جائیداد پر عیش و عشرت کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی ملازمت بھی کرلوں تاکہ سماج میں میری تھوڑی بہت عزت بھی بن جائے۔ لوگ مجھے ذمے دار آدمی سمجھنے لگیں۔"

درگاوتی نے میرے مزید قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں ملازمت کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔"

میں نے درگاوتی کی طرف دیکھا۔

"تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟"

وہ بڑے فخر کے ساتھ کہنے لگی۔

"تمہیں تو معلوم ہی ہے ہفتے کی رات کو میرے پاس ایک پرانے مہربان آتے ہیں میں نے تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ میں نے تم سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا"

وہ بولی۔

"جانتے ہو وہ میرا دوست اور مہربان کون ہے؟"

کوئی لکھ پتی سیٹھ ہوگا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

کہنے لگی۔

"نہیں۔ وہ بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ اس کا نام سردار ارجن سنگھ سوڈھی ہے۔ ی ذات بھی وہی ہے جو تمہاری ذات ہے۔"

"وہ میری کیا مدد کرے گا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

درگاوتی نے میری طرف جھک کر بڑی رازداری کے انداز میں کہا۔

"رام گڑھ میں کوئی دفتر ہے وہاں وہ سب سے بڑا افسر لگا ہوا ہے۔ میں اسے کہہ کر ن وہاں اچھی سی ملازمت دلوا دوں گی۔"

میں نے کہا۔

"اگر یہ ہو جائے تو بڑا اچھا ہے۔ پھر میں جب چاہوں تمہارے پاس بھی آجایا کروں "

وہ بولی۔

"رام گڑھ یہاں سے کونسا دور ہے۔ تم یہاں سے صبح جا کر شام کو واپس آجایا کرنا۔"

میں نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہو جائے تو میں گھر والوں کو بھی بتا سکوں گا کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوں۔ ی ملتے ہی میں دس لاکھ روپے دلی والے اپنے بینک سے یہاں ریواڑی کے بینک میں لروا دوں گا۔ مگر سردار جی تمہاری بات مان جائیں گے۔ میرے پاس بی۔ایس۔سی کا یفکیٹ بھی ہے۔"

وہ گردن اونچی کر کے کہنے لگی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ سردار جی تو میرے غلام ہیں۔ بس اس ہفتے وہ آئیں گے تو ان سے بات کر کے تم سے ملوا بھی دوں گی۔ تم ایسا کرنا۔ مجھے اپنی بی۔ایس۔سی کی ت کا سرٹیفکیٹ دلی سے منگوا دینا۔"

میں نے کہا۔

"وہ تو میرے پاس ہی ہے۔ میں کل لیتا آؤں گا۔"

اتنا مجھے معلوم تھا کہ سردار جی ایک خفیہ ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ شاید وہ ایک طوائف کے کہنے پر مجھے وہاں ملازمت نہ دیں۔ شاید انہوں نے درگاوتی کو بتایا ہی نہ ہو کہ وہ ایٹمی سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔ بہرحال میرے پاس نیوکلر فزکس میں فسٹ کلاس بی۔ایس۔سی پاس کرنے کا جو سرٹیفکیٹ تھا وہ انہیں سوچنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

دوسرے روز میں رات کو درگاوتی کے ہاں گیا تو اپنا نقلی سرٹیفکیٹ بھی لفافے میں ڈال کر لیتا گیا۔ مزید کچھ دن گزر گئے۔ پھر ہفتے کی رات آگئی۔ اس رات درگاوتی نے سردار ارجن سنگھ سوڈھی سے میری نوکری کے بارے میں بات کرنی تھی۔ میں اس رات ہوٹل میں ہی رہا۔ دوسرا دن بھی ہوٹل میں ہی گزارا۔ رات کو درگاوتی کے ہاں گیا تو وہ بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"جسونت جی! تمہارا کام ہو گیا سمجھو۔"

اس نے خدا جانے کس نازک لمحے کے دوران سردار جی سے میری بابت بات کی تھی کہ سردار جی نے مجھے نوکری دلانے کی حامی بھرلی تھی لیکن انہوں نے شرط لگائی تھی کہ میں اگلے ہفتے آؤں گا اور امیدوار نوجوان سے بھی ملوں گا اور اس کا سرٹیفکیٹ بھی دیکھوں گا۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ خوشی کا اظہار نہ کیا۔

"بھگوان جانے سردار جی نے تمہیں یونہی کہہ دیا ہو گا۔"

درگاوتی نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"یاد رکھو! عورت اگر کسی مرد سے کوئی کام کروانا چاہے تو وہ سب کچھ جانتی ہے کہ یہ کام اسے کس طرح کروانا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت حد تک ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ تاریخ کے بڑے بڑے فیصلے عورت کے بستر پر ہوئے ہیں۔ نہ جانے کتنے ایسے خونیں انقلاب ہیں جن کے پیچھے عورت کا ہاتھ کار فرما رہا ہے۔ عورت کی خواب گاہ میں مرد پر ایک ایسا نازک وقت آتا ہے کہ اس وقت عورت اس سے جو چاہے منوالیتی ہے۔

رگاوتی نے بھی سردار ارجن سنگھ سوڈھی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔ اسی لئے وہ اتنی پراعتماد
ی مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔

ہفتے کی شام کو سردار ارجن سنگھ سوڈھی رام گڑھ سے بلکہ راج گڑھ سے ریواڑی گاوتی کے گھر آئے تو میں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مجھے درگاوتی نے دوسرے کمرے بٹھا دیا تھا۔ وہ سردار ارجن سنگھ سوڈھی کو لے کر گانے بجانے والے کمرے میں چلی ی۔ اندر سے گانے بجانے کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کوئی پون گھنٹہ گزر گیا۔ میں پنے کمرے میں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ سگریٹ کی طلب پیدا ہوئی۔ مگر میں سگریٹ نہیں پی ا تھا۔ کیونکہ میں سکھ بنا ہوا تھا۔ میں احتیاط کے طور پر اپنی جیب میں بھی سگریٹ نہیں تا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو درگاوتی کمرے سے نکلی۔ وہ اپنے بال درست کر رہی تھی۔ نے لگی۔

"آجاؤ۔"

میں گانے بجانے والے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے گاؤ تکیئے کا سہارا لئے سردار ن سنگھ سوڈھی اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی قمیص پتلون سے باہر نکلی ہوئی ۔ سر پر انہوں نے زرد رنگ کا رومال باندھ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں میرا سرٹیفکیٹ ۔ آنکھوں پر چشمہ لگا تھا اور وہ میرے سرٹیفکیٹ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے تے ہی بڑے ادب سے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا اور اسی ادب کے ساتھ ان کے ؤں کے پاس ایک ہو کر بیٹھ گیا۔

سردار صاحب کی عمر ساٹھ کی ہو چکی تھی۔ ڈاڑھی کافی سفید ہو گی جنہیں خضاب لگا ر انہوں نے سیاہ کیا ہوا تھا۔ جسم بھاری تھا انہوں نے سرٹیفکیٹ سے نظریں ہٹا کر میری ف گھور کر دیکھا درگاوتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"لڑکا بی۔ایس۔سی پاس ہے۔ پھر یہ بھی سوڈھی ہے۔ اسے اپنے دفتر میں کسی کام پر ں۔ اس کی زندگی بن جائے گی۔"

سردار جی نے پوچھا۔

"نیوکلر فزکس کی تم نے تھیوری پڑھی ہے کہ پریکٹیکل بھی کیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"پریکٹیکل بھی کرتا رہا ہوں سر۔ میں نے یہ سبجیکٹ اسی لئے سلیکٹ کیا تھا سر کہ مجھے نیوکلر سائنس کا بڑا شوق تھا۔ میں نے آئن سٹائن کی تھیوری آف ریلیٹویٹی بھی پڑھی ہے سر۔"

سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے دوبارہ میرے سرٹیفکیٹ پر نگاہ ڈالی۔

"تمہاری ڈویژن بھی فسٹ کلاس ہے۔"

میں کچھ کہنے لگا تو درگاوتی نے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ میں خاموش رہا۔ سردار جی نے سرٹیفکیٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"تم دو ایک دن بعد راج گڑھ میرے مکان پر آکر مجھے مل لینا میں سوچوں گا کہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے سرٹیفکیٹ لے کر سردار جی کا شکریہ ادا کیا اور درگاوتی کے دوسرے اشارے پر اسے ست سری اکال کہہ کر بڑے ادب سے کمرے سے نکل آیا۔

یہاں میں بات کو مختصر کرتے ہوئے آپ کو بتاتا ہوں کہ دو دن کے بعد میں ریواڑی سے راج گڑھ سردار جی کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ سردار جی اپنے کوٹھی نما کوارٹر کے لان میں کرسی میز ڈال کر بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ یہ صوبہ راجستھان کا شمال مغربی علاقہ تھا۔ یہاں سردیوں میں دن کے وقت ہلکی گرمی ہوتی ہے۔ رات کو ٹھنڈ ضرور ہوتی ہے۔ شام کے وقت موسم بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ میز پر بیئر کی بوتل پڑی تھی۔ ایک گلاس میں آدھی بیئر نظر آ رہی تھی۔ سردار ارجن سنگھ جی نے پتلی سی جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ سر پر رومال بندھا تھا۔ گھٹنوں پر تولیہ پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر ست سری اکال کہا اور ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

سردار جی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بید کی ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ میں سمٹ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سردار جی نے نوکر کو بلا کر اندر سے کاپی پنسل منگوائی۔ کاپی میری

ی بڑھا کر کہا۔

"لکھو۔ ڈائریکٹر جنرل منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رام گڑھ۔"

میں کاپی پر انگریزی میں لکھتا چلا گیا۔ سردار جی نے کہا۔

"یہ کاغذ پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لو۔ کل ڈائریکٹر جنرل کے نام ایک اپلی کیشن لکھ کر آنا کہ میں نیوکلر فزکس کا بی۔ ایس۔ سی ہوں۔ مجھے منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ے لائق کوئی نوکری عطا کی جائے۔ ساتھ اس سرٹیفکیٹ کی ایک کاپی لگا دینا۔ میں ش کروں گا کہ تمہیں کوئی کام مل جائے۔ یہاں کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم مجھ سے آئے تھے۔ اب تم جدھر سے آئے ہو ادھر ہی چلے جاؤ۔"

میں ست سری اکال کہہ کر خاموشی سے واپس چل دیا۔

اگلے روز میں نے ایک درخواست لکھی۔ اس کے ساتھ اپنے جعلی سرٹیفکیٹ کی کاپی لگائی اور شام کے وقت سردار جی کے ہاں جا کر انہیں دے دی۔ انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم واپس ریواڑی چلے جاؤ۔ میں درگاوتی کو جو بتانا ہو گا بتا دوں گا۔ اور کسی سے میری بابت کوئی بات نہ کرنا۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"سر! میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ تمہارے ماتا پتا دلی میں ہی ہوتے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ درگاوتی نے اسے بتا دیا ہو گا کیونکہ میں نے اسے تھا کہ میرے ماں باپ دلی میں ہیں۔

"ہاں جی دلی میں ہی رہتے ہیں۔ لیکن میری ان سے بنتی نہیں۔ پتا جی مجھے ہر وقت دیتے رہتے ہیں کہ میں کوئی کام نہیں کرتا۔ میں نے پڑھ لکھ کر گنوایا ہے۔"

سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔

"مجھے تیرے ماتا پتا کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر درگاوتی کی سفارش نہ تم یہاں آ بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ماتا پتا کو بھی نہ بتانا کہ تم یہاں کام کرتے ہو۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ اس جملے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سردار جی نے مجھے وہاں

نوکری دے دی ہے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ درخواست پر انہوں نے
محکمے کا نام مینرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھوایا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایٹمی ریسرچ سنٹر
نیوکلر انرجی سنٹر کو ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں نے وفادار خادموں کی طرح فوراً ہاتھ
باندھ کر کہا۔

"سر! مجھے کیا ضرورت ہے ماتا پتا کو بھی بتانے کی۔ میں تو پہلے ہی ان سے نہیں ملتا۔
اب جاؤ۔"

میں چلنے لگا تو سردار جی نے کہا۔

"اور سنو! درگاوتی کے ہاں بھی زیادہ مت جانا۔ کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا سر! میں وہاں بھی نہیں جاؤں گا"

سردار جی نے انگلی ہلا کر مجھے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس روز واپس ریواڑی اور وہاں سے دلی پہنچ گیا۔ اب مجھے ایک دو دن کے بعد
درگاوتی سے رابطہ قائم کر کے اپنی نوکری کے بارے میں معلوم کرنا تھا جو یقیناً مجھے مل چکی
تھی۔ دلی آ کر میں نے گل خان اور پروفیسر جمشید کو اپنی کامیابی کا مژدہ سنایا۔ پروفیسر جمشید
خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔

"یہ کام عورت کی وجہ سے ہوا ہے۔ سردار ارجن سنگھ سوڈھی نے سکھ ہونے کا
ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کی جگہ کوئی ہندو ہوتا تو تمہیں قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا۔ کیونکہ
رام گڑھ کا زیر زمین ایٹمی ریسرچ سنٹر انڈیا کے حساس ترین اور اہم ترین سائنسی اداروں
میں سے ہے۔"

گل خان کہنے لگا۔

"ہم نے بھی تو ڈاکوؤں کا بڑا کامیاب رول ادا کیا تھا۔"

"یہ واقعہ اپنا کام دکھا گیا"

میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ دو تین دنوں کے بعد میں رام گڑھ کے ایٹمی ریسرچ سنٹر میں کوئی

نہ کوئی ڈیوٹی دے رہا ہوں گا"

پروفیسر جمشید بولا۔

"میں حیران ہوں کہ ارجن سنگھ سوڈھی نے تمہارے ماں باپ کے بارے میں بھی
کوئی تحقیق نہیں کی۔ حالانکہ وہاں جس کسی کو ملازم رکھا جاتا ہے اس کی بے حد سکروٹنی
ہوتی ہے اس کے سارے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ میں سمجھتا
ہوں کہ تم بڑے خوش قسمت ہو"

"یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے"

گل خان نے کہا۔

پروفیسر جمشید کہنے لگا۔

"ایٹمی سنٹر میں ملازم ہونے کے بعد تمہیں زیر زمین وہاں کے تمام شعبوں کے نقشے
تیار کر کے مجھے دکھانے ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کس مقام پر
ٹائم بم لگانے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"ایسا ہی کروں گا۔ کیونکہ ایک اعتبار سے میں وہاں اجنبی ہوں گا۔"

پروفیسر کہنے لگا۔

"لیکن تمہارے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہے کہ تم نے نیوکلر سائنس میں بی۔ ایس۔ سی
کیا ہے۔ اس اعتبار سے تمہیں نیوکلر فزکس کی ابتدائی معلومات ضرور ہونی چاہئیں"

میں نے جواب میں کہا۔

"کچھ ابتدائی معلومات کا مجھے علم ہے۔ باقی میں دو دن یہاں پر ہوں۔ کچھ تم سے
معلومات حاصل کروں گا۔"

رات کے ایک بجے کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔

ان کے سامنے بھی میں سگریٹ پیتا رہا تھا اور ان کے جانے کے بعد بھی میں نے سگریٹ لگایا اور تھرمس میں سے چائے کپ میں ڈال کر چارپائی پر بیٹھا آئندہ کے کمانڈو منصوبے پر غور وفکر کرنے لگا۔ اپنی سکھوں والی پگڑی اتار کر میں نے دیوار کے ساتھ لٹکا دی تھی اور سر کا جوڑا کھول دیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ یہ پگڑی اور سر کے بندھے ہوئے بال ہی پریشان کرتے رہتے تھے۔ اصل میں مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔ دوسرے دن پروفیسر جمشید دن کے وقت ہی مجھ سے ملنے آگیا۔ اس نے مجھے نیو کلر انرجی پر ایک مختصر سا لیکچر دیا۔ پھر بتایا کہ نیو کلر پلانٹ کیا ہوتا ہے اور وہاں کس طرح یورینیم میں سے ان چند ایک عناصر کو صاف کر کے ایٹمی دھماکے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ پلاٹونیم کے بارے میں بھی اس نے مجھے تمام ابتدائی معلومات بتائیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مادے کے تمام عناصر میں سے صرف یورینیم ہی ایک ایسا مادہ ہے جس کے تمام عناصر سے ایٹمی دھماکہ ہو سکتا ہے اس کو ایٹمی ایندھن بھی کہتے ہیں۔ ہر ایٹمی سنٹر میں اسی ایندھن کو بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں نے پروفیسر کی ساری باتیں جتنی میری سمجھ میں آئیں میں نے انہیں اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ میں رام گڑھ کے زیر زمین ایٹمی مرکز کے تمام ایٹمی پلانٹ کے شعبوں کے نقشے یا تصویریں اتار کر پروفیسر جمشید کو لا کر دوں گا اور وہ ایٹمی مرکز کی تباہی کے سلسلے میں میری مدد کرے گا۔ پروفیسر نے کہا۔

”ہمارے وسائل یہاں محدود ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تمہیں چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا کیمرہ لا کر دے سکوں جو تمہاری انگوٹھی یا تمہاری قمیض کے بٹن میں

فکس کر دیا جائے۔ لیکن پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں سیکورٹی چیکنگ کا کیا انتظام ہے کیونکہ غیر ضروری میٹل تمہارے لباس یا جسم پر چیک ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا۔“

دو دن دلی والے مکان میں گل خان اور پروفیسر جمشید کی صحبت میں گزارنے اور ضروری تفصیلات طے کرنے کے بعد میں ریواڑی واپس چلا آیا۔ یہاں آتے ہی میں سیدھا درگاوتی کے ہاں گیا۔ وہ بے تاب ہو کر مجھے ملی۔

”جسونت جی! آپ نے رام گڑھ میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔ میں تو آپ کی راہ دیکھتی تھک گئی تھی۔“

میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میں رام گڑھ سے سیدھا دلی چلا گیا تھا۔ اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ بولی۔

”بالکل نہیں۔ کیا انہوں نے مجھے کوئی خط بھی لکھنا ہے؟؟“

میں نے اسے بتایا

”میں نے نوکری کی درخواست لکھ کر سردار جی کو دے دی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب میں واپس جا کر انتظار کروں۔ وہ تمہارے پتے پر مجھے نوکری کی اطلاع کر دیں گے۔“

درگاوتی خوش ہو کر بولی۔

”بس سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ سردار جی میری بات کبھی نہیں ٹال سکتے۔ سمجھو کہ تمہیں نوکری مل گئی۔ تو کیا تم رام گڑھ میں رہو گے؟؟“

مجھے معلوم تھا کہ مجھے نوکری مل جانے کے بعد راج گڑھ کے ایٹمی ریسرچ محکمے کے کوارٹروں میں ہی رہنا پڑے گا۔ صرف ہفتے کی رات میں ریواڑی آسکوں گا۔ لیکن میں نے اسے یہی کہا کہ ایسا کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں ریواڑی اپنا مکان لے کر رہوں گا۔

یہاں سے روز رام گڑھ چلا جایا کروں گا۔ حالانکہ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ریواڑی سے دلی قریب تھا مگر راج گڑھ کافی فاصلے پر تھا اور رام گڑھ تو راج گڑھ سے بھی تھوڑا آگے صحرائی ٹیلوں میں واقع تھا۔ مگر اب درگاوتی میرے واسطے ایک ایسا امتحانی پرچہ تھی جس کے تمام سوالات میں نے حل کر کے جوابات کا پرچہ داخل دفتر کر دیا تھا۔ اگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی تھی تو صرف اتنی کہ اسے ہر ہفتے سردار ارجن سنگھ سوڈھی ملنے آتا تھا۔ اور سردار جی میرے باس تھے۔ اگر میں درگاوتی کو کسی بات سے ناخوش کرتا ہوں تو یہ میرے حق میں خطرناک بات ثابت ہو سکتی تھی۔ درگاوتی کا ایک اشارہ مجھے ایٹمی سنٹر کی نوکری سے الگ کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس وقت تک درگاوتی کو اپنے ہاتھ میں رکھنا تھا جب تک میں رام گڑھ کے زیر زمین ایٹمی مرکز میں دھماکہ نہیں کر لیتا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"درگا جی! تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میں جہاں بھی رہا تم سے ملنے ضرور آتا رہوں گا۔ تمہارے بغیر میں اب رہ ہی نہیں سکتا۔"

میں نے اسے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے۔ درگاوتی نے نوٹ ساڑھی کے اندر چھپائے اور مجھے گلے لگا لیا۔

میں اپنی داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ کو بتاتا ہوں کہ راجستھان کے اس خفیہ زیر زمین ایٹمی سنٹر میں مجھے نوکری مل گئی۔ میرا یہ مشن کامیاب ہو گیا۔ درگاوتی کی سفارش سے میرے راستے کی وہ مشکلات بھی دور ہو گئیں جو ایٹمی سنٹر میں پہنچنے کے بعد مجھے پیش آئیں۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ پیش آئی کہ میں ایٹمی انرجی کی ریسرچ کے بارے میں ذرا سا بھی عملی تجربہ نہ رکھتا تھا۔ میرے لئے وہاں کے آلات اور ساز و سامان بالکل اجنبی تھا۔ بہت جلد سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن سنگھ سوڈھی کو پتہ چل گیا کہ میرا پریکٹیکل علم صفر ہے۔ مگر درگاوتی کی وجہ سے وہ مجبور تھا۔ درگاوتی کے عشق میں سمجھ لیں یا اس کے جسم کے نشیب و فراز میں سردار جی کچھ ایسے گم ہو چکے تھے کہ وہ خود ہی میرے راستے کی رکاوٹیں دور کرتے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے شاندار زیر زمین آفس میں

ں روز بلا کر کہا۔

"مسٹر جسونت سنگھ! میں تمہارا کام دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم نے نقل مار کر کر فزکس میں فسٹ ڈویژن حاصل کی ہے۔ مگر میں تمہیں یہاں رکھنے پر مجبور ہوں۔ ب بات کان کھول کر سن لو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری نالائقی اور نکمے پن کا یہاں کسی کو م ہو۔ تمہیں جس ڈیوٹی پر لگایا جائے گا اس پر خاموشی سے کام کرتے رہنا۔ کسی سے اس ن کا ذکر نہ کرنا کہ تم فسٹ ڈویژن بی۔ ایس۔ سی پاس ہو۔ سمجھ گئے میں کیا کہہ رہا ہوں "

میں ہاتھ باندھ کر بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"گورو مہاراج! آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ جیسے آپ یں گے میں ویسے ہی کروں گا۔"

یک ہے۔ اب تم جاؤ۔"

میں ست سری اکال کہہ کر باہر نکل گیا۔

مجھے زیر زمین ایٹمی سنٹر کے سٹور میں لگا دیا گیا۔ میرا کام مختلف سیکشن کے باہر کشادہ نگ کی راہ داری میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے خالی چوکور اور گول گول پلاسٹک اور ی کے ڈبوں کو ٹرالی پر لاد کر ڈسپوزل سیکشن میں پہنچانا اور سٹور میں آئے نئے میٹریل ڈبوں کو مختلف سیکشن میں تقسیم کرنا تھا۔ سٹور کیپر جو بڑا سخت مزاج ہندو لالہ تھا مجھے ان دے کر ہدایت کرتا کہ یہ پیکج فلاں سیکشن میں جائے گا اور یہ پیکج فلاں سیکشن میں ۔ مجھے سیکشن کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں دروازے کے باہر ہی سامان کر آگے نکل جاتا۔ یہ ان شعبوں کا میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر ہی ان کے ازے کھلنے اور بند ہونے پر گہری نگاہوں سے جائزہ لے لیا تھا۔ اندر دیوار کے ساتھ ت تک سرخ سیاہ اور سبز رنگ کے گول چوکور میٹر اور خدا جانے کس کس طرح کے کے آلات لگے ہوئے تھے۔ ان کے آگے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے جہاں سائنس دان کوٹ پہنے بیٹھے مختلف بٹن دباتے اور تختی پر لگے کاغذوں پر کچھ نوٹ کرتے رہتے

تھے۔

مجھے ایٹمی سنٹر کے نچلی سطح کے ورکرز والے کوارٹروں میں ایک کوارٹر مل گیا تھا۔ یہ ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ چھوٹے سے صحن کی ایک جانب کچن اور غسل خانہ تھا۔ میں نے روز مرہ کے استعمال کی سب چیزیں لا کر وہاں رکھ دی تھیں۔ یہ کوارٹرز جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں راج گڑھ قصبے میں واقع تھے۔ اور ایٹمی سنٹر رام گڑھ میں وہاں سے دس گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ روزانہ سنٹر کی گاڑیاں ملازمین کو صبح لے جاتیں اور شام کو چھوڑ جاتی تھیں۔ کچھ کوارٹرز کوٹھی نما تھے۔ ان میں سائنس دان رہتے تھے۔ یہاں کبھی کسی بچے یا عورت کی آواز نہیں آتی تھی۔ کسی کو فیملی ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہفتے کی شام کو وہ لوگ جن کے بیوی بچے ریواڑی یا دلی میں رہتے تھے راج گڑھ سے چلے جاتے اور اتوار کی شام کو واپس آجاتے۔

میں پہلے ہفتے کہیں نہ گیا۔ میں وہاں رہ کر ماحول کا بھرپور جائزہ لینا چاہتا تھا۔ سنٹر میں میری طرح کے کام کرنے والے ایک دو نوجوان میرے واقف بھی بن گئے تھے مگر ہماری واقفیت صرف سلام دعا تک ہی تھی۔ کوئی کسی سے گھل مل کر بات نہیں کرتا تھا۔ رات کو بڑی جلدی کوارٹرز کی کالونی میں سناٹا چھا جاتا۔ اس ایٹمی سنٹر کی بابت انتہائی رازداری سے کام لیا جا رہا تھا۔ سوائے سنٹر کے سائنس دانوں اور ٹیکنیشنوں کے اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں بھارتی حکومت ایٹم بم بنانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ ان سب کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ سنٹر میں ایسے جنریٹر بنانے پر ریسرچ ورک ہو رہا ہے جن سے بہت زیادہ بجلی پیدا کر کے راجستھان کے صحرا کو گل و گلزار بنا دیا جائے گا۔

دوسرے ہفتے میں بھی سنٹر سے چھٹی کے بعد دلی روانہ ہو گیا۔ مجھے راستے میں درگاوتی کے پاس رکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ دلی رات کے دو بجے کے قریب پہنچا۔ جاتے ہی گل خان کو اٹھایا اور اسے ساری تفصیل سنائی۔ اس نے کہا۔

"ابھی تم یہیں آرام کرو۔ صبح پروفیسر جمشید کو بلاتا ہوں۔ وہی تمہیں بتا سکے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

باقی رات گل خان کے مکان پر ہی میں نے گزاری۔ صبح صبح گل خان نے مجھے نظام ہدین اولیاء" کی آبادی والے خالی مکان کی طرف روانہ کر دیا اور خود پروفیسر جمشید کو لینے ہل دیا۔ دن نکل آیا تھا کہ دونوں میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے پروفیسر کو ایٹمی سنٹر کی ک ایک تفصیل سمجھائی۔ میں نے اسے بتایا کہ سنٹر میں کل پانچ سیکشن ہیں۔ ہر سیکشن ں بجلی کے عجیب عجیب قسم کے چھوٹے اور بڑے آلات اور مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ہر یکشن میں صبح سے شام تک کام ہوتا رہتا ہے۔ کوئی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ ہر کوئی پنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ مجھے ان کمروں میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اگر ندر جانا ضروری ہوا تو میں کوئی ذریعہ پیدا کر لوں گا۔

پروفیسر جمشید بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ اس دوران وہ جیب سے رومال ال کر عینک کے شیشے صاف کرتا رہا۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ آنکھوں پر عینک ڑھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارا سنٹر کے ہر سیکشن میں جانا ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔ مجھے علوم ہونا چاہئے کہ وہاں کس شعبے میں کیا کام ہو رہا ہے اور پلوٹونیم صاف کرنے والا انٹ کہاں لگا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں مختلف شعبوں میں کسی نہ کسی طرح چلا جاؤں گا۔ مگر وہاں جو آلات اور مشینیں ہیں ان کی تفصیل میں تمہیں کیسے سمجھا سکوں گا؟ مجھے تو ان کے بارے میں کچھ بھی علوم نہیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ مجھے کوئی چھوٹے سے چھوٹا کیمرہ مہیا کیا جائے جو ہر شعبے کی یا جلدی اور بڑی صاف اور واضح تصویر اتار سکے۔"

پروفیسر جمشید نے ایک بار پھر اپنی عینک اتاری اور رومال نکال کر اس کے شیشے صاف رتے ہوئے بولا۔

"اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

یہاں گل خان نے بھی لقمہ دیا۔

"پروفیسر! یہ کام تم ہی کر سکتے ہو"۔

گل خان کو معلوم تھا کہ پروفیسر جمشید جس آفس میں کام کرتا ہے وہاں پیڑ پودوں کی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکو میٹری فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں اور پروفیسر کا ایسے سٹورز سے رابطہ رہتا ہے جہاں فلموں اور کیمرے کا ساز وسامان فروخت ہوتا ہے۔ پروفیسر جمشید نے کہا۔

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔ تم اگلے ہفتے آؤ گے تو میں نے تمہارے لئے کوئی نہ کوئی کیمرہ ضرور لا کر رکھا ہو گا"

میں اس روز یعنی اتوار کی شام کو دلی سے واپس راج گڑھ روانہ ہو گیا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس خفیہ ایٹمی سنٹر کا محل وقوع کیا ہے۔ ریت کی سڑک ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہاں رام گڑھ قصبے سے ذرا پہلے کھلے صحرا میں ریت کے اونچے اونچے دو ٹیلے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان ٹیلوں کی ریت پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہوئی تھی۔ یہاں وہ پرانی اور غیر اہم سی عمارت تھی جس کے باہر منرل ریسرچ سنٹر کا بورڈ لگا تھا۔ باہر ایک چپڑاسی سٹول پر بیٹھا اونگھتا یا بیڑی پیتا رہتا تھا۔ وہ صرف اس وقت ہوشیار ہو جاتا تھا جب ایٹمی سنٹر کے سائنس دان اور افسر وغیرہ عمارت میں داخل ہوتے تھے۔ عمارت کے اندر فرضی منرل ریسرچ سنٹر کے دو تین دفتر بنا دیئے گئے تھے جہاں شیلفوں میں بے معنی قسم کی فائلوں کے انبار لگے تھے۔ کمرے میں دو چار کلرک بیٹھے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ زیادہ وقت چائے پینے اور باتیں کرنے میں گزارتے تھے۔ کیونکہ ان کے آفس میں کوئی کام نہیں تھا۔ سارا کام نیچے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں ہوتا تھا۔ عمارت کے اندر کونے میں ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے میں ایک دروازہ تھا جس کی سیڑھیاں نیچے ایٹمی سنٹر کی بڑی راہ داری میں جا نکلتی تھیں۔ یہ دروازہ سٹیل کا تھا۔ باہر ایک چاق وچوبند پہرے دار ہر وقت موجود ہوتا تھا۔ سنٹر کے ہر ورکر اور افسر کے پاس اپنے اپنے پلاسٹک کے شناختی کارڈ تھے جنہیں وہ سنٹر میں آتے ہی اپنے اپنے سینے پر لگا لیتے تھے۔ سٹیل کا دروازہ کمپیوٹر کے ذریعے کھلتا تھا۔ ہر ورکر اپنا شناختی کارڈ دروازے کی

جانب دیوار میں لگے ہوئے چھوٹے سے کمپیوٹر میں ڈالتا۔ ہلکی سی آواز آتی۔ کارڈ باہر آتا اور دروازہ اپنے آپ کھل جاتا۔ اگر کوئی ورکر شناختی کارڈ ساتھ لانا بھول جاتا تو اس روز سنٹر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی اور اس کی دو دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی۔ سنٹر میں کام کرنے والوں کو سوائے دفتری کام کے اور کسی موضوع پر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں کوئی سگریٹ وغیرہ بھی نہیں پی سکتا تھا۔ ماچس لائٹر بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اوپر والے فولادی دروازے سے گزر کر نیچے زیر زمین سنٹر کی راہ داری والے گیٹ پر آتے تھے تو وہاں دو گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے ہوتے تھے۔ وہ ایک خاص راڈ کے ذریعے ہمارے لباس اور جسم کی تلاشی لیتے کہ کہیں ہم کوئی خطرناک قسم کی چیز یعنی پستول وغیرہ تو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے۔

سارا دن سنٹر میں قبرستان والی خاموشی چھائی رہتی۔ جب میں ٹرالی پر ساز وسامان لے کر کسی سیکشن کے دروازے کے سامنے سے گزرتا تو بند دروازے میں سے اندر بجلی کی مشینوں کے چلنے کی بڑی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب وہاں میرا دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ ہفتے کی شام کو میں اپنے ماتا پتا سے ملنے کا کہہ کر دلی روانہ ہو گیا۔ گل خان اور پروفیسر جمشید میرے انتظار میں تھے۔ پروفیسر نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اس میں ایک ایسی الہ دین کے چراغ والی شے ہے جو مجھے ایٹمی سنٹر کے اندر کا راز کھول کر بتا دے گی"

پھر اس نے ڈبیا کھولی۔ اس میں سے ایک ٹائی پن نکال کر مجھے دیا۔ یہ انگوٹھی کے سائز کا سنہری ٹائی پن تھا جس کے درمیان میں کالے رنگ کا چوکور نگینہ جڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے عینک کے شیشے صاف کرنے شروع کر دیئے تھے۔ کہنے لگا۔

"دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا ٹائی پن ہے جسے لوگ اپنی ٹائی پر لگاتے ہیں تاکہ ٹائی کے ساتھ چپکی رہے۔ مگر اس کے درمیان میں جڑا ہوا جو نگینہ تم دیکھ رہے ہو یہ طاقتور لینز والا کیمرہ ہے"۔

پھر اس نے عینک آنکھوں پر لگائی اور ٹائی پن اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے ٹائی پن کے
نگینے کے اوپر ذرا سا باہر نکلا ہوا ایک پیچ دکھایا۔

"جس وقت تم اس پیچ کو دباؤ گے نگینے میں لگا ہوا کیمرہ اپنا کام شروع کر دے گا اور
جہاں جہاں تم جاؤ گے ان جگہوں کی تصویریں لیتا جائے گا۔ اس سے زیادہ مختصر اور کار آ
کیمرہ شاید مجھے کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ تم اسے اپنی ٹائی پر تھوڑا اوپر کر کے لگا لینا۔"

پروفیسر جمشید نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اب مجھے ایٹمی سنٹر کے مختلف سیکشن کے
نقشے تیار کرنے اور ان کے آلات کی تفصیلات یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اگ
کی شام کو اپنی ڈیوٹی پر واپس آگیا۔ خفیہ کیمرے والا ٹائی پن میں نے وہیں سے اپنی ٹائی کے
ساتھ لگا لیا تھا۔ زیر زمین سنٹر میں جانے کے بعد ہمیں سفید کوٹ پہننا پڑتے تھے۔ ہم اپ
جرسیاں یا کوٹ وغیرہ اتار کر دروازے کے ساتھ والے کلوک روم میں رکھ دیتے او
وہاں ٹنگے ہوئے اپنے سفید کوٹ پہن لیتے تھے اور سروں پر سفید گاندھی کیپ پہ
لیتے تھے۔ میں چونکہ سکھ کے بھیس میں تھا۔ اس لئے مجھے ٹوپی نہیں پہننی پڑتی تھی۔ البتہ
میں نے ایک سفید پگڑی ضرور خرید لی تھی جسے میں ایٹمی سنٹر میں اپنی ڈیوٹی کے وقت پہن
لیتا تھا۔

سٹیل کے دروازے پر شناختی کارڈ کمپیوٹر میں ڈال کر دروازہ کھولنے سے پہلے ایک
الیکٹرانک راڈ ہمارے جسم کے آگے پیچھے پھیرا کر ہماری چیکنگ ہوتی۔ کہ ہم کوئی چیز چھپا
کر تو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے۔ جس روز میں ٹائی پن لگا کر سنٹر میں داخل ہونے لگا
تو حسب معمول الیکٹرانکس راڈ میرے جسم کے آگے پیچھے پھیرا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹائی
پن دھات کا بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے کمپیوٹر میں ٹیں ٹیں کی آواز ضرور آئے گی۔
لیکن اس بات کا پروفیسر جمشید کو پہلے سے علم تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے جو ٹائی پن دیا تھا وہ
یقیناً پلاسٹک کا تھا۔ میں چیکنگ کے مرحلے سے روز کی طرح بخیر و خوبی نکل گیا۔ اب میرے
سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ایٹمی سنٹر کے جو پانچ شعبے اور پانچ کمرے تھے اور جہاں مختلف قسم
کے آلات لگے تھے ان کے اندر کس طرح جایا جائے۔ پروفیسر جمشید نے مجھے خاص طور پر

کی تھی اور کہا تھا۔

"تصویریں مجھے ان سیکشنوں کے اندر لگے ہوئے آلات کی چاہئیں۔ تاکہ مجھے علم ہو
کہ کون سا پلانٹ کہاں پر نصب ہے۔ اور کس پلانٹ میں اگر بم لگایا جائے تو اس کے
ے سارے کا سارا زیر زمین ایٹمی سنٹر دھماکے سے اڑ جائے گا۔"

مصیبت یہ درپیش تھی کہ ان پانچوں کمروں میں سوائے سنٹر کے سائنس دانوں اور
ماہرین کے اور کسی ورکر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر سیکشن کے بند
زے پر ایک باوردی گارڈ سٹین گن لئے کھڑا ہوتا تھا۔ کسی وقت اتفاق سے میں ٹرالی
ان لے کر وہاں سے گزرتا اور کسی سائنس دان کے اندر آنے جانے سے دروازہ
اور بند ہوتا تو میری نظر اندر پڑ جاتی تھی۔ مجھے بھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔
نے سنٹر کے کسی دوسرے ورکر کو بھی کبھی ان خفیہ آلات والے کمروں میں آتے
نہیں دیکھا تھا۔

میرے ذہن نے بڑی تیزی اور یکسوئی سے ان کمروں میں داخل ہونے کی
وں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور اس کے بغیر میرا کمانڈو
یہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ زیر زمین ایٹمی سنٹر زمین کے اندر کافی جگہ
ہوئے تھا۔ آمنے سامنے کمرے تھے۔ درمیان میں کشادہ راہ داری تھی جس کی
ت پر بجلی کے بلب سارا دن روشن رہتے تھے۔ ماحول میں ایک لمحے کے لئے بھی
احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت فضا تازہ رہتی تھی۔ ایئر کنڈیشنگ کی وجہ سے
بھی رہتی تھی۔

ل سیکشن کا کمرہ راہ داری کے درمیان میں تھا میں نے ایک دو بار اس کمرے میں
ا پتلی عینک پوش عورت کو سفید کوٹ پہنے اندر جاتے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ ایک بار
کمرے کے سامنے سے ٹرالی پر سامان رکھے گزر رہا تھا تو دروازہ کھل گیا اور میں
اوہ دبلی پتلی سانولے رنگ کی عورت کمرے میں کاؤنٹر کے پاس بیٹھی کام کر رہی
سانے سوچا کہ اس عورت سے دوستی کرنی چاہئے۔ ہر سکتا ہے کمرے میں داخل

ہونے کا کوئی موقع مل جائے۔ مصیبت یہ تھی کہ وہاں کسی کو کسی سے فالتو بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر کوئی منہ میں گھنگنیاں ڈالے رہتا تھا۔ کسی چیز کے بارے میں پوچھو تو دو لفظی بات ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

میں نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ وہ دبلی پتلی سائنس دان عورت ایٹمی کالونی کے ایک کوٹھی نما کوارٹر میں اکیلی رہتی ہے۔ خود ہی کھانا پکاتی ہے اور اتوار کی چھٹی والے دن بھی کہیں نہیں جاتی۔ میں نے ایک منصوبے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ویسے بھی عورتوں سے دوستی کرنے میں میں بڑا ماہر تھا۔ مگر یہ عورت سائنس دان تھی۔ بالکل سپاٹ جسم تھا۔ بے رونق چہرہ تھا۔ شکل پر ہر وقت ایک فنا آلود اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ میں نے کبھی اسے کسی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے سوائے وہاں مجھے ان کمروں میں داخل ہونے کا اور کوئی وسیلہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں اس بے رنگ وبو قسم کی عورت کے ٹھنڈے بدن میں زندگی کی حرارت پیدا کر کے اس سے دوستی استوار کر لیتا ہوں تو کسی وقت کم از کم اس سے کوئی ضروری بات کرنے کے بہانے ہی میں اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کمرے کی تصویریں لے سکتا ہوں۔ کسی سائنس دان سے مجھے اس کمزوری کی امید نہیں تھی۔ ایک عورت ہی یہاں میرے کام آسکتی تھی۔

اس دوران میں نے اس سائنس دان عورت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کا نام نرملا دیوی تھا۔ وہ جے پور راجستھان کی رہنے والی تھی۔ نیوکلر سائنسز میں اس نے ایم۔ایس۔سی کیا ہوا تھا۔ ماں باپ بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ ایک بھائی تھا جو بمبئی میں کاروبار کرتا تھا۔ نرملا دیوی اسی لئے ہفتے اتوار کو بھی کہیں باہر نہیں جاتی تھی اور اپنے کوارٹر میں ہی رہتی تھی۔ میں شام کے وقت سیر کے بہانے کالونی میں نکل آتا۔ عجیب بات تھی وہاں سارے لوگ سینٹر سے واپس آکر اپنے اپنے کمروں میں جیسے بند ہو جاتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی سائنس دان یا ورکر اپنی رہائش گاہ کے صحن میں پودوں کو پانی وغیرہ دیتا نظر آجاتا۔ یہ لوگ راج گڑھ سے قریبی رام گڑھ کے قصبے سے

ہفتے بھر کا راشن خرید کر لے آتے تھے اور اس کے بعد کمروں میں بند ہو جاتے تھے۔ اس کالونی کے پراسرار لوگوں سے میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ بہرحال کالونی میں کمروں سے باہر نکلنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ میں شام کے وقت یا چھٹی کے دن نرملا دیوی کے کوارٹر کے گرد دو ایک چکر لگانے لگا۔ ایک طرح سے میں نے اس کی نگرانی شروع کر دی تھی کہ وہ کس وقت کیا کر رہی ہوتی ہے اور اس کے مشاغل کیا ہیں۔ مگر یہ سائنس دان عورت سب سے زیادہ تنہائی پسند تھی۔ کبھی میں نے اسے شام کے وقت یا چھٹی والے دن کبھی کمرے سے باہر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس کوئی نوکرانی بھی نہیں تھی۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ عورت میرے کام آسکتی ہے۔ صرف ایک بار اس سے ملنے کے سامنے بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے کی دیر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس پر اپنا اثر ڈال لوں گا۔ ایک روز میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں سنٹر سے چھٹی کے بعد اپنے کوارٹر میں آنے کی بجائے راج گڑھ کے بڑے بازار میں آگیا۔ یہاں مٹھائیوں کی ایک بڑی اچھی دکان تھی۔ وہاں سے میں نے ایک سیر مٹھائی کا ڈبہ لیا اور اپنی کالونی کی طرف چل پڑا۔ سائنس دان نرملا دیوی کے کوٹھی نما کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ وہاں سب کوارٹروں کے دروازے بند ہی رہتے تھے۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ کسی کے دروازے پر کال بیل نہیں لگی تھی۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد اندر سے کسی عورت کی نیم مردہ سی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے اردو میں کہا۔

"نرملا جی میں ہوں۔ جسونت سنگھ آپ کے ساتھ ہی سنٹر میں کام کرتا ہوں"

چار پانچ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اندر سے پھر اس عورت نے انگریزی میں پوچھا۔

"کس لئے آئے ہو؟"

میں نے بھی اس بار انگریزی میں جواب دیا۔

"میڈم! میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک ضروری چیز لایا ہوں۔ پلیز

مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔"

میں نے پتہ کرلیا تھا۔ وہ ماگھ کے دیسی مہینے کی سولھویں تاریخ تھی۔ مزید دس سیکنڈ کے وقفے کے بعد دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میرے سامنے دبلی پتلی سائنس دان عورت نرملا دیوی سفید ساڑھی اور سفید کوٹ پہنے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھر پر بھی دفتر والا لباس پہن رکھا تھا۔ صرف سر پر سفید گاندھی کیپ نہیں تھی۔ میں نے عورتوں پر اثر ڈالنے والی اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بڑی شستہ انگریزی میں کہا۔

"میڈم! میری ماتا جی ماگھ کی سولھویں کو گورو ارجن دیو جی کا پرشاد دیا کرتی ہیں میری ماتا جی تو یہاں نہیں ہیں۔ ان کی جگہ میں یہ پرشاد آپ کے لئے لایا ہوں۔ آپ کے پاس پرشاد لانے کی خاص وجہ یہ ہے میڈم کہ یہ پرشاد ماتا جی صرف عورتوں اور بچوں میں ہی بانٹتی ہیں۔ کسی مرد کو یہ پرشاد نہیں دیا جاتا۔ پلیز! اسے قبول کرلیجئے۔"

نرملا دیوی کے چہرے کے تاثرات میں ذرے جتنا بھی تغیر نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل سپاٹ چہرہ اٹھائے بے جان آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے لگا کہ یہ ایٹم کی بنی ہوئی عورت ہے میں نے اپنی باتوں میں ایک سیکنڈ کا بھی وقفہ نہ ڈالا اور مٹھائی والا ڈبہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پلیز! اسے سوئیکار کریں۔ کالونی میں صرف آپ ہی ایک خاتون ہیں۔ ویسے بھی میں آپ کے سنجیدہ مزاج اور کلاسیکل خدوخال سے بڑا متاثر ہوں۔"

اس آخری جملے نے تھوڑا سا کام دکھایا۔ اس نے ڈبہ لے لیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ مجھے اندر آنے کے لئے کہے گی۔ مگر اس نے شکریہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اپنے دل میں اسے ایک واہیات سی پنجابی زبان میں گالی دی اور اپنی ڈاڑھی کو ایک ہاتھ سے اوپر چڑھاتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ سکھ نوجوان کا بھیس بدلنے کے بعد میری کچھ عادتیں بھی سکھوں والی ہوگئی تھیں۔ مثلاً زبان پر پہلے سے زیادہ گالیاں آتی تھیں اور مجھے بات کرتے ہوئے انہیں روکنا پڑتا تھا۔ تھوڑی

تھوڑی دیر بعد سکھوں کی طرح مجھے ڈاڑھی کو ہاتھ سے اوپر چڑھانے کی بھی عادت پڑ گئی تھی۔ اپنے کوارٹر میں آکر میں نے بھی اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا اور اس عورت پر کسی دوسری طرف سے حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس عورت کو انگریزی بولنے کا بڑا شوق ہے۔ میں دلی سے ایک انگریزی کی کتاب خرید کر لایا تھا جو اس وقت بالکل نئی کی نئی میرے پاس پڑی تھی۔ یہ کسی انگریز مصنف کا ناول تھا اس کا نام مجھے اچھا لگا میں نے خرید لیا۔ ابھی میں نے اس پر اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ دو دن بعد میں شام کے وقت ایک بار پھر سائنس دان عورت نرملا دیوی کے ہاں پہنچ گیا۔ حسب معمول دروازہ بند تھا۔ کچھ ڈرتے ڈرتے دستک دی۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد اندر سے وہی مردہ سی آواز آئی۔ یہ سائنس دان نرملا دیوی کی آواز تھی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور جلدی سے انگریزی میں ہی کہا۔

"میں تمہارے لئے ایک خوبصورت تحفہ لایا ہوں"

شاید تحفے کا سن کر یا خدا جانے اس کے دل میں کیا خیال آگیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ آج پھر اس کے دروازہ کھولتے ہی مجھے ڈی ٹول کی ہلکی ہلکی بو محسوس ہوئی۔ اس نے آج بھی سفید کوٹ ساڑھی کے اوپر پہنا ہوا تھا۔ سر کے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا بنا کر پیچھے باندھ رکھے تھے۔ میں یہ آپ کو بتاتا چلوں کہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی بیس بائیس سال ہو گی مگر وہ اپنی عمر سے دس سال بوڑھی لگتی تھی۔ جسم بالکل سپاٹ تھا۔ چہرے پر آج بھی ایسی مردنی چھا رہی تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی رشتے دار کو دفن کر کے آئی ہو۔ میں نے فوراً کتاب کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا اور جتنی اعلیٰ قسم کی انگریزی بول سکتا تھا بولتے ہوئے کہا۔

"میڈم! یہ انگریزی ناول ہے۔ اس کا نام بہت خوبصورت ہے۔ مجھے امید ہے تم اسے پسند کرو گی۔"

پتہ نہیں کیسے اس کا دل تھوڑا موم ہوا۔ اس نے کتاب کا پیکٹ لیا اور اس پر میں نے سبز رنگ کا کاغذ چڑھایا تھا اسے کھولنے لگی۔ مجھے برابر اس کی طرف سے ڈی ٹول کی بو آرہی تھی۔ اس کے جسم سے چاہے مگرمچھ کی بو آتی۔ میں اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ میرے زیر زمین ایٹمی کمانڈو مشن کی یہی ایک امید نظر آرہی تھی۔ کیونکہ میں نے وہاں دیکھا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے مختلف شعبوں کے جو پانچ کمرے تھے اور جن کے باہر گارڈ موجود رہتا تھا وہاں کام کرنے والے خود کسی کو بلانا چاہیں تو وہ انہیں بلا سکتے تھے لیکن اس دوران گارڈ اس آدمی کے ساتھ اندر جاتا تھا۔ مجھے تو صرف سیکشن کے اندر جانا تھا اور پھر میرے ٹائی پن میں لگے ہوئے کیمرے نے پلانٹ کے تمام آلات کی تصویریں اتارنی شروع کر دینی تھیں۔ اس کے بعد میں دوسرے سیکشن کی تصویریں اتارنے کے متعلق بھی کوئی ترکیب سوچ سکتا تھا۔ مگر سب سے پہلے اس سیکشن میں داخل ہونا چاہتا تھا جہاں یہ سائنس دان عورت کام کرتی تھی۔ اس عورت کو میں کسی مرد سائنس دان کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے ورغلا سکتا تھا۔

کتاب کا کاغذ ہٹا کر اس نے اس کے سرورق کو دیکھا اور بے جان آواز میں بولی۔

”کتاب کا نام اچھا ہے“

میں نے گویا پتھر کو جونک لگالی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ اس کالونی میں کسی خوبصورت عورت سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں۔ یہ تو برہم چاریوں کی گپھا معلوم ہوتی ہے۔“

اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر نیم مردہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر انگریزی میں کہا۔

”آجاؤ“

میں اندر چلا گیا۔ اس کے پاس دو کمروں کا کوارٹر تھا۔ یعنی وہی کوارٹر نما کوٹھی۔ کمرے میں ہر طرف عجیب بدنظمی اور افراتفری نظر آئی۔ صوفوں میزوں اور پلنگ پر میلے کپڑے اور مختلف چیزیں پڑی تھیں۔ جو شے غسل خانے میں رکھنے والی تھی وہ کھانے کی

میز پر پڑی تھی۔ دیوار پر مہاتما گاندھی کی تصویر لگی تھی جو ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ کوئی صوفہ کوئی کرسی ایسی نہیں تھی جس پر پرانے کپڑے یا کوئی برتن وغیرہ نہ پڑا ہو۔ مجھے بیٹھنے کو جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر میرا وہاں کچھ دیر بیٹھنا ضروری تھا۔ پلنگ کا کونا ذرا سا خالی تھا۔ میں وہاں بیٹھنے لگا تو سائنس دان نرملا دیوی جو دروازہ بند کر کے اس کے پاس ہی کھڑی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی وہیں سے بولی۔

”بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے“

میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ وہ وہیں سے بولی۔

”تمہیں معلوم نہیں ہم لوگ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ آئندہ میرے ہاں نہ آنا۔ اب تم جاؤ۔“

میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ مجھے اس عورت سے کام نکالنا تھا۔ میں نے فوراً انگریزی میں ہی کہا۔

”مگر میڈم مجھے تمہارا کمرہ بہت اچھا لگا ہے۔ یہ تمہاری ہی طرح بڑا چارمنگ ہے مجھے اجازت دو کہ میں یہاں دو ایک منٹ بیٹھ کر تم سے باتیں کر سکوں“

وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ لگا بلب روشن تھا۔ یہ کمرے میں صرف ایک ہی بلب تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے سفید کپڑوں میں ملبوس چھوٹے سے جوڑے والی سپاٹ جسم کی وہ عورت کوئی بھوت پریت لگ رہی تھی جو کسی قبر میں سے نکل کر وہاں آگئی ہو۔ اس نے کتاب بند کی اور ایک کرسی پر سے میلے کچیلے کپڑے نیچے گرا کر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی اور گردن ٹیڑھی کر کے گھورنے لگی۔

”اچھا“ وہ انگریزی بول رہی تھی۔ ”تو تمہیں مجھ سے باتیں کرنے کا بڑا شوق ہے۔ تم بالکل سکھ ہو۔ مجھے سکھوں کی یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ اکھڑ ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ اگر تم کو مجھ سے باتیں کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اس وقت یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔“

میں کچھ کہنے لگا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"جاؤ۔"

میں اپنا سامنہ لے کر واپس چلا آیا۔

دو دن گزر گئے۔ میں ایک بار پھر سائنس دان عورت کے گھر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ تیسرے دن کی بات ہے میں صبح ایٹمی سنٹر کی زیر زمین جانے والی سیڑھیاں اتر کر دوسرے کارکنوں کے ساتھ سفید کوٹ پہنے کلوک روم میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے وہاں لوہے کی الماریوں کے پاس کھڑی ساڑھی کے اوپر سفید کوٹ پہن رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو باہر نکلتے ہوئے میرے قریب آکر اتنا کہہ کر باہر نکل گئی۔

"رات کے ایک بجے آنا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔"

میں ہکا بکا سا ہو کر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ مجھے اتنی بڑی کامیابی کی ہرگز امید نہ تھی۔ سارا دن رات کے انتظار میں گزر گیا۔ سنٹر میں ساز و سامان کی ٹرالی بھی ادھر سے ادھر ڈھوتا رہا اور سوچتا بھی رہا کہ آخر اس کے دل میں میرے لئے اتنی محبت کیسے پیدا ہو گئی کہ اس نے مجھے خود رات کے ایک بجے گھر پر بلا لیا۔ رات کو ایک بجے بلانے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے اپنا کمانڈو مشن کامیاب ہوتا نظر آنے لگا۔

سنٹر سے چھٹی کے بعد انسٹی ٹیوشن کی ویگن میں بیٹھ کر اپنی کالونی میں آگیا۔ بڑی مشکل سے شام ہوئی۔ پھر کہیں رات ہوئی۔ اب رات کا ایک نہیں بج رہا تھا۔ کبھی رسالہ پڑھتا۔ کبھی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ عورت مجھے پھنسانے کی کوئی سازش تو نہیں کر رہی؟ پھر سوچا کہ اگر اس نے کوئی سازش کرنی ہوتی تو اپنے گھر میں نہ کرتی۔ میں نے اس منفی خیال کو دل سے نکال دیا۔ بڑی مشکل سے رات کے بارہ بجے۔ پھر ساڑھے بارہ بجے۔ میں نے نسواری رنگ کی قمیض اور اسی رنگ کی پتلون پہن لی تھی تاکہ اندھیرے میں آسانی سے نظر نہ آسکوں۔ میرے سر پر جو پگڑی تھی اس کا رنگ بھی گہرا تھا۔ کمر کے ساتھ میں جو سکھوں والی کرپان لٹکائے رکھتا تھا وہ بھی میں نے اتار کر کھونٹی کے ساتھ لٹکا دی تھی۔

ٹھیک ایک بجے میں اپنے کوارٹر کے پچھلے دروازے سے نکلا اور سائنس دان عورت

ملا دیوی کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ کالونی میں رات کو زیادہ روشنیاں کرنے کی اجازت ہیں تھی۔ کسی کسی کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی سب طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ ائنس دان عورت کا کوارٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ میں سامنے سے آنے کی بجائے اس کے ب سے ہوتا ہوا سامنے والے برآمدے میں آگیا۔ برآمدے میں گھپ اندھیرا تھا۔ رے کے روشندان پر بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا دھکیلا۔ روازہ کھل گیا۔ اس نے دروازہ کھلا رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس کی نڈے بے جان لہجے والی آواز آئی۔ وہ اس وقت بھی انگریزی بول رہی تھی۔

"دروازہ بند کر کے بولٹ لگا دو"

میں نے ایسا ہی کیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو گئی۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر یا تھا۔ ٹیبل لیمپ گہرے شیڈ والا تھا اور بلب بھی بہت کمزور لگا تھا جس کی وجہ سے کمرے یں عجیب قسم کی آسیبی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ٹیبل لیمپ کے س وہی انگریزی کا ناول رکھا ہوا تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ل کھلے تھے جو بڑے مختصر تھے۔ وہ ان کا جوڑا بنانے لگی۔ کمرے کی فضا میں وہی ڈی ٹول ی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ہسپتال کے آپریشن روم میں آگیا ا۔

اس نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"یہاں آکر بیٹھ جاؤ"

میں پلنگ پر بیٹھنے لگا تو اس نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"یہاں نہیں۔ کرسی پر بیٹھو"

پلنگ کے پاس ہی کرسی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑا عمدہ اور قیمتی پرفیوم لگایا ا تھا۔ اس نے ناک سکیڑ کر پوچھا۔

"یہ عطر تم لگا کر آئے ہو؟"

میں نے احمقوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔

"یس میڈم!"

وہ گردن پر اپنے تھوڑے سے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔

"پرفیوم مت لگایا کرو۔ ڈی ٹول لگایا کرو۔ یہ جراثیم کو ڈی انفیکٹ کرتی ہے۔"

اس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے میز پر سے میرا دیا ہوا ناول اٹھایا۔ اس کو کھولا۔ پھر زور سے بند کر کے مجھ سے بڑے تلخ لہجے میں کہنے لگی۔

"تم اتنے فحش ناول پڑھتے ہو؟ اگر تم پڑھتے ہو تو پڑھو۔ مجھے کیوں دیا تھا؟ کیا تم نے یہ ناول پڑھا ہے؟"

میں سخت ندامت محسوس کرنے لگا۔

"نہیں میڈم"

وہ کتاب کے ورق الٹنے پلٹنے لگی۔ پھر ایک جگہ کتاب کھول کر میری طرف بڑھائی اور کہا۔

"ذرا اسے پڑھو"

میں جھک کر ٹیبل لیمپ کی کمزور روشنی میں پڑھنے لگا۔ مائی گاڈ! کتاب واقعی بڑی واہیات تھی۔ میں تو سخت پریشان ہوا۔ یہ عورت تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مجھے اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھرتا محسوس ہوا۔ میں نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے سخت افسوس ہے میڈم۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کتاب اتنی واہیات ہو گی پلیز میری معذرت قبول کریں"

یہ جملہ میں نے اردو زبان میں کہا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سائنس دان عورت مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مگر مجھے یہ کتاب بہت اچھی لگی ہے یہاں میرے قریب آجاؤ۔"

اس کے بعد ہماری پیار محبت کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ڈی ٹول کی بو میرے قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ میں اس کے ساتھ جو پیار محبت کی باتیں کر رہا تھا وہ بالکل جھوٹی باتیں تھیں۔ مگر یہ باتیں میں اس لئے کر رہا تھا کہ یہ میرے کمانڈو مشن کا ایک حصہ

ئیں۔ آگے چل کر آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ باتیں کتنی ضروری تھیں اور اگر ں اس سے یہ باتیں نہ کرتا۔ اگر اس کے ساتھ جھوٹی اور نقلی محبت کا اظہار نہ کرتا تو میں پنے مشن میں شاید کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

اس رات میری اور اس سائنس دان عورت نرملا دیوی کی دوستی پکی ہو گئی۔ اب برا یہ معمول بن گیا کہ ایک رات چھوڑ کر میں رات کے ایک بجے کے بعد اس کے پاس ہنچ جاتا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس آجاتا۔ اس دوران باتوں ہی باتوں میں نے پتہ چلا یا کہ کچھ دنوں سے ایٹمی سنٹر میں سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور ایٹمی پلانٹ اور ساز سامان والے سیکشنوں میں کوئی کارکن سنٹر کے کسی بھی کارکن کو جس کا کسی دوسرے ئبے سے تعلق ہو اپنے کمرے میں نہیں بلا سکتا تھا۔

"مگر جسونت! تم ہمارے کمرے میں آکر کیا کرو گے۔ وہاں سوائے کمپیوٹر اور ایٹمی شینری کے ضروری آلات کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے تم کیا دیکھو گے"

میں نے کہا۔

"بس میری خواہش تھی کہ دیکھوں ایٹم بم کیسے بنتا ہے"

وہ ہنس پڑی۔ اب وہ ہنسنے بھی لگی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم نے تو سائنس پڑھی ہوئی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ ابھی تو ہم نے ٹمی دھماکہ بھی نہیں کیا۔ ابھی تو ہم ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں دن کے وقت تھوڑی دیر کے لئے اندر آکر مشینوں کو یکھوں۔ مجھے انہیں دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں جسونت سنگھ تم اب تو بالکل ہی ہمارے کمرے میں نہیں آسکتے"

میں نے کہا۔

"کیا آفس ٹائم کے بعد بھی میں اندر نہیں جا سکتا؟"

اس سوال سے میرا ایک خاص مقصد تھا۔ نرملا دیوی نے کہا۔

"آفس ٹائم کے تو فوراً بعد سارے کمروں کو تالے لگ جاتے ہیں اور ان کی چابیاں گیٹ پر رات کو پہرہ دینے والا گارڈ اپنے پاس رکھتا ہے۔ صرف ایک ایک ڈپلی کیٹ چابی ہر سیکشن کے انچارج کے پاس رہتی ہے۔ میں اپنے سیکشن کی انچارج ہوں اس لئے ایک ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ایمرجنسی پڑسکتی ہے۔"

جس مقصد کے لئے میں نے اس سائنس دان عورت سے سوال پوچھا تھا وہ مقصد مجھے حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے جو سکیم سوچی تھی اس کے لئے اس عورت کے پاس جو چابی تھی اسے اڑانا بہت ضروری تھا۔ مگر ایک نقطہ ابھی حل طلب تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے اب سنٹر دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں ہے اور میں صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ میں اس عورت سے پیار محبت بھی کئے جا رہا تھا۔ اس پیار محبت نے اس یخ بستہ عورت کی پرفیس پگھلانا شروع کر دی تھیں اور عقل کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا۔ جبکہ میں پوری طرح اپنے آپ میں تھا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

"ہر سیکشن کی چابی الگ ہوتی ہوگی۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے تو ایک دم سے سارے کمرے نہیں کھولے جاسکتے گارڈ کو ایک ایک کمرے کی چابی تلاش کر کے لگانی پڑے گی۔ یہ سیکورٹی کے خلاف بات ہے"

نرملا دیوی پہ ایک عجیب سرور کی کیفیت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔ سارے سیکشنوں کو ایک ہی چابی لگتی ہے۔ مگر تم یہ کیا بکواس لے بیٹھے ہو؟"

"آئی ایم سوری نرملا جی۔ آئی ایم سوری۔ میں تو صرف نیشنل سیکورٹی کی وجہ سے پوچھ رہا تھا۔"

اس کے بعد میں نے عملی بکواس شروع کر دی جو بہت ضروری تھی۔ نرملا دیوی پر میں نے اپنا بھرپور اثر جما لیا تھا۔ پہلے میں ہفتے میں ایک دو بار رات کو اس کے کوارٹر میں

تا تھا۔ اب میں نے ایک دن چھوڑ کر جانا شروع کر دیا۔

چونکہ کالونی میں لوگ رات کو اپنے اپنے کوارٹروں میں بند ہو جاتے تھے اس لئے رے لئے آدھی رات کو نکل کر اندھیرے میں سائنس دان عورت کے کوارٹر میں گھسنا ئی مشکل کام نہیں تھا۔ پھر بھی میں بے حد احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اس دوران میں نے لوم کر لیا کہ نرملا دیوی اپنے سیکشن کی ڈپلی کیٹ چابی کچن میں شیلف کے اوپر مٹی کے ک گلدان میں رکھتی تھی۔ ایک رات میں وہاں سے چابی نکال کر لے آیا۔ راج گڑھ ے قصبے میں ایک تالے چابیاں بنانے والے کی دکان تھی۔ ہفتے کی رات کو میں چابی اڑا لایا تھا۔ اتوار کی صبح کو میں چابی لے کر دکاندار کے پاس گیا اور اسے کہا کہ مجھے ایک دو نٹوں میں اس چابی کی ایک ڈپلی کیٹ چابی تیار کر دے۔ میں نے پچاس روپے نکال کر ی وقت اس کو دے دیئے۔

پچاس روپے دیکھ کر دکاندار نے باقی کام چھوڑ دیا اور بولا۔

"سردار جی! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں ابھی اس کی نقل بنا دیتا ہوں"

آدمی کاریگر بھی تھا۔ اس نے آدھے گھنٹے میں مجھے بالکل اسی طرح کی ایک دوسری بی بنا کر دے دی۔ میں نے ایسا کیا کہ دکاندار کی بنائی ہوئی چابی نرملا دیوی کے کچن کے ان میں رکھ دی اور اصلی ڈپلی کیٹ چابی اپنے پاس رکھ لی۔ اس خیال سے کہ کہیں ن وقت پر دکاندار کی بنائی ہوئی چابی تالے میں لگنے سے انکار نہ کر دے۔

میرے سیکرٹ کمانڈو مشن کا پہلا مرحلہ بھارت کے اس زیر زمین خفیہ ایٹمی مرکز میں ائی حاصل کرنا تھا۔ دوسرا سائنس دان عورت سے دوستی کر کے اس سے چابی حاصل تھا۔ یہ دونوں مرحلے کامیابی سے طے ہو گئے تھے۔ اب مجھے تیسرے مرحلے پر کام ع کرنا تھا۔ یہ مرحلہ پہلے دونوں مرحلوں سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا تھا۔ اس اک مرحلے پر عمل کرتے ہوئے مجھے چھپ کر ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں جا کر کے ایٹمی آلات اور ساز وسامان کی تصویریں اتارنی تھیں۔ میں نے اپنے ذہن میں جو بنائی تھی اس کے مطابق مجھے رات کے وقت جب سنٹر کے تمام سیکشن اور لیبارٹریاں

بند کر دی جاتی ہیں اور وہاں کوئی نہیں ہوتا اس وقت وہاں جا کر ایک ایک کر کے پانچوں کمروں کو کھولنا اور اندر لگے ہوئے آلات کی تصویریں بنانا تھیں۔ یہ کام میں چھٹی کے بعد سنٹر سے نکلنے کے بعد نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے معلوم کر لیا تھا۔ رات کے وقت زیر زمین سنٹر کے باہر گارڈز کا زبردست پہرہ لگ جاتا ہے۔ منرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ والا مین گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا جاتا ہے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس کے لئے میرا آفس ٹائم کے بعد سنٹر کے خفیہ تہہ خانے میں رہ جانا ضروری تھا۔ میں اس بات کا بھی جائزہ لے چکا تھا کہ چھٹی کے بعد ورکروں کی کوئی گنتی یا چیکنگ نہیں ہوتی تھی۔ یوں اگر چھٹی ہونے کے بعد کوئی ورکر اگر اندر رہ بھی جائے تو گیٹ پر گارڈ کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ سیکورٹی کے نظام کی بہت بڑی خامی تھی۔ لیکن یہ خامی میرے حق میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ میں نے اس امر کی بھی تصدیق کر لی تھی کہ اندر صرف ایک ہی الارم لگا تھا جو آگ لگنے کی صورت میں شور مچاتا تھا۔ ایسا کوئی الارم نہیں تھا کہ اگر لیبارٹری کے دروازے کو کھولا جائے یا وہاں کسی ڈائیل یا دوسری کسی مشینری کو ہاتھ لگایا جائے تو الارم چیخ اٹھے۔ یہ ان لوگوں کی نالائقی تھی کہ انہوں نے ایسا انتظام نہیں کیا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ صبح آفس ٹائم پر سنٹر میں داخل ہوتے ہوئے ورکروں کی چیکنگ بہت سخت ہوتی تھی مگر ان کی گنتی نہیں ہوتی تھی۔ یعنی اگر کوئی ورکر کسی روز کام پر نہیں آتا تھا تو گیٹ پر ڈیوٹی دینے والوں کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ سیکورٹی کی اس ایک غفلت یا کمزوری نے بھی میری راہ ہموار کر دی تھی۔

مجھے اب کسی ایک رات کا انتخاب کرنا تھا جس رات کو مجھے آفس ٹائم کے بعد زیر زمین ایٹمی سنٹر سے باہر نہیں نکلنا تھا بلکہ وہیں کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جانا تھا۔ چھپ کر بیٹھنے کے لئے میں نے کافی دیکھ بھال کرنے کے بعد ایک جگہ چن لی تھی۔ یہ جگہ ایٹمی سنٹر کا کلوک روم تھا۔ یعنی وہ کمرہ جہاں ہر سائنس دان ٹیکنیشن ورکر زیر زمین سنٹر میں داخل ہونے کے بعد جا کر اپنا کوٹ اتار کر ایک لمبے کلوزٹ میں ٹانگ دیتا تھا اور دوسرے کلوزٹ سے ڈاکٹروں والا سفید کپڑے کا بنا ہوا کوٹ اتار کر پہن لیتا تھا۔ میں اس کلوزٹ کو استعمال

ر سکتا تھا۔ وہاں دن کے وقت کبھی کوئی پہرے دار بھی نظر نہیں آیا تھا۔

جس رات میں نے زیر زمین ایٹمی سنٹر میں رہنا تھا اس روز میں پوری طرح سے تیار کر کوارٹر سے نکلا۔ میں نے خفیہ کیمرے والا ٹائی پن ٹائی کے ساتھ لگایا۔ سائنس دان رت نے نرملا دیوی کے گلدان سے نکالی ہوئی سیکشنوں اور لیبارٹریوں کی ڈپلی کیٹ چابی بھال کر پتلون کی جیب میں رکھ لی اور انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے ورکروں ساتھ ایٹمی سنٹر پہنچ گیا۔

سارا دن میں اپنے معمول کے کام میں لگا رہا۔

چار بجے سنٹر میں کام بند کر دیا جاتا تھا۔ میں پونے چار بجے سٹور روم سے نکل آیا۔ ں کمروں کے باہر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں وہیں ملازم ں۔ میں نے یونہی ایک خالی ڈبہ سٹور سے اٹھا لیا تھا۔ ڈبہ ہاتھوں میں تھامے میں ان کے ب سے گزر گیا۔ کسی گارڈ نے میری طرف خاص طور پر نہ دیکھا۔ بس ایک سرسری سی سے دیکھا اور اپنی ڈیوٹی پر پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہے۔ کلوک روم سنٹر کی گ کے شروع میں تھا۔ وہاں سے پتھر کی سیڑھیاں باہر کو جاتی تھیں۔ وہاں کوئی دروازہ ں تھا۔ دروازہ اوپر جا کر تھا جہاں آفس میں آتے ہوئے زبردست چیکنگ ہوتی تھی۔ نے ایک نظر پیچھے دیکھا۔ پانچوں کمروں کے باہر گارڈ اپنی جگہ پر چاق وچوبند کھڑے کسی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ میں جلدی سے کلوک روم میں داخل ہو گیا۔

کلوک روم میں بڑی دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا اس کمرے کا کوئی دروازہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لئے سیکورٹی کی ضرورت ہو۔ میں نے و والی دیوار کے کلوزٹ کا معائنہ کیا۔ یہاں واپسی پر کام کرنے والے جاتی دفعہ اپنے کوٹ لٹکا دیتے تھے۔ یہ کوٹ ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے آسانی سے جا سکتا تھا۔ یہ کلوزٹ خالی پڑا تھا۔ میں ڈبہ اٹھائے واپس آ گیا۔ میں صرف سائیٹ کا ی بار معائنہ کرنے گیا تھا۔ چھپنا مجھے آفس ٹائم کے بعد تھا۔ اس کام کے لئے بھی بے تیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے میں پوری طرح تیار تھا۔ مشکل یہ

پیش آرہی تھی کہ وہاں دوسری کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں آفس ٹائم کے بعد چھپ سکتا۔ میں سٹور روم میں بھی نہیں چھپ سکتا تھا۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ آفس ٹائم کے ختم ہونے کے بعد گارڈ ہر کمرے میں جا کر پوری چیکنگ کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سٹور روم کو آفس ٹائم کے بعد سٹور کیپر لالہ جی تالا لگا کر چابی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کی انہیں خاص طور پر اجازت ملی ہوئی تھی۔ وہاں صرف کلوک روم ہی ایسی جگہ تھی جہاں میں آفس ٹائم کے ختم ہونے کے بعد گارڈز کی چیکنگ سے بچ سکتا تھا۔ ایک بار ان کے باہر نکلنے کے بعد میں وہاں آزادی سے چل پھر سکتا تھا۔ کیونکہ زیر زمین ایٹمی سنٹر کے اندر رات کے وقت صرف بتیاں جلتی رہتی تھیں۔ اندر کوئی گارڈ ڈیوٹی پر نہیں ہوتا تھا۔ گارڈ کا پہرہ رات کو صرف اوپر والے مین گیٹ پر ہی رہتا تھا۔

پورے چار بجے آفس ٹائم ختم ہو گیا۔

سائنس دان، فنی ماہرین اور ورکرز اپنے اپنے کام چھوڑ کر بڑی خاموشی اور تھکاوٹ کے ساتھ کلوک روم کی طرف چل پڑے۔ میں سٹور روم میں ہی تھا۔ سٹور کیپر چیزیں سنبھال رہا تھا۔ میں چیزیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنے میں اس کی مدد کر رہا تھا اور ترچھی نظروں سے راہ داری کو بھی دیکھ لیتا تھا جہاں ورکرز کلوک روم میں داخل ہوتے۔ اندر جا کر کلوزٹ میں سفید کوٹ لٹکاتے اور اپنے کوٹ پہن کر باہر آجاتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ صرف دو چار آدمی ہی رہ گئے ہیں تو میں بھی کلوک روم کی طرف چل پڑا۔ راہ داری میں پانچوں شعبوں کے کمروں کے باہر گارڈ پہرے پر باقاعدہ موجود تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزر گیا۔

کلوک روم میں آیا تو وہاں صرف تین آدمی تھے جو سفید کوٹ ہینگروں میں لٹکا کر اپنے اپنے کوٹ پہن رہے تھے۔ میں بھی اپنا سفید کوٹ اتارنے لگا۔ میں جان بوجھ کر دیر لگا رہا تھا تا کہ یہ لوگ باہر نکل جائیں۔ کوٹ اتار کر میں نے کلوزٹ کے اندر ہینگر کے ساتھ لٹکا دیا۔ پھر دوسرے کلوزٹ میں سے اپنا کوٹ اتار کر پہننے لگا۔ اس دوران تینوں ورکرز سامنے والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکے تھے۔ جیسے ہی کلوک روم ایک سیکنڈ کے

لئے خالی ہوا میں جلدی سے سفید کوٹوں والے کلوزٹ میں گھس کر کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میرے آگے ہینگروں میں لمبے لمبے سفید کوٹ لٹک رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ باہر سے مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی ہینگروں کو ادھر ادھر کرے تب ہی میں دکھائی دے سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں خاموشی چھانا شروع ہو گئی۔ پھر مجھے گارڈز کی آپس میں باتیں کرنے کی دور سے آوازیں آنے لگیں۔ وہ کمروں میں جا کر چیکنگ کر رہے تھے۔ اس کے بعد مجھے کمروں کے دروازے بند کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ایک کر کے پانچوں سیکشنوں اور لیبارٹریوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں کلوزٹ کے کونے میں سفید کوٹوں والے ہینگروں کے پیچھے دبک کر بیٹھا تھا۔ گارڈز چیکنگ کرتے قریب آرہے تھے۔ ان کے بھاری بوٹوں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جائیں گے۔ مگر ان کے قدم کلوک روم کے باہر آکر رک گئے۔

کسی گارڈ نے دوسرے سے کہا۔

"کانسی رام! ذرا ایک نظر اس کمرے کو بھی دیکھ لے۔ کہیں کسی کی کوئی شے گری نہ ہو۔"

میں نے اپنا سانس روک لیا۔ ایک گارڈ کلوک روم میں داخل ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ سامنے کی دیوار والے کلوزٹ کو شاید دیکھ رہا تھا جہاں خالی ہینگر لٹک رہے تھے۔ کیونکہ ورکرز اپنا اپنا کوٹ اتارنے کے بعد پہن کر جا چکے تھے۔ باقی چاروں گارڈ کھڑے آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ سگریٹ بیڑی بھی پی رہے تھے۔ تمباکو کی بو آرہی تھی۔ حالانکہ وہاں سگریٹ پینے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ مگر وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو چکے تھے۔ جو گارڈ کلوک روم میں تھا وہ کم بخت باہر جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مجھے لوہے کی کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی۔ بس یہی خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرے کلوزٹ کے پاس آکر سفید کوٹوں والے ہینگروں کو ادھر ادھر نہ کرنا شروع کر دے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو میں سامنے کونے میں بیٹھا صاف نظر آجاتا۔ پھر میں بھاری مصیبت میں مبتلا ہو

کے ساتھ سرخ رنگ کی اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ خدا جانے یہاں کیا ہوتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی وہاں کی ساری چیزوں کی تصویریں اتار لیں۔ اس کے ساتھ ہی میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ دل میں یہی دعا مانگنے لگا کہ خدا کرے خفیہ کیمرے نے اپنا کام دکھا دیا ہو اور ان سارے کمروں یا لیبارٹریوں کی تصویریں اتر گئی ہوں۔ اس کمرے کو بھی میں نے لاک کیا اور راہ داری میں چلتا واپس کلوک روم میں آ کر کلوزٹ میں چھپنے کی بجائے وہاں جو لوہے کی کرسی پڑی ہوئی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ مجھے اب ساری رات وہاں گزارنی تھی۔ میں نے کلائی کے ساتھ بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی بمشکل سوا پانچ ہی بجے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ یہاں فرش پر لیٹ جاؤں۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہیں۔ مجھے کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ میں جاگ کر رات گزاروں گا۔

رات گزرتی رہی۔ میں جاگتا رہا۔

بیٹھا بیٹھا بور ہو جاتا تو اٹھ کر کشادہ اور خالی راہ داری میں ٹہلنے لگتا۔ سخت جانی اور
تیں سہنے کی مجھے خوب ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک رات جاگنا کوئی مشکل نہیں
میں زمین کے نیچے تھا۔ اوپر سے کبھی کبھی ڈیوٹی پر متعین گارڈز کی آپس میں ہنسی مذاق
نے کی آوازیں آ جاتیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی ہو جاتی۔ خفیہ کیمرے والا ٹائی پن میں
ٹائی پر نہیں لگایا تھا۔ بلکہ اسے رومال میں لپیٹ کر پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں
قمیض کے اوپر سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ میرا اپنا کوٹ کلوک روم کے کلوزٹ میں تھا۔
میں ہلکی خنکی تھی۔ یہ خنکی ریفریجریشن والے اس پلانٹ کی وجہ سے تھی جو رات کے
ت بھی چل رہا تھا۔ رات کے وقت شاید اسے دوسرے درجے پر کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ
کے وقت جب مختلف مشینیں چل رہی ہوتی ہیں فضا میں زیادہ ٹھنڈک ہوتی تھی۔

رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بجنے والے
میں کلوک روم میں آ کر کرسی پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد نیند آنے
میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں غافل نہیں ہونا چاہتا
میں کمانڈو مشن کی پل صراط پر چل رہا تھا۔ مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔
جانے مجھے غنودگی کیوں آنے لگی تھی۔ حالانکہ نیند کے معاملے میں بہت سخت جان
میں اٹھ کر راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ اس راہ داری کا فرش اور دیواریں پختہ سیمنٹ کی
۔ راہ دری کوئی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور دیواریں پندرہ بیس فٹ اونچی ہوں
چھت محراب دار تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھت میں ڈھکے ہوئے بلب

جل رہے تھے۔ اس طرح وہاں کافی روشنی تھی۔ میں نے سوچا کہ معلوم کرنا چاہئے یہاں پانی کے نکاس کا کیا انتظام ہے۔ کیونکہ یہ جگہ سطح زمین سے کافی نیچے تھی۔ ظاہر ہے کسی جگہ پر گندے پانی کے باہر نکالنے کے واسطے پمپ لگائے گئے ہوں گے میں چلتے چلتے راہ داری کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ ہمارے سٹور روم سے دس بارہ قدم آگے تھی۔ یہاں مجھے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی جنریٹر چل رہا ہو۔ وہاں کوئی جنریٹر نظر نہیں آرہا تھا۔ آواز بھی دبی دبی سی تھی۔ میں نے سامنے والی راہ داری کی دیوار کو ہاتھ لگایا۔ اس میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کان لگایا۔ آواز دیوار کی دوسری طرف سے آرہی تھی۔ دیوار میں بظاہر کوئی دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید جنریٹر دوسری طرف زمین کے اندر لگا ہوا تھا اور اس جنریٹر کی طاقت سے تہہ خانے کے پانی کا نکاس اوپر کسی صحرائی نالے میں ہوتا ہوگا۔ یہاں روشنی کم تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں واپس ہونے لگا تو مجھے دیوار کی ایک جانب ایک چھوٹا سا گول ہینڈل نظر پڑا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ یہ لوہے کا چرخی نما ہینڈل تھا میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہئے۔ یہ ہینڈل کیا کام کرتا ہے۔ میں یونہی ہینڈل کو بائیں جانب گھمانے لگا۔ تین چار چکر کھانے کے بعد ہینڈل رک گیا۔ ساتھ ہی کٹک کی آواز آئی۔ میں نے چرخی کو ذرا سا اپنی طرف کھینچا تو دیوار میں چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ ساتھ ہی دوسری طرف سے بجلی کے جنریٹوں کے چلنے کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ میں نے آگے گردن نکال کر دیکھا۔

آگے تین چار سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ نیچے ایک کنواں تھا۔ کنویں کی دیوار پر ایک بلب روشن تھا۔ نیچے جنریٹر لگے تھے جو چل رہے تھے۔ میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی لوہے کی ایک سیڑھی اوپر کنویں کے دہانے تک چلی گئی تھی۔ اوپر شاید کھلا آسمان تھا۔ مجھے کوئی تارا تو نظر نہ آیا مگر اوپر سے تازہ ہوا ضرور آرہی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور چرخی کو اسی طرح واپس گھما کر لاک کر دیا۔ ان لوگوں نے یہاں ہوا پانی اور فضا کو ٹھنڈا یا گرم رکھنے کا پورا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھارتی حکومت کا بڑا اہم سائنسی بلکہ ایٹمی ریسرچ سنٹر تھا۔ اسے دوسرے ممالک کے سفارت خانوں سے

بے حد خفیہ رکھا گیا تھا تا کہ کسی ملک کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ بھارت نے ایٹم اور پلوٹونیم بم بنانے کی کوششیں شروع کر رکھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ راز صرف اسرائیل کی حکومت کو ہی معلوم تھا اور ایک خفیہ خبر یہ بھی تھی کہ در پردہ اسرائیل اور بھارت میں دفاعی معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔

میں واپس کلوک روم میں آکر بیٹھ گیا۔

کرسی پر نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا اور خدا جانے کیوں اس وقت مجھے مغل شہزادے کی روح کا خیال آگیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اگر مغل شہزادے کی روح سچ بول رہی تھی تو بقول اس کے کوئی ناگہانی آفت آنے والی تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ آفت کس نوعیت کی ہو سکتی تھی۔ کیا مجھ پر کسی بیماری کا حملہ ہونے والا تھا؟ کیا میں پکڑا جانے والا تھا؟ یہی دو آفتیں ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ میں روحوں کا قائل تھا اور نیک روحوں کی پیش گوئیاں بھی میں نے سچ ہوتی دیکھی تھیں لیکن مجھے اپنے خدا کی ذات پر بھروسہ تھا اور میرا تب بھی یہی ایمان تھا کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ وہی مالک ارض و سما ہے اور وہی قادر مطلق ہے۔

میں نے مغل شہزادے کی پیش گوئی کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور سوچنے لگا کہ مجھے اسی اتوار کو خفیہ کیمرے کی فلم لے کر دلی پروفیسر جمشید کے پاس پہنچنا ہوگا۔ وہ یقیناً اس پلانٹ کی تصویروں کو دیکھ کر خوش ہوگا اور وہی مجھے بتائے گا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا اور اگلا مرحلہ کہاں سے شروع کرنا ہوگا۔ کافی دیر تک میں کلوک روم میں ہی بیٹھا رہا۔ رات گزرتی چلی گئی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پونے بارہ بجنے والے تھے۔ گویا آدھی رات تقریباً بیت چکی تھی۔ مجھے یہاں سے کہیں جانا تو تھا نہیں۔ اسی کلوک روم سے نکل کر اپنی ڈیوٹی پر سٹور روم میں پہنچ جانا تھا۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے اوپر والے گیٹ کو کوئی کھول رہا ہے۔ میں جلدی سے ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ دو آدمی تھے جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے اوپر سے نیچے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

میں چھلانگ لگا کر اٹھا اور کلوزٹ کے اندر سفید کوٹوں والے ہینگروں کے پیچھے چھپ

کر بیٹھ گیا۔ یا خدا خیر! یہ کم بخت اس وقت نیچے کیا کرنے آئے ہیں۔ ان کی آوازوں سے میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ یہ پانچ گارڈز میں سے دو گارڈز تھے۔ نیچے راہ داری میں آکر ایک کلوک روم کے باہر سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"جا بے بنسی! تو جا کر چیکنگ کر آ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

دوسرے نے راہ داری میں آگے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"تو بڑا کام چور ہو گیا ہے رے۔ سردار جی کو تیری رپورٹ کرنی پڑے گی۔ ہاں۔۔۔"

جو گارڈ کلوک روم کے باہر کھڑا تھا مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ دوسرے گارڈ کے بھاری بوٹوں کی آواز راہ داری میں آگے چلی گئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آدمی جو باہر کھڑا ہے کہیں اندر آکر کلوزٹ کو نہ دیکھنے لگے۔ ان کے اس وقت آنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ آدھی رات کو بھی نیچے آکر ایک راؤنڈ لگاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ہر شے ٹھیک ٹھاک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ لوگ اس وقت آئے جب میں کلوک روم میں آگیا ہوا تھا۔ اگر اس وقت آجاتے جب میں راہ داری کے آخری سرے پر تھا تو میں پھنس گیا تھا۔

جو گارڈ باہر سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا کوئی راجستھانی لوک گیت گنگنانے لگا۔ مجھے تمباکو کی بو آئی۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دور سے بھاری جوتوں کی آواز قریب آنے لگی۔ دوسرا گارڈ چیکنگ کے بعد واپس آرہا تھا۔

"کیوں رے بنسی! سب ٹھیک ہے رے؟"

دوسرے گارڈ نے اونچی آواز میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے رے۔ پر تیری شکایت مجھے سردار جی کے آگے کرنی پڑے گی کہ ایک تو تو کام چور ہو گیا ہے دوسرے نیچے آکر بیڑی تمباکو پیتا ہے۔"

دوسرے گارڈ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ جب تک مجھے اوپر کا دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں آئی میں کلوزٹ میں ہی چھپ کر بیٹھا رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ان دونوں میں سے کم از کم کوئی نیچے نہیں آئے گا تو

میں کلوزٹ سے نکل کر راہ داری میں آیا۔ راہ داری میں ابھی تک بیڑی کے جلے ہوئے تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مصیبت آکر ٹل گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ باقی کا سارا وقت میں چوکنا ہو کر کلوک روم میں ہی بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ میری گھڑی نے صبح کے سات بجا دیئے۔ پورے آٹھ بجے نیوکلر پلانٹ میں کام شروع ہو جاتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ تیار کیا ہونا تھا بس اس طرح باہر نکلنا تھا جیسے میں بھی دوسرے ورکروں کے ساتھ نیچے آیا تھا اور سفید کوٹ پہن کر اب باہر نکل رہا ہوں۔ پونے آٹھ بجے اوپر والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چھپ گیا۔ بہت سے آدمی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ یہ بھاری بوٹوں کی آواز تھی۔ یہ گارڈز تھے جو پلانٹ کے پانچوں کمروں کے باہر اپنی ڈیوٹی سنبھالنے آئے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے راہ داری میں آگے نکل گئے۔ کوئی دس منٹ بعد اوپر سے ورکروں نے آنا شروع کر دیا۔ میں اس چھوٹے سے کمرے میں دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی دو تین آدمی اندر داخل ہوئے میں خاموشی سے باہر نکل کر راہ داری میں آگیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ وہ یہی سمجھے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی اندر آیا تھا اور اب سفید کوٹ پہن کر اپنی ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔

یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔

سارا دن میں اپنے کام میں لگا رہا۔ ایک بار میں سائنس دان عورت نرملا دیوی کے کمرے کے آگے سے گزرا تو اتفاق سے ایک سائنس دان اس وقت کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ کمرہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے نرملا دیوی کو دیکھا۔ وہ گاندھی کیپ سر پر رکھے، گردن پر چھوٹا سا جونڈا باندھے اپنے کمپیوٹر کے آگے پتھر کے بت کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے آگے نکل گیا۔ ہفتے کا دن آیا تو میں نے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر شام کو ریواڑی جانے والی بس پکڑی۔ ریواڑی پہنچا۔ وہاں سے دوسری بس میں بیٹھ کر دو اڑھائی گھنٹے بعد دلی پہنچ گیا۔ ایک کیمسٹ شاپ سے گل خان کو فون کیا اور کہا۔

"میں جالندھر سے آگیا ہوں۔ گھر پہنچنے والا ہوں"

گل خان نے میری آواز پہچان لی تھی۔ کہنے لگا۔

"تم پہنچو میں پروفیسر کو لے کر آتا ہوں"

شام کے سات بج رہے تھے۔ اخیر سردیوں کا زمانہ تھا۔ ابھی دن چھوٹے تھے۔ جلدی شام ہو جاتی تھی۔ سات بجے دلی شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ میں ٹیکسی لے کر نظام الدین" اولیاء کے مزار سے ذرا آگے جا کر اتر گیا۔ یہاں سے کچے راستے پر پڑ گیا۔ مغل شہزادے کی قبر کی چاردیواری کے قریب سے ہوتا ہوا گل خان کے خالی اور شکستہ مکان پر آ گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید بھی آ گئے۔ میں نے خفیہ کیمرے والا ٹائی پن پروفیسر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر! میں نے اس کا بٹن دبا کر ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں چاروں طرف بڑے اطمینان سے گھمایا پھرایا ہے۔ اب خدا کرے کہ وہاں کی تصویریں آ گئی ہوں"۔

پروفیسر نے ٹائی پن لے کر جیب میں رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تم کو ابھی اس کیمرے کی طاقت کا اندازہ نہیں ہوا۔ نیگیٹو ڈیویلپ کر لوں تصویریں دیکھو گے تو کہو گے یہ کسی بڑے ایکسپرٹ فوٹوگرافر نے کھینچی ہیں"

میں نے انہیں اپنی واردات پوری تفصیل کے ساتھ سنائی۔ گل خان اور پروفیسر بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب میں پورے واقعات سنا چکا تو پروفیسر جمشید عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"تصویریں دیکھنے کے بعد ہی میں تمہیں بتا سکوں گا کہ کونسی لیبارٹری میں زیادہ حساس آلات لگے ہیں۔ ظاہر ہے دھماکے سے اندر کوئی ایٹم بم نہیں پھٹے گا۔ لیکن اگر ایٹمی پلانٹ میں غیر افزردہ پلاٹینم کی تھوڑی سی مقدار بھی موجود ہوئی تو ایک فرلانگ کے اندر اندر کا سارا علاقہ اڑ جائے گا اور زمین میں کئی فٹ گہرا گڑھا پڑ جائے گا۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہ ایٹمی سنٹر دو ٹیلوں کے درمیان زیر زمین بنا ہوا ہے۔ وہ بولا۔

"یہ تو میں پہلے بھی جانتا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں صحرائی ٹیلے قریب ہی ہیں بس وہ دونوں ٹیلے دھماکے کے بعد کہیں دکھائی نہیں دیں گے۔"

میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ تصویریں کب تک ڈیویلپ ہو جائیں گی۔ کیونکہ مجھے

واپس بھی جانا تھا۔ صرف اتوار کا دن میرے پاس تھا۔ پروفیسر نے کہا۔

"صبح میں تصویریں ڈیویلپ کر کے لے آؤں گا کل مجھے بھی دفتر سے چھٹی ہے"

رات کے گیارہ بجے میرے دونوں محب وطن اور سچے دل سے اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والے ساتھی چلے گئے۔ میں سکھوں والے حلیے میں ہی تھا۔ مکان میں آتے ہی میں نے پگڑی اتار کر دیوار کے کیل سے لٹکا دی تھی اور بال کھول دیئے۔ بڑا سکون میسر آیا۔ ڈاڑھی بھی کھول دی۔ معلوم ہوا کہ میں پھر سے تروتازہ ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی کرپان بھی دیوار کے ساتھ لٹکا دی تھی۔ غسل خانے میں جا کر اچھی طرح نہایا۔ بالوں میں کنگھی پھیری۔ رات کو سونے والا کرتہ پاجامہ پہنا۔ اوپر گرم چادر لے لی جو گل خان نے خاص طور پر وہاں میرے لئے رکھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ رات گلابی ٹھنڈک والی تھی۔ میں کھڑکی میں آ گیا۔ آسمان پر نگاہ ڈالی۔ بڑے شفاف تارے نکلے ہوئے تھے۔ یونہی خیال آ گیا کہ مغل شہزادے کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی جائے اور اس کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ میں نے مکان کو تالا لگایا اور میدان میں بنے ہوئے کچے راستے پر چلتا مغل شہزادے کے مقبرے والی چار دیواری کے پاس آ گیا۔ رات بڑی شفاف اور نکھری ہوئی تھی۔ یہ موسم بہار کی آمد کی خوش خبری دینے والی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ آسمان صاف تھا اور ستارے جھرمٹوں کی شکل میں بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ مقبرے کی دیوار پر جھکی ہوئی بیروں کی گھنی شاخیں ساکت تھیں۔ میں دوسری طرف سے مقبرے کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ مغل شہزادے کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور اس کی روح کی بخشش کے لئے خدا سے دعا مانگی اور وہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی چاندنی کی طرح پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ ہوا میں درختوں پودوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو تھی۔ میری حالت اب یہ ہو گئی تھی کہ میرا ڈر خوف اتر گیا تھا۔ نہ مجھے رات کے اندھیرے سے ڈر لگتا تھا نہ مجھے روحیں ' بدروحیں جن بھوت اور چڑیلیں ڈرا سکتی تھیں۔ نیک روحوں کے آنے سے تو چاروں طرف ایک نور پھیل جاتا تھا اور دل میں ایسا سکون پیدا ہوتا تھا کہ میں بیان نہیں کر

سکتا۔

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ اب جب کہ میں مغل شہزادے کی قبر پر آ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اس سے معلوم کروں کہ مجھ پر جو آفت نازل ہونے والی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ہی مجھے اس کے بارے میں بتا دے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ قبروں پر روحیں خاص طور پر نیک روحیں پہلے سے موجود نہیں ہوتیں۔ انہیں کلمہ شریف اور الحمد شریف پڑھ کر بلانا پڑتا ہے اور وہ اللہ کے حکم سے عالم بالا سے نیچے اس جگہ پر آتی ہیں جہاں ان کا جسد خاکی دفن ہوتا ہے۔ بندھیا چل کے جنگلوں میں ایک بار مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ نیک روحیں زمین پر آنا پسند نہیں کرتیں۔ یہاں میں بزرگان دین کی ارواح مقدسہ کی بات نہیں کر رہا۔ میں صرف ان لوگوں کی ارواح کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے دنیا میں رہ کر اگر کچھ غلطیاں کیں تو ساتھ نیکی کے بھی بہت کام کئے ہوتے ہیں۔ ایسی نیک ارواح خدا کے دربار سے مغفرت پانے کے بعد جنت کے ایک مقام میں مقیم ہوتی ہیں۔ وہ وہاں بڑی خوش ہوتی ہیں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مشغول رہتی ہیں۔ بندھیا چل کے بزرگ نے کہا تھا۔

"ایسی رُوحیں بھی زمین پر اپنی مرضی سے نہیں آتیں۔ زمین کی مادی فضاؤں میں انہیں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بے حد لطیف ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی خدا کے حضور دعا مانگ کر انہیں بلائے اور بلانے والے کا اس روح سے کوئی قلبی واسطہ بھی ہو تو وہ روح زمین پر تھوڑی دیر کے اتر آتی ہے۔ لیکن اسے عالم بالا کے بعض راز افشا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فاتحہ پڑھ کر مغل شہزادے کی روح کو ثواب پہنچایا اور خدا سے استدعا کی کہ وہ روح کو زمین پر اترنے کی اجازت عطا فرمائے۔

قبر پر کوئی دیا وغیرہ روشن نہیں تھا۔ قبر کا نشان بھی تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ آج وہاں دیا کون جلاتا۔ میری چاروں جانب موسم بہار کے آغاز کی نیلی رات کا ایک نور سا پھیلا ہوا

تھا۔ اتنے میں مجھے قبر کے سرہانے کی جانب سفید ہیولا نظر پڑا۔ مغل شہزادے کی روح عالم بالا سے اتر آئی تھی۔

میں نے اسے السلام وعلیکم کہا۔ روح نے وعلیکم السلام کہا۔ اور پرسکون دھیمی آواز میں پوچھا۔

"تم نے مجھے کس لئے بلایا ہے دوست؟"

میں نے کہا۔

"اے نیک روح! میں نے تمہیں عالم ابدی سے اس عالم خاکی میں آنے کی زحمت دی مجھے معاف کر دینا۔ لیکن جب سے تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ بہت جلد مجھ پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے اس وقت سے مجھے ایک ہی بے چینی سی لگ گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس راز کو کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن میرے دوست! کیا تم مجھے اس آفت کے بارے میں کوئی اشارہ بھی نہیں دے سکتے جس سے کم از کم مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آفت کس قسم کی ہوگی اور میں پہلے سے اس کے لئے تیار ہو جاؤں اور اس سے نمٹنے کا کوئی انتظام کر لوں"

مغل شہزادے کی روح نے جواب میں کہا۔

"مجھے صرف اتنی ہی اجازت تھی جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔ اس سے آگے مجھے زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور میری جرات بھی نہیں کہ میں اس سے زیادہ نہیں کچھ بتا سکوں۔ یہ بھی تم پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس کی اجازت سے میں نے نہیں اتنا بتا دیا ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس سلسلے میں مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کرو"

میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"میں اللہ کی مشیت کے آگے سر جھکاتا ہوں میری کیا مجال کہ ذرا سی بھی سرکشی کر سکوں۔ لیکن آخر میں ایک کمزور انسان ہوں۔ انسان جب تک اس مادی جسم میں رہتا ہے اس کے اندر تھوڑی بہت کمزوری بھی موجود رہتی ہے۔ کیا ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ تم

مجھے اس آنے والی آفت کے بارے میں ہلکا سا اشارہ ہی دے دو؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"نہیں میرے دوست۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ تمہیں بتانا تھا بتا چکا ہوں اب تم اس آنے والی آفت کا انتظار کرو اور اتنا یاد رکھو کہ اگر تم ثابت قدم رہے۔ تم نے خدا پر اپنا ایمان مضبوط رکھا اور آفت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جس طرح میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہیں نجیب آباد کے پتھر گڑھ قلعے کے عقبی جنگل کجلی بن میں جا کر شہید خاتون کی روح سے ملاقات کرنی ہو گی تم میری اس ہدایت پر پوری طرح عمل کرنا۔ اللہ کے فضل وکرم اور تمہاری ثابت قدمی اور آفت کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی طاقت سے تمہاری آفت دور ہو سکے گی۔"

میں نے مغل شہزادے کی روح کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے موجودہ کمانڈو مشن کے بارے میں مشورہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! کیا تم مجھے میرے موجودہ کمانڈو مشن کے بارے میں کوئی مشورہ دینا پسند کرو گے؟"

مغل شہزادے کی روح نے کہا۔

"یہ تمہارا عملی میدان ہے۔ تم اس وقت میدان عمل میں ہو اور کفر کے خلاف جہاد کر رہے ہو۔ تم نے اسلام کی سربلندی اور پاکستان کے استحکام کے لئے اپنے آپ کو ہلاکت خیز خطرات میں ڈال رکھا ہے۔ یہ تمہارا جہاد ہے۔ اس میدان عمل میں تمہارے ہر عمل کا فیصلہ تمہاری نیت اور تمہارے عملی کردار کے مطابق ہو گا۔ اگر تم ثابت قدم رہے۔ تم نے خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اپنے کردار کو داغ دار نہ ہونے دیا اور تمہارا ہر قدم صرف اسلام اور اسلام کی سربلندی کے واسطے آگے بڑھا تو کائنات کی ساری مخفی قوتیں تمہارے ساتھ ہوں گی اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم کامیاب نہ ہو۔ تم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہو گے۔"

میں نے مغل شہزادے کی روح سے مزید ایک سوال پوچھنا چاہا لیکن روح نے دھیمی

از میں کہا۔

"تمہارے دماغ میں مجھ سے پوچھنے کے لئے جو سوال پیدا ہو رہا ہے اس کا تعلق بھی اری سوچ تمہاری اپنی نیت اور تمہارے عملی کردار کی نوعیت سے ہے۔ جیسے تمہاری چ ہو گی، جیسی تمہاری نیت ہو گی۔ جیسا تمہارا عملی کردار ہو گا ویسا ہی اس کا نتیجہ بر آمد گا۔ اب میں واپس جا رہا ہوں۔ السلام وعلیکم"

میں نے آہستہ سے وعلیکم السلام کہا اور مغل شہزادے کی روح کا نورانی ہیولا ختوں کے اوپر اٹھ کر رات کی نورانی فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میرے دل پر سکون کی ایک ب کیفیت طاری تھی۔ میں کچھ دیر اسی کیفیت میں وہاں بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور ن میں واپس آگیا۔

مغل شہزادے نے میرے سکھوں والے حلیے کے بابت کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس وقت قبر پر کوئی دوسرا شخص موجود ہوتا تو وہ بھی یہ دیکھ کر سخت حیران ہوتا کہ ک سکھ قبر پر بیٹھا دعا مانگ رہا ہے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ میرے سر پر اس وقت سکھوں ی پگڑی نہیں تھی اور میں نے سر کے بال بھی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ کمرے میں آ کر میں کونے میں جلتی ہوئی موم بتی بجھائی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں نے کھلی ہی ی۔ یہاں راجستھان کے مقابلے میں رات کو خنکی زیادہ تھی۔ میں نے ہلکا کمبل اوپر کر ر سوچنے لگا کہ ایٹمی سنٹر کی تصویریں ضرور صحیح اتری ہوں گی۔ اس کے بعد مجھے ایٹمی یں چیونگ گم بم پلانٹ کرنے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جمشید نے مجھے گائیڈ کرنا تھا م ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں میں سے کس کمرے میں لگانے ہیں۔ بم لگانے کے لئے نے اپنے ذہن میں ہفتے کی رات منتخب کر لی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بم اس وقت بلاسٹ جب وہاں کوئی ورکر موجود نہ ہوں۔ کیونکہ ہمیں اس اٹامک انرجی سنٹر میں کام کرنے ا سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں انہیں ناحق ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں اگر ری ہوتی تو میں انہیں بھی ایٹمی مرکز کے ساتھ ہی اڑا سکتا تھا۔ بلکہ اگر مزید مجبوری تو میں اپنے آپ کو بھی ہلاک کروا سکتا تھا۔ میں نے تو جان کی بازی لگا رکھی تھی اور

اگر خدا اور اس کے رسول ﷺ بتائے ہوئے راستے میں جہاد کرتے ہوئے موت
آجائے تو اس سے بڑھ کر میری اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔

میں اس قسم کے خیالات میں گم آہستہ آہستہ نیند کی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھ
غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک مجھے لوبان کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر
آنکھیں کھول دیں۔ یہ راجستھان کی مڑھیوں والی چندریکا بدروح کی بو تھی۔ میں
کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر رات کی دھندلی دھندلی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوبان کی
پہلے ہلکی تھی۔ اب تیز ہو رہی تھی۔ پھر کھڑکی کے پاس کمرے کے اندر چندریکا نمودار ہو
گئی۔ اس نے جوگیا رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خلاف معمول ہند
جوگیوں والا ترشول تھا۔ گلے میں کالے منکوں کی مالائیں تھیں۔ بال کھلے تھے اور آنکھو
سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

میں اس کی طرف گھورتے ہوئے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چندریکا! تم؟"

"ہاں! میں!"

اس کی آواز بھی تھوڑی بدلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ آج تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ پہلے تو تم نے ریشمی ساڑھی پہنی ہوتی تھی بالو
میں پھولوں کا گجرا ہوتا تھا مگر آج تمہارے ہاتھ میں تیکھی نکروں والا ترشول ہے۔ کیا کس
کی جان لے کر آرہی ہو؟"

چندریکا بدروح کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ وہ بالکل ایک
بدروح لگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بھارت ماتا کو نقصان پہنچانے کے لئے جو کچھ کر رہے ہو مجھے اس کی ساری خبر
ہے۔ پہلے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں
گی۔ کیونکہ تم پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہ چکے ہو مگر میں بھارت ماتا کی اتنی زبردست
تباہی بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے تمہارے خلاف یدھ کرنے جنگ کرنے اور تمہاری

کو ناکام بنانے کا فیصلہ کیا اور راجستھان کے اٹامک انرجی سنٹر کے ڈائریکٹر سردار ارجن
کے گھر جا کر اسے تمہاری سازش سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ تمہیں بھی
ار کر لے اور بھارت ماتا بھی تباہی سے بچ جائے۔ لیکن مجھے سخت دکھ ہے کہ میں ایسا
سکی۔ کوئی نیک روح تمہاری مدد کر رہی ہے۔ میں سردار ارجن سنگھ کے گھر میں جا کر
کے سامنے ظاہر ہو گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایٹمی سنٹر تباہ ہونے والا ہے۔
ں نے محسوس کیا کہ نہ تو وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ میری بات سن رہا ہے۔ میں نے
بازوؤں سے پکڑ کر ہلانا چاہا مگر وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں نہ آیا۔ آہ! اس وقت
یہ راز کھلا کہ ایک نیک اور مسلمان روح تمہاری مدد کر رہی ہے اور اس نے میرے
ے منصوبے پر پانی پھیر دیا ہے۔"

ں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ نیک روح جو بھی تھی وہ اللہ کے حکم ہی
ری مدد کر رہی تھی۔ اس نیک روح کی مدد ایسی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے بم لے کر
ی پلانٹ میں جا کر لگا دے۔ نہیں۔ یہ کام مجھے ہی کرنا تھا اور یہی ایک عمل مرد کی
تی ہے کہ وہ خود عمل کرے۔ خود جدوجہد کرے اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دے۔ یہ
ح اللہ کے حکم سے میری اس صورت میں مدد کر رہی تھی کہ وہ میرے منصوبے
ڈ مشن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے والوں کو مجھ سے دور رکھ رہی تھی۔ یہ بالکل
بات تھی کہ کوئی کاری گر اپنا کام کر رہا ہو اور اس کا استاد کام میں دخل دینے
یہ کہہ کر دور رکھ رہا ہو کہ کاری گر اس وقت کام کر رہا ہے۔ اس کے کام میں
نا اور اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ ورنہ اگر نیک روحیں مسلمانوں کی اس
ے مدد کرنے لگیں تو ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے۔ نہیں ایسا
۔ اس دنیا میں ہر انسان کی طرح ایک مسلمان کو بھی خدا پر یقین رکھتے ہوئے اور
بلند رکھتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اسی
جہد کر کے اپنے اعلیٰ مقصد کی راہ میں آئی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر کے ان
ے جنگ کرے جب وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو خدا کی

خوشنودی حاصل کرتا ہے۔ ہماری زندگی عمل پیہم کا نام ہے۔ ہمیں اپنے اعلیٰ کردار اور سرگرم عمل سے ہی اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر خدا کے آگے سرخ رو ہونا ہے۔ یہی ہماری زندگی اور ہماری روح کی جدوجہد کا مقصد اعلیٰ ہے۔

میں نے بھی قدرے تلخ لہجے میں چندریکا بدروح سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سے میری کھلی جنگ ہے"

چندریکا کی بدروح نے ترشول اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اب تم سے میری کھلی جنگ ہے۔ میں تمہیں بھارت ماتا کو نقصان پہنچاتے اب نہیں دیکھ سکتی"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے بھارت ماتا کو نقصان نہیں پہنچا رہا۔ تمہاری بھارت ماتا میرے ملک کے بے گناہ بچوں عورتوں مردوں کو جو ہلاکت کی آگ میں جھونکنے کے ارادے بنا رہی ہے میں انہیں ناکام بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ تمہاری بھارت ماتا عیش کرتی رہے اور اس کے حکمران ایٹم بم بنا کر میرے وطن پاکستان کے شہروں پر پھینک کر انہیں تباہ کر دیں تو یہ تمہاری اور تمہارے بھارت ماتا کی بھول ہے۔ میں تمہارے ملک کے حکمرانوں کو ان کے ناپاک عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ پاکستان امن پسند ملک ہے۔ وہ اپنے ہمسائے ممالک کے ساتھ امن و آشتی سے رہنا چاہتا ہے لیکن تمہارا بھارت پاکستان کے خلاف زبردست جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب وہ پاکستان کے شہروں پر گرانے کے لئے ایٹم بم اور پلاٹونیم بم تیار کر رہا ہے میں ان مذموم عزائم کو جہاں تک اور جب تک مجھ سے ہو سکا ناکام بناؤں گا۔ یہ میرا ایک محب وطن پاکستانی کمانڈو اور مسلمان ہونے کے ناطے فرض بھی ہے۔"

بدروح چندریکا بپھر سی گئی۔ اس کے نتھنوں سے مجھے عجیب آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ جیسے کوئی زخمی ریچھنی تکلیف سے سانس لے رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنی کوشش کر کے دیکھ لو میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گی۔

ہمارے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گی۔ اگر مجھے کاش کے دیوتاؤں سے بھی مدد لینی پڑی تو ان سے بھی ضرور مدد لوں گی۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے صرف یہ شعر پڑھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

بدروح چندریکا نے ایک بھیانک چیخ ماری اور غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد …ں سوچنے لگا کہ یہ بدروح سر سے پاؤں تک شیطان کی آلہ کار بن گئی ہے۔ اب مجھے اس …ے ناپاک عزائم سے بھی خبردار رہنا ہوگا۔ اگرچہ مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ تھا اور میرا …ان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ پھر بھی دشمن دشمن ہوتا ہے اور مسلمان کو اپنے …دشمن سے تو کبھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بھی شک گزرا کہ ہو نہ ہو مجھ پر جو …ت نازل ہونے والی ہے اور جس کی پیش گوئی مغل شہزادے کی روح نے بھی کر دی …وہ آفت ضرور اس بدروح چندریکا کی وجہ سے ہی نازل ہوگی۔ کیونکہ چندریکا کے …ملنے میں مجھ سے بھی بعض غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ اور انسان کو اس کی غلطی کی سزا …ت کی طرف سے ضرور مل کر رہتی ہے۔ دنیا کی عدالت میں انسان غلطی کرنے کے …د اپنا وکیل کر کے بری ہو سکتا ہے لیکن قدرت کی عدالت میں جرم کرنے والا کبھی …ں بچتا۔ اسے سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سزا کی شدت اور مدت کم ہو …ئے۔ چنانچہ مجھ پر جو آفت نازل ہونے والی تھی وہ یقیناً میرے اپنے ہی کسی گناہ کی سزا …۔ وہ ٹل نہیں سکتی تھی۔ دنیا کی عدالت میں تو اپیل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے مگر …ت کی عدالت میں کوئی اپیل نہیں ہوتی۔ میں دل میں خدا سے یہی دعا مانگنے لگا کہ اے پروردگار میری غلطیاں قصور معاف کر دے اور میری سزا کی شدت اور مدت میں کمی …ہنا۔

یہ بھی عجیب رات تھی۔ ایک ہی رات میں دو روحوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک

بدروح تھی اور دوسری نیک روح تھی۔ بہرحال اب مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ بدروح چندریکا میری دشمن بلکہ کھلی دشمن بن گئی تھی اور اس نے میرے خلاف جنگ کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ میرے بچنے کی ایک گنجائش ضرور قدرت خداوندی نے رکھ دی تھی کہ اگر میں صاحب کردار رہتا ہوں اگر میں اپنے جہاد کے کمانڈو مشن میں ثابت قدم رہتا ہوں۔ اور اگر میں اپنے مشن پر صرف خدا اور خدا کے واسطے عمل کرتا ہوں اور اپنی کوئی ذاتی غرض اور ذاتی مفاد اس میں شامل نہیں کرتا ہوں تو پھر بدروح چندریکا میرے خلاف اپنے کسی مذموم منصوبے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا بدروح چندریکا نے خود اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن اگر میرے عمل میں میری ذاتی غرض، میرا ذاتی مفاد شامل ہو گیا یعنی میں نے اللہ اور رسول ﷺ کا دامن چھوڑ کر صرف اپنی عیش و عشرت اور دولت اکٹھی کرنے کے لئے کام شروع کر دیا تو بدروح چندریکا مجھ پر آسانی سے وار کر سکے گی۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج سے میرا ہر عمل اللہ اور اس کی خوشنودی کے لئے ہو گا۔ اور میں اسی کے دکھائے ہوئے راستے میں چلتے ہوئے دین اسلام کی سربلندی اور اسلام کے نام پر قائم ہوئے اپنے وطن پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کے لئے ہی کام کروں گا۔ اپنی ذاتی غرضوں ذاتی فائدوں اور عیش و عشرت کے خیال تک کو دل سے نکال دوں گا۔

اس کے بعد میں سو گیا۔ مجھے بڑی پرسکون نیند آئی۔

میں بیدار ہوا تو کھڑکی اسی طرح کھلی تھی اور دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ جب سے سکھوں والا حلیہ بنایا تھا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میں شیو کرنے اور بال کٹوانے کی بک بک سے بچ گیا تھا۔ کپڑے بدلے اور سر پر سکھوں والی پگڑی جمائی۔ ڈاڑھی کو سکھوں کی طرح اوپر کو چڑھایا۔ گلے میں کرپان لٹکائی اور ناشتہ کرنے کے لئے مزار شریف والے چوک میں آ گیا۔

یہاں دلی کے مسلمانوں کی نہاری کی بڑی دکانیں تھیں۔ ایک دکان میں بیٹھ کر دلی کی تاریخی نہاری کا ناشتہ کیا اور سکھوں کی طرح اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں کے بالوں کو رومال

ے اوپر کی طرف چڑھا چڑھا کر صاف کرتا وہاں سے اپنے مکان میں آ گیا۔ چو۔ میں تین پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ مگر کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ سکھ بھیس بدلنے کے بعد سی آئی ڈی والوں سے مجھے کافی حد تک نجات مل گئی تھی۔ لیکن ں غافل اور بے پروا نہیں ہوا تھا۔ دلی پولیس اور دلی کی سیکرٹ پولیس کے پاس سرے خطرناک مجاہد کمانڈوز کی طرح میری تصویر بھی احمد آباد پولیس سٹیشن سے پہنچ چکی ی اور اگر کوئی ذہین سی آئی ڈی آفیسر مجھے قریب بلا کر غور سے دیکھتا تو وہ مجھے پہچان سکتا ۔ چنانچہ میں پولیس کے سپاہی کو دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتا تھا۔ اگر قریب سے بھی گزرنا ے تو اپنے دھیان میں گربانی کا جاپ کرتا گزر جاتا تھا۔

کوئی دس بجے کے قریب پروفیسر جمشید اور گل خان آ گئے۔ وہ میرے لئے تھرمس ں چائے بھر کر لائے تھے۔ کھانا اب گل خان میرے لئے نہیں لاتا تھا۔ جب سے میں نے ھ نوجوان کا روپ بدلا تھا اسے معلوم تھا کہ میں باہر جا کر بھی کھانا کھا سکتا ہوں۔ پروفیسر ید ساری تصویریں ڈیویلپ کر کے لے آیا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں سے لفافہ ال کر کھولا اور میرے آگے پندرہ سولہ پاسپورٹ سائز کی رنگین تصویریں رکھ دیں۔

"تصویریں تو بہت تھیں۔ یہ میں نے ان میں سے چھانٹی ہیں۔ ذرا دیکھو یہ تمہارے ر گراؤنڈ ایٹمی سنٹر کے سیکشن کی ہیں۔"

ساری تصویریں ایٹمی سنٹر کے پانچوں کمروں کی تھیں۔ ایک ایک کمرے کی تین تین ویریں تھیں جو مختلف زاویوں سے میرے ٹائی پن کے خفیہ کیمرے نے اتاری تھیں۔ ویریں اس قدر صاف اور شفاف تھیں کہ میں کیمرے کی کارکردگی پر حیران رہ گیا کہ ئے چھوٹے سے کیمرے نے اتنی اچھی تصویریں کس طرح کھینچ لیں۔ اس دوران پروفیسر ید رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتا رہا۔ گل خان بھی جھک کر میرے ساتھ ہی یروں کو دیکھ رہا تھا۔ جب میں تصویریں دیکھ چکا تو پروفیسر جمشید نے عینک آنکھوں پر ا اور تصویروں میں سے ایک تصویر نکال کر میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں صرف اس کمرے میں ٹائم بم لگانے ہوں گے۔ باقی کسی کمرے میں لگانے کی

ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے تصویر کو غور سے دیکھا یہ پانچویں نمبر کے اس کمرے کی تصویر تھی جس کے اندر گول چبوترہ تھا اور چبوترے کے اوپر آپریشن روم کی طرح کے آلات لگے ہوئے تھے۔ پروفیسر جمشید کہنے لگا۔

"یہ ایٹمی سنٹر کا پروسیسنگ پلانٹ ہے۔ یہ اس انسٹی ٹیوٹ کا دل ہے۔ اگر تم اس کو تباہ کردو گے تو سارا ایٹمی مرکز تباہ ہو جائے گا۔"

گل خان بھی میرے ساتھ ہی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کہہ رہا تھا۔

"یہ ایک طرح کی ایٹمی بھٹی ہے جہاں پلوٹونیم کو پروسیس کیا جاتا ہے۔ تمہیں اس بھٹی کے اردگرد تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چار ٹائم بم لگانے ہوں گے۔ اس کے بعد کا سارا کام یہ بھٹی بموں سے اڑنے کے بعد خود ہی انجام دے دے گی۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے ٹارگٹ مل گیا ہے۔ میں یہ کام آنے والے ہفتے کی رات کو پورا کردوں گا۔"

گل خان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس کتنے ٹائم بم ہیں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس صرف چھ ٹائم بم باقی رہ گئے ہیں۔ جو چیونگ گم ٹیبلٹ کی شکل میں ہیں۔ گل خان نے پروفیسر جمشید سے پوچھا۔

"پروفیسر! وہ بم میں نے ہی تیار کئے تھے اور تم نے بھی انہیں دیکھا تھا۔ تمہارے خیال میں اس ایٹمی ری ایکٹر کے لئے یہ بم مناسب رہیں گے۔ میرا مطلب ہے اگر یہ اپنی طاقت اور اثرات کی اعتبار سے مناسب نہ ہوں تو میں دوسرے اس سے زیادہ دھماکہ خیز ٹائم بم تیار کر سکتا ہوں۔"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ بم بہت طاقتور ہیں اور راجستھان کے پورے

ایٹمی ری ایکٹر کے لئے کافی ہیں۔ ان بموں نے پھٹ کر ایٹمی ری ایکٹر کے پلانٹ میں بھی دھماکہ کرنا ہے۔ وہ دھماکہ کتنی شدت کا ہوگا اگر انڈین پریس نے حکومت کے کہنے پر خبر کو دبا دیا تو تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ ہمارا کمانڈو دوست ہی ہمیں کچھ بتا سکے گا"

میں نے کہا۔

"میں تو ہفتے کی رات کو وہاں ٹائم بم لگانے کے بعد وہاں سے اسی وقت دلی کی طرف چل پڑوں گا۔"

پروفیسر جمشید نے گل خان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"اس کی ڈیوریشن کتنی ہے؟ میرا مطلب ہے تم نے اس بم میں جو ٹائم ڈی وائس فٹ کی ہوئی ہے۔ اس کا دورانیہ کتنا ہے؟"

گل خان نے کہا۔

"اس کا خفیہ بٹن دبانے کے بعد صرف ایک گھنٹے کے بعد بم بلاسٹ ہو جاتا ہے۔"

پروفیسر نے عینک اتار رکھی تھی۔ مگر وہ اس کے شیشے صاف نہیں کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس وقت تک ایٹمی ری ایکٹر کے ایریا سے کافی دور جا چکے ہو گے۔"

میں نے کہا۔

"میں دور کسی جگہ چھپ کر ری ایکٹر کی تباہی کو دیکھ بھی سکتا ہوں۔"

پروفیسر بولا۔

"اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو پھر تمہیں تباہی کی جگہ سے کافی دور رہنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تباہی کافی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا کہ کچھ فاصلے پر چھپ کر تباہی کا منظر دیکھوں۔ مگر وہاں صحرا ہی صحرا ہے۔ ریت کے ٹیلے کافی دور دور ہیں۔ پتھریلی ریت کے ٹیلے صرف ایٹمی مرکز کے

اوپر ہی ہیں۔"

پروفیسر جمشید نے کہا۔

"وہ دونوں نیلے پگھل کر پانی ہو جائیں گے۔ بلکہ بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ یہ ابھی پلوٹونیم پروسیسنگ عمل میں ہے اگر آدھا گرام پلوٹونیم بھی تیار ہو چکا ہوتا تو اردگرد کے بیس میل کے علاقے میں ہر شے پگھل کر بھاپ بن کر اڑ جاتی۔"

گل خان نے کہا۔

"کیا معلوم وہاں پلوٹونیم تیار ہو چکا ہو؟"

پروفیسر نے جواب دیا۔

"نہیں۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پلوٹونیم تیار ہو چکا ہوتا تو اس چھوٹی ایٹمی بھٹی کی جگہ وہاں بڑا ایٹمی پلانٹ لگا ہوتا۔ ابھی وہاں پلوٹونیم کے عناصر کو صرف صاف ہی کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہاں جتنے عناصر صاف ہو چکے ہیں ان کی شدت اور حدت پھٹنے کے بعد اتنی تباہی پھیلائے گی کہ آس پاس کے لوگوں کو ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی یاد آجائے گی۔"

ہم دوپہر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر گل خان بازار سے جا کر کھانا لے آیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ پروفیسر نے مجھے مزید ہدایات دیں کہ بم کو ایٹمی بھٹی کی گولائی پر فرش سے ایک فٹ کے فاصلے پر لگانا اور اس طرح لگانا کہ کسی کو دکھائی نہ دیں۔ میں نے کہا۔

"میں ہفتے کی رات کو یہ کام کروں گا۔ اس وقت ایٹمی سنٹر میں کوئی نہیں ہوتا۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

گل خان نے مجھ سے پوچھا۔

"ٹائم بم ٹھیک حالت میں ہیں نا؟"

میں نے کہا۔

"بالکل ویسے کے ویسے میرے پاس ڈبی میں بند پڑے ہیں۔ کیا زیادہ دن پڑے رہنے

سے ان کی شدت کم تو نہیں ہو جاتی؟"

گل خان نے ہنس کر کہا۔

"بالکل نہیں دوست! وہ اتنی ہی طاقت سے پھٹیں گے جتنی طاقت سے دوارکا فورٹ کے اسلحہ کے ذخیرے میں پھٹے تھے۔"

میں نے کہا۔

"ویری گڈ!"

گل خان بولا۔

"میں ہفتے کی رات کو اسی مکان میں آجاؤں گا۔ تم رات کو یا اگلی صبح جس وقت بھی آؤ گے میں یہاں پر موجود ہوں گا۔"

سہ پہر ہو رہی تھی۔ مزید پوچھنے اور سمجھنے سمجھانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے واپس راج گڑھ بھی جانا تھا۔ چنانچہ میں کوئی سوا تین بجے کے قریب گل خان اور پروفیسر جمشید سے رخصت ہو کر ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریواڑی کو ایک گاڑی چار بجے چلتی تھی۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر ریواڑی پہنچ گیا۔ مجھے وہاں درگاوتی سے ملنے کی اب کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بس اڈے سے بس پکڑی اور شام ہو رہی تھی کہ راج گڑھ پہنچ گیا۔ کالونی پر شام کے سائے اتر رہے تھے۔ کیونکہ کالونی میں بتیاں کم روشن ہوتی تھیں اس لئے وہاں شام کا اندھیرا کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اپنے کوارٹر میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے جہاں ٹائم بموں والی ڈبی چھپا کر رکھی ہوئی تھی اسے نکالا۔ کھول کر چھ کے چھ ٹائم بموں کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی۔ دیکھنے میں واقعی یہ چیونگم کی ٹکیاں لگتی تھیں۔ میں نے انہیں واپس ڈبی میں ڈال کر خفیہ جگہ پر سنبھال کر رکھ دیا۔ مجھے یہ بم لگانے کے لئے ہفتے کے دن کا انتظار کرنا تھا۔ دوسرے دن میں وقت پر ایٹمی مرکز پہنچ گیا۔ پہلے کی طرح کام کرتے اور ٹرالی میں سامان سٹور سے ادھر ادھر لاتے لے جاتے دن گزر گیا۔ رات کو یونہی خیال آیا کہ سائنس دان ٹھنڈی یخ عورت نرملا دیوی سے بھی ملاقات کر لینی چاہئے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ کوئی ایمرجنسی

تو پیدا نہیں ہونے والی۔ اپنی طرف سے تو میرا کمانڈو ایکشن کا منصوبہ بالکل تیار اور مکمل تھا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ منصوبے اپنی طرف سے ہر لحاظ سے مکمل کر لئے جاتے ہیں لیکن کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ عین وقت پر حالات کیا شکل اختیار کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات اتنی جلدی پلٹا کھاتے ہیں کہ کمانڈو مشن کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ سائنس دان عورت ایٹمی مرکز کے اندرونی حالات سے پوری طرح باخبر رہتی تھی۔ کیونکہ یہ اپنے سیکشن کی انچارج تھی۔ اس لئے اس سے کم از کم ہفتے کی شام تک ملتے رہنا ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ایٹمی مرکز کے پانچوں کمروں میں لگنے والی اصل چابی میرے پاس تھی۔ میں نے اس کی نقل تیار کروا کر نرملا دیوی کے کچن والے گل دان میں ڈالی ہوئی تھی۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں اس کو یہ علم تو نہیں ہوگیا کہ اس کے گل دان والی چابی نقلی ہے۔ اگرچہ ایک چابی اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ کچن والی چابی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر ان حالات کی نبض کو معلوم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں آدھی رات کے بعد پگڑی اتار کر سر پر سکھوں کی طرح رومال باندھ کر نرملا دیوی کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ کالونی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ شاید ہی کوئی کوارٹر ایسا تھا کہ جس کے اندر کوئی بتی روشن ہو۔ کسی کسی کوارٹر کی باہر کی بتی روشن تھی۔ میں کوارٹروں کے پیچھے سے ہو کر جا رہا تھا۔

سائنس دان عورت نرملادیوی کے کوارٹر پر بھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس عورت کی طرح اس کا کوارٹر بھی سرد ویران اور تاریک تھا۔ مجھے یہ خیال ضرور آیا کہ میں اسے بتائے بغیر جا رہا ہوں۔ کہیں وہ گہری نیند نہ سو رہی ہو۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں فون پر شام کے وقت اسے خبر کر دیتا کہ میں آرہا ہوں۔ مگر اب میں اس کے کوارٹر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب سوائے دستک دینے کے میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر بالکل خاموشی چھائی رہی۔ میں نے دوسری اور تیسری بار دستک دی۔ پھر بھی خاموشی چھائی رہی۔ چوتھی بار دستک دینے سے اندر سے نرملا دیوی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر انگریزی میں ہی کہا۔ "میں ہوں جسونت سنگھ سوڈھی"

اور پھر سکھوں کی طرح اپنے آپ ہی ہنس پڑا۔ میں فوراً چونکا میرے اندر سکھوں والی عادتیں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور سنجیدہ ہوگیا۔ نرملا دیوی نے دروازہ کھول کر اپنا آدھا سویا آدھا جاگا ہوا چہرہ باہر نکالا۔ باہر بھی اندھیرا تھا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ باہر کا اندھیرا ذرا کم تھا۔ مجھے اس کی شکل ایسی لگی جیسے اچانک کوئی بھوت اندھیرے میں سے نکل کر میرے سامنے آگیا ہو۔ اس کے مختصر سے بال بڑے بے ہنگم طریقے سے کھلے تھے۔ اس نے سخت لہجے میں انگریزی میں کہا۔

"تم اس وقت کیا کرنے آئے ہو؟ تم نے شام کو فون کیوں نہیں کیا؟"

میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میڈم! آئی ایم سوری۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"مگر تم سنٹر میں تو ڈیوٹی پر موجود تھے۔ اندر آجاؤ"

میں اندر کمرے میں چلا آیا۔ اب سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آگے کیا کروں۔ کیوں کہ کمرے میں اتنا گھپ اندھیرا تھا کہ میری آنکھیں جو جنگل کی تاریک راتوں میں دیکھ لیتی تھیں وہاں کچھ نہیں دیکھ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا میں ڈی ٹول کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے نرملا دیوی مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرح صوفے کے پاس لے گئی جس طرح کوئی کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔

"بولو کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے کھسیانا ہو کر کہا۔

"بس میڈم! تم سے ملنے کو بہت دل کرتا تھا۔ بے قرار ہو کر آگیا ہوں۔"

"تم اتنے دن کیوں نہیں آئے؟ اس ہفتے کی رات کہاں تھے؟

میں نے کہا۔

"بس میڈم میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ کوارٹر میں ہی پڑا رہا۔ کوئی خیر خبر لینے والا تو یہاں ہے نہیں۔"

وہ بالوں کا چھوٹا اور بدشکل سا جوڑا بنا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"اور تو سب خیریت ہے؟"

وہ سرد لہجے میں ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"ہاں سب خیریت ہے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

آج اس نے کچھ زیادہ ہی ڈی ٹول کا استعمال کیا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے بستر سے ڈی ٹول کی تیز بو آ رہی تھی۔ مجھے وہ کسی ایسے مریض کا کمرہ لگ رہا تھا جس کا تازہ تازہ آپریشن ہوا ہو۔ میرا خود وہاں دم گھٹنے لگا تھا۔ جب میں نے معلوم کر لیا کہ سب ٹھیک ہے اور اسے نقلی چابی کا بھی پتہ نہیں لگا تو میرا وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ میں نے اٹھ کر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"ست سری اکال۔ میں چلتا ہوں۔ سوری تمہیں ڈسٹرب کیا"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ بالکل لگ رہا تھا۔ جیسے کسی ہسپتال کی چڑیل میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں دروازے سے باہر نکلا تو اس نے کہا۔

"مجھے ڈسٹرب کرنے صرف ہفتے کی رات کو آیا کرو۔ اب جاؤ۔"

اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دل میں کہا۔

"میڈم اس ہفتے کی رات کو میں بہت مصروف ہوں گا۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں راج گڑھ اس زیر زمین ایٹمی مرکز کے اتنا قریب تو نہیں کہ یہ کالونی بھی اس کے ساتھ ہی اڑ جائے؟ مگر میرا خیال ہے ایسی بات نہیں تھی۔ پروفیسر جمشید نے کہا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے دھماکے سے اردگرد دو فرلانگ کا علاقہ ہی متاثر ہو گا۔ اور اس کالونی کے کوارٹرز ایٹمی مرکز یعنی رام گڑھ کے قصبے سے کافی فاصلے پر تھے۔

بہرحال میرے لئے وہ نرملا دیوی سے آخری ملاقات ہی تھی۔ اب اس وقت خاص طور پر اس کے پاس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

دن گزرتے چلے گئے۔

آخر ہفتے کی رات آ گئی۔ یہ میرے کمانڈو ایکشن کی رات تھی۔ اس رات مجھے ایٹمی مرکز میں رہ کر ایٹمی پلانٹ والے کمرے میں چار ٹائم بم لگانے تھے۔ پہلے کی طرح میں اس روز بھی آفس ٹائم ختم ہوتے ہی سفید کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکانے کے لئے کلوک روم میں گیا اور وہیں کلوزٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاروں ٹائم بم میری جیب میں موجود تھے۔ ڈبی میں دو بم میں نے الگ کر کے رکھ لئے تھے۔ مجھے ایٹمی بھٹی پر چار بم لگانے تھے۔ میں اس وقت تک کلوک روم میں ہی چھپا رہا جب تک کہ پانچوں گارڈ کمروں کو چیک کرنے کے بعد تالے لگا کر اوپر نہیں چلے گئے۔ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ یہ گارڈ مزید چیکنگ اور دیکھ بھال کے لئے آدھی رات کو بھی نیچے آتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بم آدھی رات کے بعد اور ان گارڈز کی دوسری چیکنگ کے بعد لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں سفید کوٹوں کے ہینگروں والے کلوزٹ میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب ذرا اطمینان ہوا کہ ایٹمی سنٹر خالی ہو گیا ہے تو باہر نکل آیا۔ چابی میری جیب میں تھی جو سب کمروں کو لگ جاتی تھی۔ مگر مجھے اس وقت صرف کمرہ نمبر ۵ کو یہ چابی لگانی تھی۔

احتیاط کے طور پر میں راہ داری میں ٹہلتا ٹہلتا کمرہ نمبر ۵ کے پاس آ گیا۔ جیب سے چابی نکال کر اسے لگائی تالا کھل گیا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر بتیاں جل رہی تھیں۔ درمیان میں ایٹمی بھٹی صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے دروازے کو دوبارہ لاک کر دیا اور دبے پاؤں چلتا واپس کلوک روم میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یا پاک پروردگار کوئی ایسی ویسی ایمرجنسی نہ پیدا ہو جائے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ میرا کمانڈو مشن فیل ہو جاتا بلکہ میں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اور کبھی راہ داری میں دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے رات کے گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ بج گئے۔

اوپر سے گارڈز کے چیکنگ کے لئے راؤنڈ لگانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے کلوک روم میں آکر چھپ گیا۔ ٹھیک بارہ بجے رات دونوں گارڈ اوپر سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور باتیں کرتے دونوں راہ داری میں آگے نکل گئے۔ آج دوسرا گارڈ کلوک روم کے پاس کھڑا نہیں ہوا تھا۔ مجھے ان کی دروازے کھولنے بند کرنے اور باتیں کرنے اور کبھی کبھی قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔

پھر وہ آپس میں باتیں کرتے ہنسی مذاق کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ جب اوپر والے دروازے کے بند ہو جانے کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں کلوزٹ کے ہینگروں سے نکل کر باہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں احتیاطاً" مزید کچھ وقت لگانا چاہتا تھا۔ محض اس خیال سے کہ کہیں وہ دوبارہ تو نیچے نہیں آجاتے۔ جب دس پندرہ منٹ گزر گئے اور اوپر بھی گہری خاموشی چھا گئی تو میں نے اللہ کا نام لیا اور کلوک روم سے نکل کر راہ داری میں آگیا۔ اس وقت میں ایک عام قسم کا آدمی نہیں تھا۔ اس وقت میں ایک سخت جان' اور سانپ سے زیادہ ہوشیار اور چیتے سے زیادہ چالاک ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میرے قدم نپے تلے تھے۔ میں عام حالات کی طرح دبے پاؤں نہیں چل رہا تھا۔ میری چال ایک زبردست کمانڈو کی چال تھی جس نے اپنے ملک وملت کی سلامتی کی خاطر' اپنے وطن پاک کے معصوم بچوں' اور ماؤں بہنوں کی عزتوں کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی اور جو موت اپنی ہتھیلی میں لے کر دشمن کے ایک انتہائی حساس اور نازک ترین انسٹی ٹیوٹ میں ٹائم بم لگانے جا رہا تھا۔

میں کمرہ نمبر پانچ کے سامنے آکر رک گیا۔

کمرہ بند تھا۔ اوپر راہ داری کی چھت پر بلب جل رہا تھا جس کی روشنی دروازے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر تالے کے سوراخ میں گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ دروازہ کھول کر میں اندر آگیا۔ میں نے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ میری پشت دروازے لگی تھی اور میری نگاہیں گول چبوترے پر لگی تھیں جہاں مجھے ٹائم بم لگانے تھے۔ اب فل ایکشن سے کام لینا تھا اور ایک مشین کی طرح اپنی ڈیوٹی اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ میں تیز

ہز قدم اٹھاتا ایٹمی بھٹی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے پلاسٹک کا وہ چھوٹا سا لفافہ
ہالا جس میں چار ٹائم بم پڑے تھے۔ میں نے پہلا ٹائم بم لے کر اسے ایٹمی بھٹی کے گول
بوترے کی دیوار کے ساتھ فرش سے ایک فٹ اونچا کر کے چپکا دیا۔ اس کے بعد دوسرا
ئم بم ذرا آگے کر کے چپکا دیا۔ اسی طرح میں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ
اروں ٹائم بم چپکا دیئے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے چاروں ٹائم بموں کا
ک کر اچھی طرح سے جائزہ لیا اور پھر بسم اللہ پڑھ کر اس کے اندر جو ٹائم ڈیوائیس لگے
ھے باری باری ان کے بٹن دبا دیئے۔ ایک گھنٹے بعد ان بموں کو پھٹ پڑنا تھا۔ میں نپے
لے قدم اٹھاتا کمرہ نمبر پانچ سے باہر نکل آیا۔ دروازے کو اسی طرح چابی لگا کر لاک کیا اور
لوک روم کی طرف جانے کی بجائے راہ داری کے اس سرے کی طرف چلنے لگا جہاں
ہرے کنوئیں کے اندر بجلی کے جنریٹر لگے تھے اور ایک چرخی سے دیوار میں طاق کھلتا
ا۔ کیونکہ آج کی رات میں کلوک روم میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کی وجہ محض اتنی سی
ی کہ ایک گھنٹے بعد وہاں قیامت برپا ہونے والی تھی۔

یہ پروگرام میں نے پہلے سے بنا رکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جنریٹروں والے
ق کو میں پہلے بھی کھول کر دیکھ چکا تھا۔ وگرنہ میرے لئے وہاں دن کے وقت ٹائم بم لگانا
ل ناممکن بات تھی اور پھر مجھے صرف بم لگانے کے لئے پانچوں گارڈز کا خون کرنا پڑتا۔
ا کرتے ہوئے حالات میرے مخالف بھی ہو سکتے تھے اور میں پھنس بھی سکتا تھا۔ میں راہ
ری کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا راہ داری کی آخری دیوار کے پاس آیا۔ وہاں چھوٹی سی
ئی دیوار میں ایک طرف ویسے ہی لگی تھی۔ میں نے چرخی کو گھمایا۔ چھوٹے سے طاق کا
روازہ کھل گیا۔ دوسری طرف کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لوہے کی سیڑھی اوپر سے نیچے
یٹروں تک جا رہی تھی۔ جنریٹر چل رہے تھے۔ میں ٹانگ بڑھا کر لوہے کی سیڑھی پر آگیا
بازو نیچے کر کے طاق کو اسی طرح دوبارہ بند کر دیا۔ اب میں اوپر چڑھنے لگا۔ لوہے کی
ھی دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اوپر کنوئیں کے دہانے تک جاتی تھی۔ مجھے
لوم نہیں تھا کہ اس کنوئیں کے اوپر کوئی آہنی ڈھکنا بھی ہے۔ جس روز میں نے نیچے

سے اوپر دیکھا تھا تو کنوئیں کا منہ کھلا تھا اور مجھے آسمان پر تاروں کی روشنی نظر آئی تھی۔ آج میں نے اوپر دیکھا تو مجھے تاروں کی روشنی نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ باہر شاید اندھیرا ہو گیا ہو۔ شاید بادل آ گئے ہوں۔ میں سیڑھی چڑھتا جب کنوئیں کے منہ پر آیا تو اس کا منہ بند تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے دیکھا۔ کنوئیں کے منہ پر لوہے کا بھاری ڈھکن گرا ہوا تھا میں نے دونوں ہاتھوں سے زور لگایا۔ مگر ڈھکن ذرا بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میں آہنی سیڑھی پر کھڑے کا کھڑا ساکت سا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز حالات کے لئے بھارت کے فرعون حصہ چہارم "را کی سازش" میں پڑھیئے